الرحمٰن علم القرآن خلق الانسان علمه البيان

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

البیان

اُمتِ مسلمہ کا ماہوار صحیفہ

جلد ۱

لاہور

مرتب:
قمرالدین قمر

شذرات

اس بے سروسامانی اور ناموافق ماحول میں جبکہ مادی وسائل کے تمام راستے مسدود اور احباب کا شیرازہ منتشر ہو چکا ہے۔ البیان کے دوبارہ اجراء کی جرأت کرنا بڑا ہی عجیب معلوم ہوتا ہے، مگر ہم خود نہیں جانتے کہ کس طاقت نے ہمیں اس مقصد کے لئے اکسایا اور کس آمادہ کرنے والے نے گردش روزگار کے مارے ہوئے چند افراد کے دلوں کو یہ ہمت دلائی کہ خدائی توحید کا علم بلند رکھنے کے لئے صرف خدا پر بھروسہ کر کے اٹھو۔ وسائل کا پیدا کرنے والا وسائل کے جمع کر دینے پر قادر ہے چند دوستوں کے تعاون سے اس متبرک مہم کا آغاز کیا گیا۔ ڈکلریشن حاصل کرنے کے سلسلے میں دفتری الجھنوں کو حل کرنے کے بعد مالی مشکلات نے راستہ روکا۔ مخلص احباب کا خلوص بجائے خود کتنا ہی قیمتی کیوں نہ ہو، مگر جہاں روپیہ چاہیئے وہاں محض خلوص کام نہیں دے سکتا۔ ڈکلریشن کی میعاد کے دن گذرتے گئے اور عین اس وقت جب کہ امید کے افق پر مایوسی کی گھٹائیں چھا رہی تھیں، خداوند کریم نے کامیابی کی کرن پیدا کر دی۔ خدا کے کچھ بندوں کے ایثار سے، وقت کی تنگی کے سبب نہایت عجلت میں جیسا بھی ہو سکا، پہلا نمبر مرتب کر کے شائع کر دیا گیا۔ جلد بازی کے سبب بعض خامیاں رہ گئیں۔ حجم بھی مختصر رہا مگر 'البیان' اپنی دوسری زندگی کا پہلا سانس لینے میں کامیاب ہو گیا۔ وسائل و اسباب کے لحاظ سے ہم آج بھی اسی منزل پر ہیں، جہاں اشاعتِ اول کے وقت تھے، مگر مسبب الاسباب کی مدد اور اس کے مخیر بندوں کے تعاون سے پوری امید رکھتے ہیں کہ سب مشکلیں حل ہو کر رہیں گی اور توحید و اخوت کا یہ علم بردار زندہ و پائندہ رہے گا۔ ہر ناتوان کو توانائی بخشنے والا اور ہر گرتے ہوئے کو تھام لینے والا اسے حق کی تبلیغ کے لئے قائم و دائم رکھے گا۔

ہر چند کہ اس دور میں ایک ایسے رسالے کے لئے جس میں نہ اداکاروں کی رنگین تصویریں ہوں، نہ افسانوی ادب کی دلکش فحاشی۔ نہ سیاسی ہتھکنڈوں کے کرتب اور نہ اربابِ حکومت کی پشت پناہی، اپنی ہستی کو برقرار رکھ سکنا آسان نہیں۔ تاہم آج بھی ملک کے ہر گوشے میں خدا کے کچھ بندے اس پتھر کی سل کو چاٹنے کے لئے موجود ہیں۔ ان ہی سالکانِ حق کے ذوقِ سلیم اور خلوص و ایثار سے ہمیں اپیل کرنا ہے کہ راہِ توحید کے اس پرانے رفیق کو پہچانیں اور منزل کی دشواریوں میں اس کے ساتھ دوستی کا حق ادا کریں۔

اُمتِ مُسلمہ کے تمام ارکان و معاونین جو ملک کے مختلف حصّوں میں بکھرے ہوئے ہیں، اپنی تبلیغی جماعت کی تنظیمِ جدید کے لئے کمر بستہ ہو جائیں۔ اور دنیوی مصروفیتوں میں سے کچھ وقت بچا کر دینِ حق کی خدمت میں صَرف کریں۔ آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہونے کے بعد اس اسلامی ریاست کے اندر ہماری ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ خدا کی دی ہوئی اس نعمت کا عملی شکریہ ہم صرف اسی طرح ادا کر سکتے ہیں۔ کہ خدا کے پاک نام کا آوازہ بلند ہو اور ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی کا ہر گوشہ رضائے الٰہی کے رنگ میں رنگا ہؤا نظر آئے۔ کفر و شرک اور ظلم و طغیان کے ناپاک دھبوں سے اہلِ پاکستان ہی نہیں بلکہ ساری انسانیت کا دامن پاک ہو جائے ؎

سبق پڑھ پھر انوّت کا شجاعت کا عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

شمارہ زیرِ نظر میں مولانا قاری سیّد جعفر شاہ صاحب کے درسِ قرآن کی دوسری قسط شائع ہو رہی ہے۔ اس درس کی خصوصیت و افادیت کا تعارف قسطِ اوّل کے آغاز میں کرایا جا چکا ہے۔

چودھری بشیر احمد صاحب سَوری کا بلند پایہ مضمون "اسلامی معیشت کے تکمیلی پہلو" کی پہلی قسط شاملِ اشاعت ہے۔ یہ مضمون اسلامی نظامِ معیشت کے اصولوں پر مکمّل تبصرہ ہے۔ صاحبِ مضمون نے مسئلہ معیشت کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں دیکھا ہے اور مروجہ اقتصادی نظریوں سے مرعوب ہو کر اسلامی سوشلزم قسم کی گنگا جمنی اصطلاحوں میں اُلجھنے اور اسلام کو اشتراکیت کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ مضمون اُن لوگوں کے لئے قندیلِ ہدایت ہے جن کے ذہنوں پر یہ خیال مسلّط ہو چکا ہے کہ مارکسی نظریۂ معیشت کے سوا ہماری معاشی ناہمواریوں کا علاج ممکن نہیں۔

مولانا تمنّا عمادی صاحب کا تبحرِ علمی اور دقتِ نظر کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اس شمارہ میں آپ کا مضمون "دیانت و حکومت" دولتِ خداداد پاکستان کے اربابِ حکومت کے لئے ایک مفید مشورہ ہے۔ فاضل نامہ نگار نے خالص علمی انداز میں اِس امر پر روشنی ڈالی ہے۔ کہ ایک صالح حکومت کے لئے بنیادی طور پر کن صفات سے متّصف ہونا ضروری ہے۔

جہاں ہمیں ان دوستوں کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے ادارہ البیان کو اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔

مالی اور علمی مدد پہنچانے اور توسیع اشاعت کے لئے کوشاں ہیں۔ وہاں ان اخبارات کا بھی ممنون ہوتا ہے۔ جنہوں نے اپنے ہاں البیان کا اشتہار شائع کیا۔ اس سلسلہ میں ادارۂ البیان "روزنامہ ڈان" کراچی، روزنامہ "نوائے وقت لاہور"۔ "جنگ" کراچی۔ "انجام" کراچی "فیض الاسلام" راولپنڈی "طلوع اسلام" کراچی کا خلوص دل سے شکرگزار ہے۔

بعض قدیم دوست اخبارات میں البیان کے دوبارہ اجراء کی خبر پڑھ کر لکھتے ہیں کہ ان کا قبل پاکستان کے چندے کا جو بقیہ دفتر البیان کے ذمے ہے، اس کے معاوضے میں ان کے نام "البیان" جاری کر دیا جائے۔

اگر حالات میں یہ ہولناک تبدیلی نہ آتی، تو ان کا مطالبہ ہمارے سر آنکھوں پر ہوتا۔ بلکہ ہم اس سے بھی کچھ زیادہ ہی ان کی خدمت کرتے —— لیکن اب جب کہ ہم کفن تک سے محروم قبروں سے اٹھ رہے ہیں۔ ہمیں اپنے جادہ و منزل تک کا علم نہیں۔ ہم سچ مچ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چل پڑنے کی سوچ میں ہیں۔ ایسی صورت میں جو عزیز ہم سے پہلی زندگی کے نہایت ہی غیر اہم قرضوں کا مطالبہ کر رہے ہیں، ان کو اپنے مخلص قدیمی نیاز مندوں پر رحم آنا چاہیئے تھا۔ ہم اس رحم کی بھیک ہرگز اپنی ذات و ضروریات کے لئے طلب نہیں کر رہے —— صرف اس مقدس تحریک کے لئے جس کا التوا وجمود وطن عزیز میں کسی طرح بھی گوارا نہیں ہونا چاہیے جس کی ضرورت اب پہلے سے بہت زیادہ ہے۔

دوستو! ایثار و تعاون کے قدم بڑھاؤ۔ خدا کا کام کرو۔ کیوں کہ یہی تمہارا اپنا کام ہے۔ خدا کے دین کو سربلند کرو، کیوں کہ اس میں تمہاری اپنی سربلندی ہے۔ وباللہ التوفیق۔

قمر

مقالات

اُردو اپنے وطن میں

ہندوستان میں اُردو کی جو گت بن رہی ہے، اس سے ظاہر ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد جن کا پیمانۂ صبر کبھی لبریز نہیں ہوا تھا۔ جو بڑے بڑے تاریخی زلزلوں میں کوہ ہمالیہ کی طرح اپنی جگہ سے نہ ٹلے، آج وہ بھی لڑکھڑا گئے۔ اور آخر کار انہیں جگہ چھوڑتے ہی بنی۔ کاش وہ اب ہی اعتراف فرما لیتے کہ اس تنگ دل قوم کو سمجھنے میں انہوں نے عظیم غلطی کھائی۔ اور اس کے متعلق قائداعظمؒ کی پیش بیں فراست نہایت صحیح نتیجے پر پہنچ چکی تھی، بلکہ اس کی تنگ دلی اُن کے اندازے سے بھی بہت زیادہ نکلی۔ تاریخ اقوام میں غالباً یہ پہلی مثال ہے کہ کسی قوم نے زبان کے مسئلے کو اس حد تک وجہ نزاع بنا دیا ہو۔ کہ اس کے بڑے بڑے فراخ دلی کے قومی لیڈر بھی اس سیلاب تعصب میں بہہ جانے کے لئے مجبور ہو جائیں مولانا کے بیان کے بعض فقرے قابل غور ہیں:۔

"جب میں نے دیکھا کہ قومی زبان کے مسئلہ میں دلیل اور فہم و فراست سے کام لینے کے بجائے غلط بات کی پیروی کی جا رہی ہے اور انہیں جذبات پر اصرار کیا جا رہا ہے تو میں نے ڈرافٹنگ کمیٹی سے استعفا دے دیا"

"جب میں نے دیکھا کہ انڈین یونین میں مسلم لیگ کے ختم ہو جانے اور اُس کے نقطہ نظر کے مُردہ ہو جانے کے بعد بھی ایک دو اصحاب کے سوا صاف دماغی سے غور کرنے کے لئے کوئی تیار نہیں ہے تو میں نے ڈرافٹنگ کمیٹی سے استعفٰے دے دیا"

کاش آپ کو اس وقت سے پہلے معلوم ہو جاتا کہ آس ۱۶ کروڑ کی آبادی میں ایک دو اصحاب کے سوا کوئی بھی صاف دماغ نہیں ہے۔ سب کے سر میں ٹھُس بھرا ہوا ہے اور سب چھوٹے بڑے فرقہ وارانہ تعصب کے آسیب کا شکار ہو رہے ہیں۔

مولانا کا مطالبہ کیا تھا ـــــ اُردو کو تعلیمی زبان کی حیثیت سے زندہ رہنے دیا جائے؟ نہیں بالکل نہیں۔ یا اُردو کو سرکاری حیثیت سے تسلیم کیا جائے؟ ـــــ نہیں یہ بھی نہیں ـــــ فقط اتنی بات تھی کہ

"ہندوستانی زبان اور دیوناگری رسم خط کو سرکاری حیثیت دیتے ہوئے دستور میں یہ تسلیم کر لیا جائے کہ سرکاری

اطلاعات اور کورٹ بین درخواستیں وغیرہ اُردو میں بھی دی جاسکیں اور قبول کی جائیں"

غالب نے شاید ایسے ہی کسی موقع پر کہا تھا۔

مانا کہ تم کو غیر سے گر رسم وراہ ہو   مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

جس دیس میں اُردو پیدا ہوئی اور پروان چڑھی۔ وہاں سے تو اُردو کو ہمیشہ کے لئے دیس نکالا مل گیا اور اس کے مقابلے میں ہندی کی مُردہ لاش کو تعلیم گاہوں، دفتروں اور عدالتوں پر مسلط کر دیا گیا۔ صرف دو ہی سال میں ہندی چھلانگ لگا کر سب پر چھا گئی —— اور اُردو جو پاکستان میں مہاجر یا پناہ گیر کی حیثیت سے وارد ہوئی۔ یہاں اب تک اس کی حق رسی میں لیت و لعل ہو رہی ہے۔ حالانکہ یہاں کے لوگ پہلے سے اس کی خوبیوں کے مداح تھے۔ اگر وہاں ہندی سے اس کی کشتی تھی۔ تو یہاں انگریزی سے دنگل لڑایا جاتا ہے۔ ہندی کی پُشت پر غیر مذاہب کے لوگ تھے، تو اب انگریزی کے حامی وہ لوگ ہیں۔ جو خدا کے فضل سے مسلمان ہیں۔ اور اُردو علاقوں کی پیداوار ہیں۔ ہمارے سامنے عثمانیہ یونی ورسٹی کی روشن مثال موجود ہے۔ جس نے اُردو کو تعلیمی زبان بنا کر نمایاں کامیابی حاصل کی۔ اگر ہم اس کی طرف توجہ کریں، تو چند ہی برسوں میں اصطلاحات وغیرہ کی کمی پوری ہو سکتی ہے۔

ہندوؤں کو مسلمانوں سے چڑ سی ہو گئی ہے۔ اب وہ مسلمانوں اور مسلمانوں کی طرف منسوب ہر شئے کو مٹانے کے درپے ہو رہے ہیں۔ ہندوستان کے بڑے بڑے ذمہ داروں کی زبانیں آگ اُگل رہی ہیں۔

"مسلمان ان تقریروں کو سنتے ہیں اور دل میں کڑھتے ہیں کہ فریاد لے کر جائیں تو کس کے پاس جائیں۔ فریاد کی سب سے بڑی عوامی عدالت صوبہ کانگرس کمیٹی تھی۔ جب اسی کا صدر دل آزاری کرے تو کیا کریں۔ یہ مجبوری اور بے بسی کا عالم مایوسی لے کر آتا ہے اور پھر سارے مستقبل پر چھا جاتا ہے۔" (صدق)

اللہ اللہ یہ بے بسی تو انگریز کے زمانے میں نہیں ہوئی تھی۔ ع

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے

یہ ہے ایک قومی نظریہ، یہ ہے آزادی، یہ ہے اپنی دیسی حکومت۔ ع

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

ادھر کچھ دنوں سے سیوا سنگھ پھر اُبھر رہا ہے۔ اُبھر کیا رہا ہے۔ کانگرس سیوا سنگھ میں مدغم ہو کر رہ گئی ہے۔

(باقی صفحہ کے نیچے)

درسِ اخلاق

جواہرات سے بڑھ کر

پاکستان بننے کے بعد میں نے مختلف اخبارات میں اصلاحی مضامین لکھے۔ بعض پر اپنا نام دیا، بعض فرضی نام سے اور بعض بے نام، میں چاہتا ہوں، ان کو آہستہ آہستہ البیان کی مجلس مطالعہ میں لے آؤں۔ زیرِ نظر مضمون اس سلسلے کی پہلی قسط ہے۔ (عرشی)

فرض کیجئے میں آپ کو ایک ہزار، یا دس ہزار یا اس سے بھی زیادہ روپیہ دے دیتا ہوں۔ یقینی بات ہے کہ وہ روپیہ ہمیشہ آپ کا ساتھ نہیں دے گا۔ وہ ایک نہ ایک دن ختم ہو کر رہے گا۔ جب اس دنیا میں قارون کی دولت اور سکندر کے خزانے نہ رہے، تو میں اور آپ کس گنتی میں ہیں۔ . . . . وہ روپیہ آپ کی زندگی میں آپ سے جُدا ہو جائے گا۔ یا زیادہ دیر رہا، یا آپ اس کو کسی کے استعمال کے لئے چھوڑ کر قبر میں جا سوئیں گے پھر جس طرح یہ ممکن ہے کہ وہ روپیہ آپ کو ایک وقت تک راحت و آسودگی بخشے۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ آپ اس کے ذریعے فسق و فجور میں مبتلا ہو کر کئی خطرناک بیماریاں خرید لیں۔ سوسائٹی میں اپنی عزت و وقار کو برباد کر بیٹھیں۔ اپنے ماتھے پر رسوائی اور بدنامی کا ٹیکہ لگالیں اور مفلسی و قلاشی کی موت مر کے دائمی جہنم کے کسی گوشۂ اسفل کو جا آباد کریں۔

اِن خطرات سے بچنے کے لئے میں بہتر سمجھتا ہوں کہ میں آپ کو روپے کا خوفناک تحفہ نہ دوں۔ میں آپ کو دنیا کی ساری دولتوں اور جواہرات سے بڑھ کر تحفہ دینا چاہتا ہوں۔ بشرطیکہ آپ اس کی واقعی قدر کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ کیوں کہ

(باقی از صے) گاندھی کی نصف صدی کی محنتیں برباد، اور ناتھو رام گاڈسے قاتلِ گاندھی کا ایک ہی وار کامیاب۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وار میں ہندو جنتا کی فطرت کی ترجمانی تھی۔ گاندھی کا اچھوت ادھار ختم اور گاڈسے کی مسلم کشی قوم کی آواز ——— ہند کے مسلم تجرانڈ۔ چیخ رہے ہیں، سر پیٹ رہے ہیں، کوئی نہیں سنتا ع

اقربا میرے کریں خون کا دعویٰ کس پر

(ع)

"قدرِ زر زرگر بداند قدرِ جوہر جوہری"

لیجئے! میں آپ کو زیادہ منتظر نہیں رکھنا چاہتا۔ میرا تحفہ ابدی، غیر فانی، تمام اولیاء و انبیاء کا مصدقہ تحفہ، آسمان و زمین کے مالک کی طرف سے بھیجا ہوا تحفہ یہ ہے "ہمیشہ سچ بولو"۔۔۔۔ اگر آپ کے دل کی آنکھیں بند نہیں ہو گئیں اور روح کے کان بہرے نہیں ہو گئے تو ان تین لفظوں کو معمولی نہ سمجھو (ہمیشہ۔۔۔۔ سچ۔۔۔۔ بولو) میں نے اس ایک درمیانی لفظ "سچ" میں زمین و آسمان کے خزانے اور ربِ کائنات کے بے شمار معجزے چھپے ہوئے دیکھے ہیں (بتوفیقہ تعالیٰ)۔۔۔۔ یہ مہر و ماہ و انجم، یہ بحر و بر، یہ ارض و سما، یہ شجر و حجر، یہ انسان و حیوان، یہ سب کچھ جو آپ کو دکھائی دیتا ہے اور وہ لامحدود کائناتِ غیب جس کو کوئی آنکھ نہیں دیکھ سکتی، کوئی خوردبین نہیں پا سکتی اور کوئی قلب و دماغ نہیں سمجھ سکتا۔ سب کا سب ایک نظامِ مستحکم میں منسلک ہے اور یہ نظام بلند مقام صرف "سچ" کے سہارے پر قائم ہے۔ اگر اس میں کہیں بھی جھوٹ کا تسلط ہو گیا ہوتا، تو یہ کتمِ عدم سے وجود ہی میں نہ آتا۔ اور اگر آ گیا تھا تو تھوڑے ہی دنوں میں تہس نہس ہو جاتا۔۔۔۔ اس وقت میرے کان میں آسمان سے ایک آواز آ رہی ہے، میرے نزدیک آ جائیے اور سنیئے۔

وما خلقنا السماء والارض وما بینهما باطلا۔ ذلك ظن الذین کفروا (ص) خلق الله السماوات والارض بالحق (عنکبوت ۲۵) (ہم (خدا) نے زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی مخلوقات کو یونہی باطل نہیں بنایا، ایسا خیال کرنے والے کافر ہیں بلکہ اللہ پاک نے آسمانوں اور زمین کو سچ کے ساتھ پیدا کیا ہے)۔۔۔۔ ہم انسان جو کائناتِ الٰہی میں مادی اعتبار سے مشتِ غبار کی حیثیت رکھتے ہیں، اور روحانی لحاظ سے سعی کریں تو فرشتوں کے مخدوم بن سکتے ہیں، کسی قدر اختیار سے نوازے گئے ہیں۔ اس اختیاری حصہ میں ہم کو قدرت دی گئی ہے کہ چاہیں تو سچ بول کر نظامِ عالم اور اس کے ناظمِ جلشانہ کو اپنا حامی بنا لیں اور چاہیں تو جھوٹ کو اپنا پیشہ بنا لیں اور رفتارِ کائنات سے الٹی سمت چل کر جہنم کے گڑھے میں جا گریں۔ لہٰذا میں آپ کو مشورہ دوں گا۔۔۔۔ "ہمیشہ سچ بولو"۔۔۔۔ آپ میں سے بعض ظاہر بین مجھے کہہ سکتے ہیں کہ "پاگل ہو گئے ہو؟ اس زمانے میں سچ سچ کی بیہودہ رٹ لگاتے ہو، جب کہ بادشاہ جھوٹے، ڈکٹیٹر جھوٹے، امیر جھوٹے، وزیر جھوٹے، لیڈر جھوٹے، تاجر جھوٹے، ریڈیو میں جھوٹ، اخبار میں جھوٹ، اسمبلی میں جھوٹ، عدالت میں جھوٹ اور مسجد و خانقاہ تک میں جھوٹ کی حکومت چل رہی ہے۔ اس جھوٹ کے طوفان میں تمہارے "سچ" کے تنکے کے سہارے پر کوئی کس طرح ساحلِ نجات تک پہنچ سکتا ہے"؟۔۔۔۔ میں کہتا ہوں، آپ کا اعتراض بجا ہے لیکن کیا پہاڑوں کے اربوں ٹن پتھروں کے نیچے دبی ہوئی کان میں قلیل المقدار الماس، لعل، سونا، یاقوت وغیرہ قیمتی جواہرات اپنے آپ کو پتھروں میں تبدیل کر لیتے ہیں؟ کیا سمندر کی بے اندازہ مخلوقات میں قیمتی مروارید اپنی ہستی کو قائم نہیں رکھتے؟ کیا شبِ دیجور کے طوفانِ ظلمت سے مرعوب ہو کر تم دکھائی دینے والے ستارے اپنے چراغ گل کر دیتے ہیں؟۔۔۔۔ جب یہ سب کچھ اپنی جگہ پر قائم ہے تو غیر فانی "سچ" ناپائدار جھوٹ کے بال سے کیوں کر دب سکتا ہے۔ یہ جو آپ ہر طرف جھوٹ کے ہنگامے اور جھوٹ کی گرم بازاری دیکھ کر اس کے سیلاب میں تنکا بن کر بہتے رہنے کو تیار ہو رہے ہیں۔ کیا اس کا نقد نتیجہ آپ کو ظاہری آنکھ سے دکھائی نہیں دے رہا۔ کیا دنیا کے کسی گوشے میں اطمینان ہے؟ کیا کوئی بڑے

یا چھوٹے رئیس و امیر، راعی و رعایا کو چین میسر ہے۔ یہ انسانی فکر و دماغ، یہ علم و تحقیق، یہ سعی و عمل، یہ بحر و بر کی بے اندازہ دولتوں کے خزانے انسانی زندگی کو جنت کا نمونہ بنا سکتے تھے۔ کیا اسی جھوٹ کی "برکت" سے جہنم کا ایندھن نہیں بن رہے؟ اگر انسان سچ کی راہ پر چل پڑتے تو یہ نادیدنی جو آپ کی آنکھوں نے دیکھا اور یہ شنیدنی جو آپ کے کان سن رہے ہیں۔ کیا اسی طرح ظہور پذیر ہوتا؟ میں آپ کو پھر یہی کہوں گا کہ "ہمیشہ سچ بولو"۔ سچ بولنا سازِ فطرت سے ہم آہنگ ہونا ہے ؎

"راستی موجب رضائے خدا ست　　کس ندیدم کہ گم شد از رہِ راست"

اگر آپ سچ بولنا شروع کر دیں گے تو آپ کا وجود جواہرات سے زیادہ قیمتی ہو جائے گا۔ آپ اللہ کے غیبی خزانوں کے حصہ دار بن جائیں گے۔

میں ایک کلرک کو جانتا ہوں جس نے عہد کر رکھا تھا کہ کبھی جھوٹ نہیں بولے گا۔ بس روزمرہ کی معمولی عبادات کے علاوہ یہی اُس کا وظیفہ تھا اور یہی ریاضت۔ اس نے مجھے بتایا کہ "میری بہت سی مشکلات جن کے حل ہونے کی کوئی بھی ظاہری صورت نظر نہ آتی تھی غیبی اسباب سے اس طرح حل ہو گئیں کہ میں حیران رہ گیا۔ بہت سی ضرورتوں کے سامان اللہ تعالیٰ نے میری کوشش کے بغیر مہیا فرما دیئے۔ بہت سی مصیبتوں کو اپنے فضل سے دُور کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ "سچ" کی ورزش نے ہر موقع پر میری مدد کی" وغیرہ وغیرہ۔

میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں۔ جھوٹ شیطان کی تصنیف ہے۔ آپ جھوٹ بول کر شیطان کے فرماں بردار بنیں گے۔ شیطان کے پاس کیا ہے جو آپ کو اس فرمانِ بیداری کا معاوضہ دے گا ـــــ "سچ" اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضامندی اسی میں ہے۔ آپ سچ بول کر اللہ تعالیٰ کے محبوب بن جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ علیٰ کُلِّ شیءٍ قدیر ہیں سب خزانوں کے مالک ہیں وہ آپ کو کبھی بھوکا نہیں رکھیں گے۔ ہر موقع پر آپ کی مدد کے لئے موجود رہیں گے۔ اب آپ کل صبح کی نماز کے وقت اللہ پاک سے وعدہ کریں کہ آج سونے کے وقت تک جھوٹ نہیں بولیں گے۔ پھر دیکھیں دن کیسے گذرتا ہے۔ اسی طرح دوسرے دن، پھر تیسرے دن، یہاں تک کہ چالیس دن تک پہنچ جائیں۔ آپ کو ابتداءً اس میں مشکلات دکھائی دیں گی۔ آپ اللہ تعالیٰ سے ثابت قدمی کی دعا مانگتے رہیں گے تو مشکلات کا اُبال ختم ہو جائے گا اور آپ کو "سچ" کا نور نظر آنے لگے گا۔ خدا کی قسم یہ کھوکھلا وعظ نہیں ہے جو میں آپ کو سُنا رہا ہوں یہ ایک مجرب حقیقت ہے۔ بے شمار نبیوں، ولیوں، نیکوں اور کامیاب لوگوں کی آزمائی ہوئی حقیقت! ـــــ اگر آپ پاکستان کو سچ مچ کا پاکستان بنانا چاہتے ہیں تو پہلے اپنے آپ سے "سچ" کا آغاز کریں پھر اپنے زیرِ اثر طبقہ سے۔ آہستہ آہستہ یہ حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جائیگا۔

آپ کی بات کوئی مانے یا نہ مانے آپ کا اجر ضائع نہیں جائے گا۔ (بشرطِ اخلاص)۔ حضرت سلیمانؑ کی کتاب امثال میں لکھا ہے "خداوند صادق کی جان کو فاقہ نہ کرنے دے گا۔ صادق کے سر پر برکتیں ہوتی ہیں۔ سچ بولنے والے کا منہ چشمۂ حیات ہے۔ سچوں کی مراد پوری ہوگی۔ صادق کے مُنہ سے حکمت نکلتی ہے۔ سچوں کی سچائی اُن کی راہنما ہوگی۔ قہر کے دن مال کام نہیں آتا۔ لیکن موت سے سچ رہائی دیتا ہے۔ راستبازی کی دعا سے شہر سرفرازی پاتا ہے، صادق کو زمین پر بدلہ دیا جائے گا"۔

اور جھوٹ کے متعلق قرآن مجید میں ہے "لعنۃ اللہ علی الکاذبین" (جھوٹوں پر خدا کی لعنت ہے)۔　　(النفقیہ)

اسلامی معیشت کا تکمیلی پہلو

(بشیر احمد سنوری، جالندھری)

معیشتِ اسلامی پر میرے مضمون کا یہ پہلا حصہ ہے۔ اس میں تمام تر ایک آیت (سورہ نحل آیت ۷۱) کی تفسیر ہے۔ جو میرے مضمون کی اساس ہے۔ میں نے اس اساس کو علماء کی تفاسیر سے استمداد کر کے محکم کیا ہے۔ میری غرض یہ ہے کہ اس اساس پر جو عمارت آئندہ حصوں میں قارئین کے سامنے آئے وہ سمجھ میں آجائے اور اس میں اختلال واقع نہ ہو سکے۔ اس لئے میں نے علماء کرام کے اصل الفاظ نقل کر دیئے ہیں تاکہ اس آیت کا مفہوم، اس کی معقولیت اور قوت صحیح طور پہ قارئین پر واضح ہو جائے۔ میرے نزدیک اس آیت کا مفہوم صاف ہے اور یقیناً وہی ہے، جو میں نے بیان کیا ہے۔ اس تشریح کے بعد اختلاف کی گنجائش نہیں۔

انقلابِ زمانہ نے مسلمانوں کو جن مسائل سے دوچار کیا ہے۔ ان میں سے ایک معاشی مسئلہ بھی ہے مسلمانوں میں عموماً دو طبقے ہیں۔ ایک دولتمند دوسرا غریب۔ اس کے بین بین جو طبقہ ہے وہ قلیل ہے۔ اگر اس درمیانی طبقہ کی معاشی و معاشرتی حالت کا تجزیہ کیا جائے۔ اور اُن کی اُن ضروریاتِ زندگی کی فہرست تیار کی جائے جو بوجہ قلتِ وسائل میسر نہیں آسکتیں تو معلوم ہوگا کہ یہ طبقہ بھی بدحال ہے اور اپنی موجودہ حالت سے مطمئن نہیں۔ دولتمند طبقہ ہر اُس آواز کو جو نچلے طبقے کے افراد اپنی معاشی بدحالی سے تنگ آکر بصورتِ احتجاج بلند کرتے ہیں، طاقت سے دبانا چاہتا ہے۔ یا اسلام کی غلط تعلیم پیش کر کے ان کو خاموش کر دیتا ہے۔ مگر زمانے کا رُخ بتا رہا ہے اور جو تحریکیں مغرب سے اُٹھ رہی ہیں وہ بتا رہی ہیں کہ یہ طفل تسلیاں چند روزہ ہیں۔ ابھی وقت ہے کہ قبل اس کے کہ مسلمان کسی ایسی تحریک کے شکار ہوں جو ان کو صحیح اسلامی موقف سے دُور لے جا کر لادینی کے گڑھے میں گرا دے ان کو اسلامی اور قرآنی تعلیمات سے واقف کر دیا جائے۔ تاکہ وہ اپنی معاشی بدحالی کا علاج غیر کی بیاض سے تلاش کرنے کی بجائے اپنے دارالشفاء سے حاصل کریں۔ میں نے وہ نسخۂ شفا ان صفحات میں پیش کرنے کی جرأت کی ہے قرآن مجید کی اس نعمتِ عامہ کو جو امیر، غریب سب کے لئے صلائے عام کا پیغام ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس فیضانِ رحمت

بعضهم فوق بعض درجٰت لیتخذ بعضهم بعضًا سُخریًا ۔ (۴۳:۳۲)	پر رفعت دے رکھی ہے ۔ تاکہ ایک دوسرے سے کام لیتا رہے (اور عالم کا انتظام قائم رہے)

یعنی حصولِ معاش کے لحاظ سے سب انسان یکساں نہیں ہیں بعض اوپر ہیں بعض نیچے " مدارج معیشت کی یہ بلندی و پستی اس لئے ہوئی کہ انسان کے عمل و تصرف کے لئے آزمائش کی حالت پیدا ہو جائے اور ہر فرد اور گروہ کو موقع دیا جائے کہ اپنی سعی و کاوش سے جو درجہ حاصل کر سکتا ہے حاصل کر لے ۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ اختلاف قدرتی ہے اور ضروری تھا کہ ظہور میں آئے ۔ اگر یہاں سب کی حالت یکساں ہو جاتی ۔ تو تزاحم و تنافس کی حالت پیدا نہ ہوتی ۔ اور اگر یہ حالت پیدا نہ ہوتی ۔ تو انسان کی قدرتی قوتوں کے اُبھرنے اور ترقی پانے کے لئے کوئی شے محرک بھی نہ ہوتی ۔ اور اجتماعی زندگی کی وہ تمام سرگرمیاں ظہور میں نہ آتیں جن سے یہ تمام کارخانہ چل رہا ہے"[1]

پس انسان کا مدارج معیشت کے لحاظ سے مختلف الاحوال ہونا دنیوی نظام کے اعتبار سے ضروری ہوا اور اس لئے بھی کہ انسان کے اعمال کی آزمائش ہو ۔ اس سے انسان کی کسی فطری کمزوری کا اظہار مقصود نہیں ۔ غریب امیر بن سکتا ہے اور امیر تغیرِ احوال کے ساتھ نانِ شبینہ کا محتاج ہو جاتا ہے ۔ وتلك الایامُ نداولها بین الناس (۳:۱۳۹)۔ اس عالمِ اسباب وعلل میں مختلف دواعی کارفرما ہیں جن سے انسان کی سعی و طلب کا امتحان اور اس کے اعمال کی جزا وابستہ ہے :-

وهو الّذی جعلکم خلٰئف الارض ورفع بعضکم فوق بعضٍ درجٰتٍ لیبلوکم فیما اٰتٰکم ان ربك سریع العقاب وانه لغفورٌ رحیم ۔ (۶:۱۶۶)	اور وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں صاحب اختیار بنایا اور ایک کا دوسرے پر رتبہ بڑھایا ۔ تاکہ (ظاہراً) تم کو آزمائے ان چیزوں میں جو کہ تم کو دی ہیں بالیقین آپ کا رب جلد سزا دینے والا (بھی) ہے ۔ اور بالیقین وہ واقعی مغفرت کرنے والا مہربان (بھی) ہے ۔

استخلاف فی الارض کی اہلیت و استعداد کے لئے افراد اور قوموں کا جن اعمال میں امتحان ہوتا ہے ۔ ان میں سے رزق کا معاملہ بھی ہے ۔ جن کو رزق زیادہ دیا ہے ان کی آزمائش اس امر میں ہے کہ کس طرح وہ اپنے اعمال سے تقسیم رزق میں ہمواری پیدا کرتے ہیں ۔ حقیقی عزت و تکریم رزق کی زیادتی میں نہیں بلکہ تقویٰ میں ہے ۔ جس کے ذریعے انسان دوسرے انسانوں کو اپنا بھائی سمجھ کر ان کے حقوق ادا کرتا ہے اور جو اپنے لئے پسند کرتا ہے وہی ان کے لئے پسند کرتا ہے ۔ قرآن حکیم نے اہلِ رزق پر ایک بڑی بھاری ذمہ داری عائد کی ہے اور انہیں ان کی ذمہ داریوں اور فرائض سے اس طرح

---

[1] ترجمان القرآن مصنفہ مولانا ابوالکلام آزاد ۔

متنبہ کیا ہے :

لا تفرح ان اللہ لا یحب الفرحین ○ وابتغ فیما اتاک اللہ الدار الآخرۃ ولا تنس نصیبک من الدنیا واحسن کما احسن اللہ الیک ولا تبغ الفساد فی الارض ان اللہ لا یحب المفسدین (۲۸ : ۷۷)

تو اس مال و حشمت پر مت اترا۔ واقعی اللہ تعالیٰ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور تجھ کو خدا نے جتنا دے رکھا ہے اس کے ذریعہ سے عالم آخرت کی بھی جستجو کیا کر اور اپنا مال خرچ کر کے دنیا کے سامان سے اپنا حصّہ (آخرت میں لے جانا) فراموش نہ کر اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی (بندوں کے ساتھ) احسان کر اور اس مال و حسن سلوک کو دوسروں سے روک کر دنیا میں فساد کا خواہاں مت ہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ اہل فساد کو پسند نہیں کرتا۔

جس طرح اعمال میں رشد و ہدایت کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اس طرح رزق کے معاملے میں کشائش و فراخی افراد کی اصلاح حال اور جماعتوں کے مواسات و تواصی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

معاشی مساوات

اب سوال یہ ہے کہ اختلافِ مدارج اور تزاحم و تنافس کے باوجود اسلام کا اصولِ مساوات معاشی مسئلہ میں کس طرح قائم ہوتا ہے ؟

"قرآن اس صورتِ حال سے تو تعرض نہیں کرتا کہ معیشت کے اعتبار سے تمام انسانوں کی حالت یکساں نہیں کسی کے پاس زیادہ سامانِ معیشت ہے کسی کے پاس کم لیکن وہ یہ صورتِ حال برداشت نہیں کر سکتا کہ حصولِ رزق کے اعتبار سے لوگوں کی حالت یکساں نہ ہو کسی کو ملے کسی کو نہ ملے۔ وہ کہتا ہے ہر انسان جو دنیا میں پیدا ہوا، دنیا کے سامان و رزق سے حصّہ پانے کا یکساں طور پر حقدار ہے۔ اور کسی فرد اور گروہ کو حق نہیں کہ اس سے اسے محروم کر دے۔ خواہ وہ طاقت ور ہو یا کمزور۔ تندرست ہو یا بیمار۔ قابل ہو یا ناقابل۔ دولت مندوں کے گھر پیدا ہو یا فقیروں کے لیکن اگر انسان ہے تو ماں کے پیٹ سے وہ یہ حق لے کر آیا ہے کہ وہ زندہ رہے اور زندگی کا سروسامان پائے۔

لیکن ہر فرد زندگی کا سروسامان کیوں کر پا سکتا ہے ؟ جو کمزور ہے یا جو ایسے حالات میں پڑ گیا ہے کہ کمانے کا موقعہ نہیں پاتا۔ یا جو معذور اور لاچار ہو گیا ہے۔ وہ سروسامانِ معیشت کہاں سے پائے گا ؟" [۱]

"قرآن کا جواب یہ ہے کہ جن کو رزق کی کشادگی عطا کی گئی ہے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ اُن کے سامانِ زیست اور رزق

[۱] ترجمان القرآن مولانا ابو الکلام آزاد

کے کفیل ہوں جو اس سے محروم ہیں۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:

وَاللّٰہُ فَضَّلَ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِیْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّیْ رِزْقِہِمْ عَلٰی مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُہُمْ فَہُمْ فِیْہِ سَوَآءٌ ۚ اَفَبِنِعْمَۃِ اللّٰہِ یَجْحَدُوْنَ۔ (۱۶ : ۷۱)	اور (دیکھو) اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر باعتبار روزی کے برتری دی ہے (کوئی زیادہ کماتا ہے کوئی کم کماتا ہے) پھر ایسا نہیں ہوتا کہ جس کسی کو زیادہ روزی دی گئی ہے۔ وہ اپنی روزی اپنے زیردستوں کو لوٹا دے۔ حالاں کہ سب اس میں برابر کے حق دار ہیں۔ پھر کیا یہ لوگ اللہ کی نعمتوں سے صریح منکر ہو رہے ہیں؟[۱]

آیات بالا کا ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد کے "ترجمان القرآن" سے لیا گیا ہے۔ ہم انہی کے الفاظ میں ان کی تشریح بھی پیش کرتے ہیں تاکہ قرآن حکیم کا حکم اس اہم معاملہ میں پوری طرح ذہن نشین ہو جائے۔

"قرآن کہتا ہے کہ جن لوگوں کو کمائی کا زیادہ موقعہ ملا ہے اُن کے ذمے خرچ کرنے کا فرض بھی زیادہ عائد ہو گیا ہے۔ وہ اپنی کمائی کا ایک حصہ کمزوروں کو لوٹا دیں۔ کیونکہ فی الحقیقت کمائی کی یہ زیادہ مقدار ان افراد کے لئے تھی، جو کمزوری کی وجہ سے حاصل نہ کر سکے۔ اب چلی گئی ہے طاقت ور افراد کے پاس۔ اس لئے چاہیئے کہ حق داروں کو لوٹا دی جائے۔ یعنی جو اُن کا حق ہے وہ انہیں مل جائے۔ وہ کہتا ہے۔ یہ بات کہ تمہیں سامانِ معیشت کے زیادہ کمانے کا موقعہ مل گیا ہے تمہیں اس بات کا حق دار نہیں بنا دیتی کہ اپنی ساری کمائی صرف اپنی انفرادی زندگی کے لئے روک لو۔ کیوں کہ دنیا کے وسائل زندگی کسی خاص انسان کی حقیقی ملکیت نہیں ہو سکتے۔ یہاں جو کچھ ہے تمام نوع کے لئے ہے پس اگر ایک فرد نے زیادہ کمالیا تو کما لے سکتا ہے لیکن ایسا نہیں سمجھا جا سکتا کہ ساری کمائی اُسی کی ہو گئی۔ جو کچھ اس نے کمایا ہے، در اصل نوع انسانی کی ایک امانت ہے اور اس کے قبضہ میں آگئی ہے۔ وہ اس پر قابض رہ سکتا ہے۔ لیکن اسے صرف اپنے ہی لئے خاص نہیں کر سکتا۔ اس کا فرض ہے کہ خود بھی کھائے اور اُن کمزوروں کو بھی کھلائے جو حصولِ معیشت سے محروم رہ گئے ہیں۔

در اصل قرآن کی اس تعلیم کی تہ میں یہ بنیادی اصل کام کر رہی ہے کہ وہ نوع انسانی کے مختلف افراد و جماعتوں کی ایک دوسرے سے الگ اور منقطع تسلیم نہیں کرتا بلکہ سب کو ایک ہی گھرانے کے مختلف افراد قرار دیتا ہے۔ ایسے افراد جو آپس میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے کے شریک حال ہیں اور ایک دوسرے سے تعاون کرنے والے ہیں۔ بلاشبہ اُن میں کا ہر فرد اپنے اپنے طور پر اپنی اپنی استعداد کے مطابق جدّ و جہد معیشت میں لگا ہوا ہے۔ اور کوئی زیادہ کماتا ہے کوئی کم۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک فرد دوسرے فرد کی حالت سے بے پروا ہو جائے۔ جو زیادہ کماتا ہے وہ اپنی کمائی دوسرے کو اٹھا کر نہیں دے دیتا۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہو سکتا کہ دوسرے کی یک قلم محرومی برداشت کرے اور اس کے

---

[۱] یہ ترجمہ محل نظر ہے۔ (مدیر)

لئے اپنے کو ذمہ دار نہ سمجھے۔ جو زیادہ کماتا ہے اس کے پاس زیادہ کمائی رہتی ہے۔ جو کم کماتا ہے اس کے پاس کم رہتی ہے لیکن کھاتے پیتے سب ہیں۔ بھوکا کوئی نہیں رہ سکتا۔ کمائی میں الگ الگ جدوجہد کریں گے۔ کھانے میں سب ایک دوسرے کے شریک ہو جائیں گے۔ ... ... یہ خدا کے اس عالمگیر گھرانے کے ہر فرد کا قدرتی حق ہے۔ وہ کما سکے یا نہ کما سکے لیکن اُسے زندہ رہنے کا سامان ملنا چاہیئے۔ قرآن کہتا ہے کہ کمائی کے حق کا دامن انفاق کی ذمہ داری سے بندھا ہوا ہے۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں تم انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ یہاں کمائی کرنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ خرچ کرنے کی ذمہ داری اٹھائی جائے۔ اگر تم کچھ نہیں کما سکتے تم پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ جُوں ہی تم کمانے لگے، تم پر ذمہ داری عائد ہو گئی۔ اب یہ جتنی بڑھتی جائے گی، انفاق کی ذمہ داری بھی بڑھتی جائے گی۔ ... ... وہ کہتا ہے۔ افراد کے ہاتھ کمائی کے لئے ہیں لیکن جماعت کا حق خرچ کرنے کا ہے۔ افراد جتنا کما سکتے ہیں کمائیں لیکن ڈھیر لگانے کے لئے نہیں، خرچ کرنے کے لئے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکتناز کو روکنا چاہتا ہے یعنی سونے چاندی کے ڈھیر لگانے کو۔ اور کہتا ہے اُن کے لئے عذابِ عظیم کی بشارت ہے جو ڈھیر لگاتے ہیں اور خرچ نہیں کرتے۔ والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا[1] (۹: ۳۴)

اس تمام تفصیل سے معلوم ہوا کہ جہاں تک نظامِ معیشت کا تعلق ہے۔ قرآن نے اکتسابِ مال کا معاملہ انفاقِ مال کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ وہ فرد کے حقِ اکتساب سے تعارض نہیں کرتا لیکن اس حق کو انفاق کی ذمہ داری کے ساتھ باندھ دیتا ہے جس قدر کما سکتے ہو، کماؤ۔ لیکن کوئی کمائی جائز تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ اگر انفاق سے انکار کرتی ہو۔ ہر وہ کمائی جو محض اکتناز کے لئے ہو۔ اور انفاق کے لئے دروازہ کھلا نہ رکھے۔ قرآن کے نزدیک ناجائز، ناپاک اور مستحقِ عقوبت ہے۔ چنانچہ فرمایا:

واللہ فضّل بعضکم علیٰ بعض فی الرزق فما الذین فضّلوا برآدّی رزقھم علےٰ ما ملکت ایمانھم فھم فیہ سوآءٌ افبنعمۃ اللہ یجحدون۔ (۱۶: ۷۱)	اور (دیکھو) اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر باعتبار روزی کے برتری دی ہے (کہ کوئی زیادہ کماتا ہے کوئی کم کماتا ہے) پھر ایسا نہیں ہوتا کہ جس کسی کو زیادہ روزی دی گئی ہے وہ اپنی روزی اپنے زیر دستوں کو لوٹا دے۔ حالانکہ[2] سب اس میں برابر کے حق دار ہیں پھر کیا یہ لوگ اللہ کی نعمتوں سے صریح منکر ہو رہے ہیں؟

اس آیت میں فرمایا واللہ فضّل بعضکم علیٰ بعض فی الرزق۔ ہر وسامانِ رزق کے اعتبار سے سب کی حالت یکساں نہ ہوئی کسی کے پاس زیادہ ہے کسی کے پاس کم ہے۔ کوئی بالکل محروم ہے۔ فما الذین فضّلوا برآدّی

---

[2] یہ ترجمہ محلِ نظر ہے۔ (مدیر)

رزقهم علی ما ملکت ایمانهم - پھر جن لوگوں کو رزق میں برتری دی گئی ہے وہ ایسا کرنے والے نہیں کہ اپنی کمائی ہوئی روزی اپنے غلاموں اور زیردستوں کو دے دیں۔ "فھم فیہ سوآءٌ" حالانکہ جو روزی انہوں نے کمائی ہے، وہ کچھ ان کی خلق کی ہوئی نہیں ہے۔ اللہ ہی کی دی ہوئی ہے اور اس لئے رزق کے حق دار ہونے میں وہ سب برابر ہیں۔ خواہ کوئی زیردست ہو کر محروم ہو گیا ہو۔ خواہ کوئی زبردست ہو کر خوش حال ہو گیا ہو۔ افبنعمۃ اللہ یجحدون؟ پھر کیا یہ اللہ کی نعمت کے منکر ہیں؟ اللہ کی نعمت کے کیونکہ دنیا میں جس قدر سامانِ معیشت ہے وہ دراصل فطرت کی پیداوار ہے۔ کسی فردِ انسانی کی پیدا کی ہوئی نہیں ہے۔ اور اگر ایک فرد کے قبضہ میں آجاتی ہے تو یہ ایک اللہ کا فضل ہے پس چاہیئے کہ اس کی شکرگزاری بجالائی جائے۔ نہ یہ کہ کفرانِ نعمت کیا جائے۔ اس کی شکرگزاری کیا ہے؟ ان افراد پر خرچ کرنا جو اس کے حصول سے محروم ہیں" ۵۲

مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن سے جو طویل اقتباس ہم نے نقل کیا ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ نظامِ معیشت کے معاملے میں قرآن کا رُخ کس طرف ہے۔ مولانا کا فضل و کمال، ان کا تبحرِ فی العلم اور رسوخ فی القرآن مسلّم ہے اور اُن کے ترجمہ و تشریح کے مطالعہ سے بعد اسلام کے نظامِ معیشت کی اس بنیادی تعلیم پر کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ روزی کے معاملہ میں اسلام امیر اور غریب کو ایک سطح پر لے آتا ہے۔ اس آیت میں افراد اور جماعتوں کے "حقوق" و "فرائض" کی تعیین کر دی گئی ہے۔ قطع نظر زکوٰۃ و صدقات یا مستحب و نفلی خیرات کے، کارخانۂ حیات میں انفاق فی سبیل اللہ کا جو بلند و برتر اور صحیح تر مقام ہے۔ وہ انہی حقوق و فرائض کی مخلصانہ ادائگی سے حاصل ہوتا ہے۔

مطالب کی مزید توضیح

مولانا ابوالکلام آزاد ان آیات کا مندرجہ صدر ترجمہ کرنے میں منفرد نہیں ہیں۔ ہمارے خیال میں اسلامی مفکرین اس مرکزی نقطے سے جو یہاں بیان ہوا ہے، بے خبر نہیں ہیں۔ ہماری نظر سے انگریزی کی ایک کتاب گذری ہے۔ جس کا نام دی وزڈم اوف دی قرآن The Wisdom of the Quran (حکمتِ قرآنی) ہے۔ اس کتاب میں ترکی عالم جنرل محمود مختار پاشا مرحوم نے قرآن حکیم کی ان منتخب آیات کا ترجمہ (Fresh and Independent Rendering of the Verses) پیش کیا ہے جن میں اسلامی اصولِ معاشرت، اخلاق و اجتماع سے متعلق تعلیم دی گئی ہے۔ انگریزی ترجمہ یونیورسٹی پریس لنڈن نے ۱۹۳۷ء میں شائع کیا تھا۔ اس کتاب میں آیت زیرِ بحث کا مطلب وہی بیان کیا گیا

---

۵۱ یہ ترجمہ محلِ نظر ہے۔ (مدیر) ۵۲ ترجمان القرآن مصنفہ مولانا ابوالکلام آزاد۔

ہے جو مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمہ اور تشریح سے اخذ ہوتا ہے جو درج ذیل ہے:۔

GOD HATH FAVOURED SOME OF YOU ABOVE OTHERS IN THE MATTER OF WHAT YOU HAVE ACQUIRED. THOSE WHO HAVE BEEN FAVOURED SHARE THEIR BENEFITS WITH THEIR SERVANTS WHO THUS RECEIVE THIR PORTION EQUALLY WITH THEIR MASTERS. WILL THEY DENY THAT GOD HATH BLESSED THEM THOUS.

سہولتِ فہم کے لئے اس انگریزی عبارت کا ترجمہ اردو میں درج ذیل ہے:۔

اللہ تعالےٰ نے اکتساب سے متعلق تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے جن کو فضیلت دی گئی ہے وہ اپنے ملازمین کو ان مکتسبہ فوائد میں شریک کر لیتے ہیں[1]۔ اس طرح وہ اور ان کے آقا اپنا اپنا مساوی حصہ حاصل کر لیتے ہیں تو کیا وہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت و برکت کا جس سے اس نے ان کو نوازا ہے۔ انکار کر دیں گے؟

خواجہ احمد الدین ؒ امرت سری نے اپنی تفسیر "بیان للناس" میں بھی یہی مفہوم پیش کیا ہے۔ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:۔

پھر انسان میں بخل کا جذبہ بڑے زور شور سے کام کر رہا ہے۔ اللہ تعالےٰ چاہتا ہے کہ ادنےٰ لوگوں کو اعلیٰ لوگوں کی صف میں بٹھایا جائے اور غلاموں کو بادشاہ بنایا جائے۔ لیکن لوگ اس مال میں جو خدا نے انہیں دیا ہوا ہے۔ غلاموں کو اپنے مساوی بنانا نہیں چاہتے۔ وہ اپنے مال کو خدا کا انعام نہیں سمجھتے۔ بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس مال کو ماں کے پیٹ سے ہی اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں جیسا کہ فرمایا "اور اللہ نے ہی تمہارے بعض کو دوسرے بعض پر روزی میں فضیلت دی ہے۔ سو وہ لوگ جن کو فضیلت دی گئی ہے۔ اپنی روزی کو غلاموں پر لوٹنے والے نہیں ہوتے (بایں خوف) کہ وہ اس میں برابر ہو جائیں۔[2] کیا (وہ ایسا کریں گے اور اپنے مالوں کو اپنی نعمت سمجھیں گے) پھر اللہ تعالےٰ کی نعمت کا انکار کریں گے؟"

مروّجہ تراجم کا مطلب یہ ہے کہ مالک اپنے مملوک کو اگر اس قدر اپنی کمائی میں سے دے دے کہ دونوں برابر ہو جائیں تو یہ اللہ تعالےٰ کی نعمت کا انکار ہے۔ ان کو وہ کمائی اپنے پاس ہی رکھنی چاہیئے تھی۔ کیونکہ یہ اللہ کی دی ہوئی فضیلت ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ان تراجم کے سقم کو ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے:۔

اس آیت میں فھم فیہ سوآءٌ کا مطلب قرار دیتے ہوئے مفسرین نے اسے عدمِ تساوی حال پر محمول کیا ہے

---

[1] مائے ثانیہ کا ترجمہ اس میں موجود نہیں۔ (مدیر) [2] فھم فیہ سواءٌ کا یہ ترجمہ بالکل درست ہے۔ (مدیر)

اور تقدیرِ عبارت یوں قرار دی ہے کہ فھم فیہ سواء۔ بعضوں نے فھم کی فاء کو "حتیٰ کہ" کے معنوں میں لیا ہے۔ لیکن جملہ کا صاف صاف مطلب وہی ہے جو ہم نے قرار دیا ہے یعنی یہ صریح تساوی حالی کی خبر ہے۔ نہ کہ اس کی نفی۔ اور جب مطلب ٹھیک ٹھیک بیٹھ رہا ہے تو پھر کوئی بھی وجہ ہے کہ جگہ سے ہٹنے کے لئے مضطرب ہوں۔" [1]

اس میں شک نہیں کہ اُن مفسّرین نے جن کے تفسیری مطالب سے ہم نے استفادہ کیا ہے عصرِ حاضر کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ مطالب غلط ہیں یا آیت متذکرہ صدر ان معنی کی متحمل نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآنی حقائق کی کوئی انتہا نہیں اور انسانی نسلیں ابدالآباد تک بھی ان حقائق کا احاطہ نہیں کر سکتیں یہی وجہ ہے کہ قرآن ہمیشہ کے لئے بنی نوعِ انسان کی ہدایت کا نصاب ہے اور اس کی آنے والی ضرورتوں میں کامل راہبر۔ متقدمین مفسّرین آیاتِ قرآنی کی تفسیر میں متعدد معانی اور مختلف اقوال نقل کر دیتے تھے مگر جزم و یقین کے ساتھ انہیں معانی کو بیان کرتے تھے جو اُن کے زمانے کے عقول اور اذہان کے مطابق ہوتے تھے۔ آج کے مفسّر کا یہ کام ہے کہ وہ اپنے زمانے کی ضروریات کو سامنے رکھ کر ان کا حل قرآن مجید سے تلاش کرے۔ اور اگر متقدمین کا کوئی قول مل جائے تو اس کو تائید میں نقل کر دے۔

چنانچہ اس آیت کی تفسیر تفسیر کشاف جار اللہ زمخشری متوفی ۵۲۸ھ میں بحوالہ رُوح المعانی (جلد ۱۴) یوں منقول ہے:۔

واختار فی الکشاف ان المعنی انہ سبحانہ جعلکم متفاوتین فی الرزق۔ فرزقکم افضل مما رزق ممالیککم وھم بشر مثلکم واخوانکم وکان ینبغی ان تردوا فضل ما رزقتموا علیھم حتی تتساووا فی الملبس والمطعم کما یحکی عن ابی ذر رضی اللہ عنہ الخ	اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے ارزاق میں فرق رکھا ہیں تمہارے رزق تمہارے غلاموں اور ماتحتوں سے زیادہ ہیں۔ حالاں کہ وہ بھی تم جیسے انسان ہیں اور مناسب یہ ہے کہ تم اپنے رزقوں میں سے فالتو ان کی طرف لوٹا دو۔ یہاں تک کہ لباس اور طعام میں تم میں اور اُن میں فرق نہ رہے۔ اور مساوات قائم ہو جائے۔

تفسیر القرآن بالقرآن

لادینی اور مغربیت کی جو تحریکیں دورِ حاضر میں انسانی دل و دماغ کو پریشان کر رہی ہیں اُن کے پیشِ نظر ضروری ہے کہ مسلمان قرآن مجید کی تعلیمات کا از سرِ نو مطالعہ کریں اور سورہ نحل کی اس آیت کی تفسیر کو جو ہم نے نقل کی ہے تسلیم کر لیں۔ قرآن مجید

---

[1] ترجمان القرآن۔

میں معاشی مساوات پر یہ آیت نص کا حکم رکھتی ہے اور اس کی سند سے ہمارا معاشی نظام حقیقی اخوت و مساوات کے اسلامی اصول پر قائم ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید کی یہ آیت اس بارے میں محکمات میں سے ہے مگر اس آیت کے ہم معنی تعلیم قرآن مجید کے ہر صفحہ پر نمایاں ہے اور علمائے اسلام نے اسلامی معاشی مساوات کے اصول کو قرآن مجید کی دوسری آیات سے نکالا ہے۔ مگر ہمارے خیال میں بطریق استخراج نہ کہ بطریق نص۔ چنانچہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن آیت ھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعاً (سورہ بقرہ) کی تفسیر میں اپنی کتاب ایضاح الادلہ میں یوں رقم طراز ہیں:۔

"جملہ اشیاء عالم بدلیل فرمان واجب الاذعان خلق لکم ما فی الارض جمیعاً تمام بنی آدم کی مملوک معلوم ہوتی ہیں یعنی غرض خداوندی تمام اشیاء کی پیدائش سے رفع حوائج جملہ ناس (انسان) ہے اور کوئی شے فی حد ذاتہ کسی کی مملوک خاص نہیں۔ بلکہ ہر شے اصل خلقت میں جملہ ناس (انسان) میں مشترک ہے اور من وجہ سب کی مملوک ہے۔ ہاں بوجہ رفع نزاع و حصولِ انتفاع قبضہ کی علت مِلک مقرر کیا گیا اور جب تک کسی شے پر ایک شخص کا قبضہ تام مستقل باقی رہے، اُس وقت تک کوئی اَور اس میں دست درازی نہیں کر سکتا۔ ہاں خود مالک و قابض کو چاہیئے کہ اپنی حاجت سے زائد پر قبضہ نہ رکھے بلکہ اس کو اَوروں کے حوالہ کرے کیونکہ باعتبارِ اصل اَوروں کے حقوق اس کے ساتھ متعلق ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مال کثیر حاجت سے بالکل زائد جمع رکھنا بہتر نہ ہُوا۔ گو زکوٰۃ بھی ادا کر دی جائے۔ اور انبیاء و علماء اس سے بغایت مجتنب رہے۔ چنانچہ احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے بلکہ بعض صحابہ و تابعین وغیرہم نے حاجت سے زائد رکھنے کو حرام ہی فرما دیا۔ بہرکیف غیر مناسب و خلافِ اولیٰ ہونے میں تو کسی کو کلام ہی نہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ زائد علی الحاجت سے اس کی کوئی غرض متعلق نہیں۔ اور اَوروں کی مِلک من وجہٍ اس میں موجود۔ تو گویا شخص مذکور من وجہٍ مالِ غیر پر قابض و متصرف ہے۔ اور اس کا حال بعینہٖ مالِ غنیمت کا سا تصور کرنا چاہیئے۔ وہاں بھی قبلِ تقسیم یہی ہے کہ کل مالِ غنیمت تمام مجاہدین کا مملوک سمجھا جاتا ہے مگر بوجہ ضرورت و حصولِ انتفاع بقدر حاجت ہر کوئی مال مذکور سے منتفع ہو سکتا ہے۔ ہاں حاجت سے زائد جو رکھنا چاہے، اس کا حال آپ کو بھی معلوم ہے کہ کیا ہونا چاہیئے۔"

حضرت مولاناؒ کی تشریح ہم نے تبرکاً پیش کر دی مگر ہم آیت منصوص کے بعد کسی مزید تشریح کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ تاہم احادیث، اسوۂ رسول صلعم و اسوۂ صحابہؓ سے اپنے موقف پر استمداد کرتے وقت علمائے امت کے چند اقوال بھی پیش کریں گے۔

توحید و اخوت کی تبلیغ البیان کا مقدس فرض ہے۔

دنیا کے جملہ مذاہب پر اسلام کی فضیلت
کا
تاریخی ثبوت

سروجنی نائیڈو آنجہانی کے عقیدت مندانہ افکار

(ترجمہ : سعید اختر، بی اے علیگ)

آنجہانی سروجنی نائیڈو بلبلِ ہند نے ۱۹۲۲ء میں کولمبو زاہرہ کالج کی انجمن ادب کے شاندار اجتماع میں ایک بصیرت افروز تقریر کی تھی۔ اس تقریر کا یہ جملہ ابھی تک فضا میں گونج رہا ہے کہ "اسلام اس لحاظ سے تمام مذاہب پر فوقیت رکھتا ہے کہ اس نے دنیا کو حقیقی جمہوریت کے خد و خال سے روشناس کیا" تقریر کا متن ذیل میں ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔

"جب مجھے کالج کے طلبہ کے ایک قلیل التعداد اجتماع میں تقریر کی دعوت دی گئی تو مجھے یہ احساس ضرور دامن گیر ہونا چاہیے تھا کہ عنوان کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کی بابت نہ صرف نوخیز طلبا بلکہ موجودہ دور کے مسائل سے دلچسپی لینے والے بھی ضرور یہ جاننے کے لئے بے تاب ہوں گے کہ میرے یا کسی اور بزرگ یا خاتون کے جدید دنیائے اسلام کے بارے میں کیا نظریات ہیں۔ یہ موضوع جو میں نے اظہارِ خیال کے لئے منتخب کیا ہے، طبع زاد نہیں۔ اس میں میرے بیٹے کی تجویز کو بھی دخل ہے۔ اس برخوردار نے میری توجہ ایک ایسی کتاب کے عنوان کی جانب مبذول کی، جس کا میں نے مطالعہ نہیں کیا تھا لیکن مجھے اسلام پر کسی کتاب کے مطالعہ کی ضرورت نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ روز بروز جیتی جاگتی تاریخ کے صفحات یکے بعد دیگرے کھلتے جا رہے ہیں۔ دراصل جدید دنیائے اسلام اس قدیم اور زبردست دنیائے اسلام کی صدائے بازگشت ہے۔ جس نے دنیا کو جمہوریت کی تعلیم دی تھی۔ مجھے غیر مسلم حاضرین کی ایک کثیر تعداد نظر آ رہی ہے میں جب بھی مسلم اجتماعات میں غیر مسلموں کو دیکھتی ہوں تو میری مسرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ اس مسرت کی خاص وجہ یہ ہے کہ عیسائی، ہندو، بدھ اور پارسی مذہب کے پیرووں کے دلوں میں دنیا کے اس عظیم الشان اور آخری مذہب کے حقیقی تصورات

کے بارے میں حد درجہ شکوک وشبہات راہ پاگئے ہیں۔ مَیں نے عمداً اسلام کو دنیا کے مذاہب میں عظیم الشان اور ساتھ ہی ساتھ نو دوسال ... ... مذہب قرار دیا ہے۔ اس سے ہندو مذہب، عیسائی مذہب اور بُدھ مذہب کی تحقیر مقصود نہیں بلکہ صرف اس لحاظ سے اسلام کو سب سے بڑا مذہب تصور کرتی ہوں کہ اس نے موجودہ دنیا کو حقیقی جمہوریت کے نام سے آشنا کیا اور اسی میں اس کی اہمیت کا راز مضمر ہے کیونکہ آج تہذیب کا رُخ اور دنیا کی خواہشات کا ماحصل یہی ہے کہ نئی دنیا کی تشکیل اُسی برادری کی صورت میں کی جائے جس کی تلقین آج سے چودہ سو برس پیشتر صحرائے عرب کے ایک گلہ بان نے کی تھی۔ مَیں جدید دنیائے اسلام کے بارے میں کچھ کہنا قطعاً ضروری خیال نہیں کرتی کیونکہ تاریخ اسلام خود جدید دنیا سے تعلق رکھتی ہے جب میرے آباؤ اجداد صدیوں قبل فلسفیانہ موشگافیوں میں مصروف تھے اور نوجوان قوموں کو علم و ہنر کا پیغام دے رہے تھے تو عرب اس وقت تک غیر مہذب تھا۔ عرب میں اُس وقت خانہ بدوش اور وحشی قبائل آباد تھے۔ جب بُدھ گیا اور سارناتھ کے درختوں کے زیر سایہ نروان کا زبردست پیغام دنیا کو دے رہے تھے۔ اُس وقت یہ تخیل بھی نہ تھا کہ لفظ جمہوریت کے بھی کوئی معنی ہیں۔ جب (مسیحی نظریہ کے مطابق) کفار کے ہاتھوں حضرت مسیح مصلوب ہوئے ہیں۔ اُس وقت بھی اخوت و مساوات کے تصور سے لوگ آشنا نہ تھے۔ آشنا تو کیا ہوتے، انھوں نے اس تصور کے خلاف ایک محاذ قائم کیا جس کے نتیجہ میں ان فضائل کا وجود بھی باقی نہ رہ سکا۔

زمانہ کا تقاضا یا قدرت کا فیصلہ تھا کہ عرب کے ریگستان سے ایک گلہ بان اٹھے اور تمام دنیا کو آخری شکل میں اس اخوت و جمہوریت اور مساوات کی کامل و اکمل تعلیم دے جس کی رُو سے نہ صرف قبائلی امتیازات ہی ختم ہوں بلکہ ادنیٰ و اعلےٰ کی تمیز بھی باقی نہ رہ سکے۔

آخر یہ اونٹوں کا حدی خوان کون تھا؟ اور آخر ایسا ہُوا کیوں کہ عرب کے بے آب و گیاہ ریگستان میں ایک شخص کو اس منصب جلیلہ پر فائز کیا گیا کہ وہ دنیا کو اُمید و سکون کا مسرور افزا پیغام دے۔ وجہ یہ تھی کہ دنیا دوسرے بڑے بڑے مذاہب کی مسخ شدہ تعلیمات سے بیزار ہو چکی تھی۔ آخر دنیا نے دوسرے مذاہب کے پادریوں اور برہمنوں کے ظلم و ستم کی (اُس ظلم و ستم کی جو بیک وقت ایمان اور اعتقاد کے دامن پر سیاہ داغ بھی تھا اور وجہ بدنامی بھی) تمام زنجیروں کو توڑ کر نجات کی راہیں ڈھونڈ نکالیں۔

آخر وہ وقت آ پہنچا، جب اُس خدائے رحمٰن نے جو پردۂ غیب سے ہر زمانے میں انسانوں کو سابقہ عہد کی قیود سے نجات دلانے کا سامان بہم پہنچایا کرتا ہے صحرائے عرب کے ایک سلیم الطبع انسان کے قلب کو اپنی وحدانیت کے رازہائے سربستہ کے انکشاف کے لئے منتخب کر لیا۔

یہ بذاتِ خود ایک زبردست حقیقت کا انکشاف اور یقین کا لازوال سرمایہ ہے کہ تمام مخلوق جو اُس نے پیدا کی ہے آپس میں ایک ناقابلِ تقسیم رشتۂ اخوت میں منسلک ہے۔ یہی اسلام کا حقیقی پیغام ہے۔ اگر ہم ایک امریکی مصنف سے یہ عنوان مستعار لیں اور جدید دنیائے اسلام کا تذکرہ کریں تو یہ دنیا کے سامنے اُس پیغام کا اعادہ ہوگا۔ جو اُسے سُنایا گیا اور جسے اُس نے بھلا دیا۔ جب تک دنیا میں دل کو صحیح نصب العین کی جستجو اور انسان کو اخوت و مساوات کے اعلیٰ اصولوں کی روشنی میں زندگی کی خواہش ہے اُس وقت تک اسلام کی عظمت کا سکہ قائم رہے گا۔ اُس کی عظمت و جلال میں رائی کے برابر فرق نہیں آسکے گا۔ کل مجھے گیلے میں ایک مسلم اجتماع کے سامنے تقریر کا اتفاق ہُوا۔ وہ اس قدر چھوٹا مجمع تھا کہ اس زبردست اجتماع کے ایک گوشہ میں سما سکتا تھا لیکن پھر بھی اس قلیل مجمع میں عیسائی، ہندو اور بدھ مذہب کے پیرو موجود تھے۔ جو عقیدۃً اسلام کا ایک غلط تصور لے کر وہاں آئے تھے۔

اسلام کا عطیہ

لیکن میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ وہ اس حقیقت کے اعتراف کے ساتھ واپس گئے کہ انہوں نے اس عظیم الشان جمہوری مذہب کے سمجھنے میں کوتاہی کی تھی۔ مجھے پورا اعتماد ہے کہ انہوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا کہ مغربی دنیا جس چیز کو جدید دنیائے اسلام کے نام سے تعبیر کرتی ہے۔ دراصل صحرائے عرب کے نخلستانی تخم کی سدا بہار فصل ہے۔

مجھے حیرت ہے کہ کتنی عیسائی خواتین آج یہ اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکیں کہ اسلام نے طبقہ نسواں کے حقوق و فرائض اور معاشرتی حیثیت کے سلسلہ میں جو زریں تعلیم دی ہے، اُس کی کہیں مثال ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔ کتنے میرے ہم مذہب، کتنے بدھ مذہب کے ماننے والے اور کتنے عیسائی فرقے سے تعلق رکھنے والے حضرات اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ چودہ سو برس گذرے ایک پیغمبر پیدا ہُوا اور اُس نے فرمایا "اے جائداد منقولہ! تو عورت بن، اپنے قدموں پر سیدھی کھڑی ہو اور سورج کی طرف دیکھ!

یہ ایک جداگانہ تصور ہے جس کے پیش نظر مسیحی مصنفین اسلام میں عورت کا درجہ بیان کرتے ہیں۔ کتنے ہیں جو اعتراف کرتے ہیں کہ موجودہ یورپ کی تہذیب اُسی شمع علم کی روشنی ہے جو ہسپانوی اور مراکشی لے کر گئے تھے۔ کتنے نفوس ہیں جو زبردست ایرانی ادب کا مطالعہ کرتے اور آریائی اہلِ ایران سے اپنا رشتہ جوڑتے ہیں اور اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ قدیم فارسی ادب جس قدر شیریں اور دلکش ہے اُس کے رگ و ریشے میں اُن اسلامی تاثرات کا ظہور اپنی جداگانہ نمود رکھتا ہے جنہوں نے اس خستہ حال مگر حسین قوم کو قوت کا لازوال سرمایہ عطا کیا۔ جب میں خستہ حال کا لفظ استعمال

کرتی ہوں تو اس سے قطعاً میرا مقصد کسی قسم کی توہین کرنا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ وہ تمام اقوام جو خواب آور حُسن کی سیج آراستہ کرتی ہیں، اُنہیں بلا شبہ زنانہ صفات کا حامل اور خستہ حال ہو جانا چاہیئے۔ تاوقتیکہ قوت نمو کی وہ روح اور کام کا وہ مزاج جو حقیقی اور جفاکش زندگی سے پیدا ہوتا ہے اُس قوم کے رگ و ریشہ میں سرایت نہ کر جائے۔ جب اہلِ عرب اس نئے مذہب کا پیغام لے کر سرزمینِ فارس میں پہنچے۔ تو ریشم و اطلس کا لباس زیب تن کرنے، زر و جواہرات سے کھیلنے والے، کوہستان برف سے اپنے شربتوں کو ٹھنڈا کر کے پینے والے اور سدا بہار باغوں سے شگوفے توڑنے والے اہلِ ایران نے ایک قہقہہ بلند کیا اور کہا "کیا یہ اونٹنی کا دُودھ پینے والے، مگرمچھ کا گوشت کھانے والے ایران کی شہنشاہیت کا مقابلہ کرنے آئے ہیں عیش و عشرت کے متوالے اہلِ ایران سیاہ کمبل اوڑھنے اور مگرمچھ کے گوشت اور اونٹنی کے دُودھ پر زندگی گذارنے والے صحرانشینوں کے لئے اس سے زیادہ تحقیر کے الفاظ اور کیا استعمال کر سکتے تھے لیکن کس نے دنیا کو انسانی قسمت اور انسانی زندگی کے عظیم ترین تصور سے روشناس کیا۔

عربوں کی فنی معراج

جب تم اسپین کی تاریخ کا مطالعہ کرو گے۔ اُس تاریخ کا جو کسی مسلمان نے نہیں بلکہ مسیحی مشنریوں نے ترتیب دی ہے، تو تمہیں معلوم ہوگا کہ کس قدر علوم و فنون ہیں جو عربوں کے ذہنی کمالات کا ماحصل ہیں اور آج یورپ وہی علوم و فنون ہندوستان و لنکا کو سکھا رہا ہے۔ کیا تم نے کبھی اس حقیقت کو جانا ہے کہ فنِ عمارت سازی کے بیشتر اعلیٰ ترین شاہکار جن کی زیارت کے لئے دنیا کے دُور دراز گوشوں سے بے شمار مرد اور عورتیں جوق در جوق کھچی چلی آتی ہیں کس کی عظمت و جلال کے قصے سنا رہے ہیں۔ بلاشبہ ان فنی کمالات کے نمونوں کی بلند چوٹیوں پر اسپین کے مسلمانوں کا نام روشن حروف میں کندہ نظر آتا ہے۔ اسپین کا الحمرا جو آج بھی بلاشبہ تاج محل کی رفعت و شکوہ سے چشمک زنی کر رہا ہے، عرب ذہن کا لافانی کارنامہ ہے۔ قرطبہ اور غرناطہ کی یونیورسٹیاں آج بھی جرمنی، اٹلی اور فرانس کی یونیورسٹیوں کے سامنے مکمل ترین علم و فضل کی شمع روشن کئے ہوئے ہیں۔

آؤ اور اُس دَور کی تاریخ، ادب اور تمدن کا جائزہ لو جب کہ عیسائی دنیا کی عورتیں اسی طرح پردہ نشین تھیں، جس طرح آج تمہاری وُہ عورتیں جو اس محفل میں شریک نہیں ہو سکی ہیں۔ جب کہ جہالت کے نقاب اُن کے چہروں کو ڈھانکے ہوئے تھے جب کہ اُن کا مقصد محض بچے پیدا کرنا، کھانا پکانا اور انسان کی لونڈی بن کر زندگی کے دن گذارنا رہ گیا تھا۔ یہ اسپین کے موری باشندوں کا ادب وہ تھا جس کے ہر صفحہ پر فلسفی، شاعر، ریاضی دان خواتین کے نام نظر آتے تھے لیکن جب تم ان حقائق کا تذکرہ یورپ یا کسی اَور مقام کے نیم روشن دماغ حامیانِ ریا کے سامنے کروگے تو وہ چلا اٹھیں گے

"ارے تمہاری آنکھوں پر تو تعصب کے پردے پڑ گئے ہیں۔ تمہارے اندر اسلامی روح اس درجہ سرایت کر گئی ہے کہ تم جب بھی اسلام کے بارے میں سوچتے ہو تمہاری آنکھیں خوشنما نظارے دیکھتی ہیں اور اُن کے آگے ایک سنہرا دُھندلکا چھا جاتا ہے لیکن یہ محض خواب و خیال نہیں ہے۔ یہ نظر فریب نظارہ نہیں ہے۔ یہ آخری عہد وسطیٰ کی تاریخ کے صفحات پر سونے کے حروف سے لکھے ہوئے واقعات ہیں۔ میرے ایک دوست اور حیدر آباد کے ایک مشہور شاعر نے دنیا کے اِس عظیم الشان تمدن کی عظمت کو چند الفاظ میں کس حسن و خوبی سے ادا کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں "ایران کے جدید مقامات مقدسہ سے لے کر گوتھی[1] اسپین تک تمام فضا اِن کی شمع سے منور ہو گئی تھی۔

بہت عرصہ ہوا جبکہ میں ایک بچی تھی۔ میرے کان "یورپ کے مرد بیمار" کا تذکرہ سُنا کرتے تھے۔ اِس کم سِنی کے زمانے میں سیاست کا موضوع میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ میں تعجب کیا کرتی تھی کہ ایک انسان اس قدر طویل عرصہ تک بیمار رہ کر بھی ہنوز زندہ ہے۔ لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ مجھے معلوم ہو گیا کہ سلطان عبد الحمید ایک مرد بیمار نہ تھا، بلکہ اُس نے دوسری قوموں کو بیمار ڈال دیا تھا۔ وہ بڑا آدمی تھا لیکن یورپ کی عیسائی اقوام اُس عہد کی عیسائی ذہنیت کے مطابق اسلامی عَلَم کو برداشت نہ کر سکتی تھیں۔ وہ زمانہ گزر گیا، مردِ بیمار بھی اس دنیا سے رخصت ہو گیا لیکن مرد بیمار کے جانشین وہاں موجود رہے۔ ان کا جسم تندرست تھا۔ اُن کے ارادے راسخ اور اُن کے عزائم غیر متزلزل تھے۔ آزادی کی قربانگاہ پر خونِ شہادت کے قطرے کبھی رائیگاں جانے والے نہ تھے۔

بلند بانگ اعلان

اے مسلمانو! میں چاہتی ہوں کہ تم میں سے سب جو یہاں موجود ہیں، اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں۔ تم ایک پُر عظمت ورثہ کے مالک ہو۔ اے مسلمانو! تم کیا کر رہے ہو کہ اپنے پیغمبر کا عَلَم ساری دنیا سے کٹ کر الگ بلند کر رہے ہو۔ وہ دنیا کو اخوت و برادری کا پیغام سنانے آیا تھا، اور تم ہو کہ اپنے اپنے مقامات پر دوسرے فرقوں سے علیحدہ ہو کر کھڑے ہو گئے ہو۔ وہ رحمتِ عالم بن کر آیا تھا، مگر تم نے اپنے چاروں طرف ایک دیوار کھینچ لی ہے اور اُس میں محصور ہو کر بیٹھ رہے ہو۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ بلا شبہ تمہارا یہ طرزِ عمل تمہارے پیغمبر کی دعوت کے سراسر منافی ہے۔ اس کی توہین ہے۔ اُس کا کھُلم کھُلا مقابلہ ہے، اُس کی سراسر تکذیب ہے۔ تم یورپ کے شہروں میں علم کی شمعیں لے کر پھیل گئے تھے۔ مگر آج خود جہالت و توہم پرستی کی تاریکی نے تمہارے قلوب کا احاطہ کر لیا ہے۔ کیا اسی لئے تمہارے پیغمبر مبعوث ہوئے تھے؟ کیا اسی لئے مقدس عمارتیں تمہیں بزرگوں اور ولیوں کی داستانیں سُنا رہی ہیں؟ کیا اسی لئے تم جدید دنیا کے

---

[1] گاتھ اسپین کی ایک قوم تھی۔ گوتھی سے مراد وُہ طرزِ تعمیر ہے جو مغربی یورپ میں بارھویں سے سولھویں صدی تک رائج تھا جس کی خصوصیت نوک دار محراب ہے۔

اسلام کی تعمیر میں سرگرم ہو جانے کے خواہشمند ہو تمہیں چاہیئے کہ پیغمبر خدا کے عالمگیر تصور اور نصب العین پر ثابت قدم رہو جو اُس نے تمہارے لئے مقرر کیا تھا۔ اُس انسان نے جو خدائی کا دعویٰ نہیں کرتا تھا جو پیغمبری کے دعوے سے بلند تھا جو خود کو خدا کا نائب کہہ کر دنیاوی عظمت وجلال کا طالب نہ تھا۔ اُس انسان نے اپنے زمانہ میں اپنے خاص انداز میں دنیا کو پکارا اور کہا کہ مصائب کا تحمل کرنے میں امن ہے۔ اتحاد میں یگانگت ہے نفس کو قربان کرنے سے ایمان پختہ ہوتا ہے اور اپنے ہم مذہبوں اور افراد ملت کی شرافت و قوت کے ذریعہ ہی سے عقیدۂ اسلام ستاروں کی بلندی تک پہنچ سکتا ہے۔ یہی وہ راہ ہے جس پر تمہیں چلنا ہے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ مسلمان کبھی اپنی ملکی حیثیت پر قناعت نہیں کر سکتا۔ وہ کبھی نہیں کہہ سکتا، اُسے کبھی نہیں کہنا چاہیئے کہ "میرا وطن صرف یہی جگہ ہے۔" ایک ہندو کے لئے یہ سزاوار ہے، ہاں ایک ہسپانی کے لئے یہ مناسب ہے لیکن ایک مسلمان کے لئے ہرگز زیبا نہیں۔ یہ اس کا فرض ہے کہ اپنے نقطۂ نظر کو جغرافیائی اور ذہنی بندشوں، صوبوں اور جزیروں کی قیود و حدود سے آزاد کر دیں اور صاف صاف اعلان کر دیں کہ "کوئی قوم محدود ہو کر نہ تو زندہ رہ سکتی ہے اور نہ رہ سکتی ہے۔" اُسے دوسری اقوام کے شانہ بشانہ زندہ رہنا ہوگا۔ اور اپنی ہمدردی تعاون اور ذہن کو اُس بلند ترین منزل کے لئے وقف کر دینا ہوگا جس پر تمام دنیا کی نگاہیں جمی ہوئی ہیں۔

حب الوطنی سے اسلام کا مقام بلند ہے

میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ قومیت کے اس وسیع نظریہ کی موجودگی میں جب کہ ہم قومی آزادی کی جدوجہد میں مصروف ہیں اور مصائب کے درد و کرب سے بے چین ہو رہے ہیں۔ بہ آسانی اس خیال کو ذہن سے نکالا جا سکتا ہے۔ کہ ہماری قوم ہی سب کچھ ہے جیسا کہ ایک انگریز عورت نے ایک جرمن کی گولی کا نشانہ بنتے وقت کہا تھا: "محض حب الوطنی کافی نہیں ہے" حب الوطنی قوموں کی تباہی کے پیغام کے سوا کچھ نہیں ہے۔ تم جو کچھ چاہتے ہو، وہ اس حب الوطنی سے بلند تر مقام ہے۔ ایک قوم سے کہیں بڑھ کر دنیا کی تمام قوموں کا ایک دولت مشترکہ میں سمٹ آنا ہے۔ اور ایک قومی تصور سے کہیں بڑھ کر بین الاقوامی نظریہ کی حیثیت ہے۔ جو ہر قوم ہر تمدن اور ہر عقیدہ کو ایک لڑی میں پرو دیتا ہے۔

جذبۂ اقدام عملی

پس تمہارے سامنے سب سے اہم اور معقول کام یہی ہے کہ بدھوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کے ہر جزیرہ میں نظریات کا وہی رُخ متعین کر دو جو تمہارے ہندوستان کے قدامت پسند بزرگیانہ رجحان رکھنے والی ہندو آبادی کے لئے متعین کر دیا تھا۔ تمہاری یہ بینائی ہمالیہ کی بلندیوں اور سمندروں کی وسعتوں سے بھی ماوراء منزل کی جانب ہونی چاہیئے۔ تمہارا فرض یہ ہے کہ

تم خواب کی دنیا میں انقلاب بیداری برپا کر دو۔ تمہاری قوت میں ایک طوفانِ عمل رُوپوش ہونا چاہیئے۔

تمہاری تلوار آگ میں بجھی ہوئی تلوار ہو۔ تمہاری تلوار شعلہ اُگلتی ہوئی تلوار ہو۔ تمہاری زرہ اور تمہارے ہتھیار صبر و تحمل کی قوت اور زمانے کے مطابق زرہ اور ہتھیار ہوں۔

دنیا کی قیادت کا سہرا تمہارے سر بندھے گا۔ تمہارا فرض ہے کہ دنیا کی تعمیری جنگ میں آگے بڑھو اور رہنمائی کا فرض انجام دو۔

یہ تمہاری عورتوں کا کام ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور دنیا سے کہیں "دیکھو ہمارے پیغمبرؐ نے اپنے زمانے میں دنیا کی عورتوں کو وُہ مرتبہ عطا کیا جس نے جانوروں، بھیڑوں، گھوڑوں اور گھریلو استعمال کے برتنوں کی صف میں شمار کئے جانے کی ذلت سے نجات دلائی۔ لیکن ہم وہ ہیں جو تمہارے ساتھ خدا کی عظمت و جلال میں شریک ہونے والی ہیں۔ وہ ہیں جن کا تعلق بی بی فاطمہ کی نسل سے ہے۔ جن کا جہیز چرخہ اور ایک چکی سے زیادہ نہ تھا۔"

تمہیں سادگی کا درس دینا چاہیئے۔ تمہیں زُہد کا معلم بننا چاہیئے۔ تمہیں خیرات سکھانی چاہیئے اور ہر چیز سے بڑھ کر قربانی کا ثبوت پیش کرنا چاہیئے۔ تمہیں امن کا پیغام سنانا چاہیئے۔ اُس امن کا جو ہر مسلمان اپنے دوسرے مسلمان بھائی کے لئے اسلام کے ذریعہ روا رکھتا ہے۔ اُس امن کا جو خدا کی مرضی کو پورا کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

میرے بھائیو! میرے مسلمان بھائیو! تم جو اپنے پیغمبر کی مرضی پر چلنے والے ہو صرف اسی صورت میں تمہیں یہ حق پہنچتا ہے کہ کعبہ کی جانب رُخ کر کے حمد و ثنا کا راگ الاپ سکو۔ (مدینہ)

بیا تا کارِ ایں اُمّت بسازیم
قمارِ زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجدِ شہر
کہ دل در سینۂ مُلّا گدازیم

اقبالؒ

ماخذ تعزیراتِ پاکستان

(از سید عبدالقیوم صاحب وکیل)

علوم متعلقہ قرآن مجید یعنی اصولِ تفسیر، تفسیر، اصولِ حدیث، حدیث، سیرت، اسماء الرجال، اصولِ فقہ، فقہ، لغت، تاریخ وغیرہ۔

علوم متذکرہ میں سے صرف تفسیر و حدیث اور فقہ کے متعلق کچھ تفصیل بیان کرنے کی ضرورت ہے۔

تفسیر | مفسّرین کے چھ طبقے ہیں:-

۱۔ صحابہؓ کا طبقہ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ۔ عمر فاروقؓ۔ عثمان غنیؓ۔ علی مرتضیٰؓ۔ ابن مسعودؓ۔ ابن عباسؓ۔ ابی بن کعبؓ۔ زید بن ثابتؓ۔ ابو موسیٰ اشعریؓ۔ عبداللہ بن زبیرؓ۔ انسؓ۔ ابو ہریرہؓ۔ عبداللہ بن عمرؓ۔ جابر رضی اللہ عنہم۔

۲۔ تابعین کا طبقہ۔ مجاہد۔ عطا ابن ابی رباح۔ عکرمہ مولاے ابن عباس۔ سعید بن جبیر۔ طاؤس۔ زید بن اسلم۔ ابن مسعود کے اتباع وغیرہ رحمہم اللہ تعالےٰ۔ اس طبقہ میں مجاہد بلند پایہ مفسّر ہیں۔

خصیف کا قول ہے: فان اعلمهم بالتفسير مجاهد۔ مندرجہ صدر دونوں طبقے قدماء مفسّرین کے ہیں۔

۳۔ سفیان بن عیینہ۔ وکیع بن جراح۔ شعبہ بن حجاج۔ یزید بن ہارون۔ عبدالرزاق۔ آدم بن ابی ایاس۔ اسحٰق بن راہویہ۔ روح بن عبادہ۔ عبد بن حمید۔ ابوبکر بن ابی شیبہ وغیرہ۔ اس طبقے کے مفسّرین صرف صحابہ و تابعین کے اقوال کے جامع ہیں۔

۴۔ ابن جریر طبری اور ان کے بعد ابن ابی حاتم۔ ابن ماجہ۔ حاکم۔ ابن مردویہ۔ ابن حبان۔ ابن منذر ہیں۔ لیکن آخر الذکر چھ مفسّر انہی اقوال پر حصر کرتے ہیں جو ابن جریر کی تفسیر میں مذکور ہیں۔

۵۔ اس طبقہ کے مفسّروں نے تفسیروں میں اقوال بے سند اور بلا تمیز صحیح و غلط مخلوط طور پر درج کر دیئے ہیں۔

۶۔ اس طبقہ کے مفسّرین نے خود فقہ وغیرہ علوم کو مدِنظر رکھ کر تفسیر کی ہے۔ موجودہ زمانے میں سب سے قدیم تفسیریں جو عام طور پر دستیاب ہوتی ہیں۔ وہ دو ہیں:-

(۱) تفسیر ابو محمد سہل بن عبداللہ تستری متوفی ۲۸۳ھ۔ (مطبوعہ مصر) اس کے کل ۲۳۱ صفحے ہیں۔

(۴) تفسیر ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ (مطبوعہ مصر) اس کی ۳۰ جلدیں ہیں۔ یہ کتاب تفسیری اقوال کا سب سے بڑا ماخذ ہے۔ سیوطی نے اتقان میں اس تفسیر کی بڑی تعریف کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سب سے بہتر تفسیر وہ ہے جو قرآن خود اپنی بیان کرے۔ اس کے بعد ان مفسرانہ روایتوں کا درجہ ہے جو کسی معتبر سلسلہ سند سے آں حضرت یا صحابہؓ یا تابعین سے مروی ہوں۔ اور وہ قرآن اور عقل و فطرت کے خلاف نہ ہوں۔

حدیث | وہ ہے جو رسول اللہؐ نے فرمایا، کیا یا آپؐ کے سامنے ہوا۔ اور آپ اسے دیکھ یا سُن کر خاموش ہو رہے۔ جس علم میں آں حضرتؐ کے اقوال و افعال سے بحث کی جاتی ہے۔ وہ علمِ حدیث کہلاتا ہے۔ جب کسی مسلمان سے کہا جائے کہ رسول اللہؐ نے ایسا فرمایا ہے تو وہ فی الفور یہ کلام سنتے ہی سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے لیکن اس سے پہلے یہ تحقیق کر لینا چاہئے کہ کیا بطورِ امرِ واقع وہ آں حضرتؐ کا فرمودہ ہے یا نہیں۔ صحابہؓ حدیث بیان کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہؐ سے حدیثیں کم روایت کرو۔ فاقلوا الروایۃ عن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم (ابن ماجہ)

خود آں حضرتؐ نے صریح الفاظ میں کثرتِ حدیث سے منع فرمایا ایاکم وکثرت الحدیث عنی۔ (ابن ماجہ)

حضرت عمرؓ سنہ ۶ نبوی میں مسلمان ہوئے۔ ۲۶ ذی الحجہ ۲۳ھ کو شہید ہوئے۔ گویا مسلمان ہو کر اٹھارہ برس تک زندہ رہے۔ آپ نے اس عرصۂ حیات میں صرف ستر حدیثیں روایت کیں۔ حضرت علیؓ بھی حدیث کی کثرتِ روایت سے منع فرمایا کرتے تھے۔

صحاح ستہ میں حدیثوں کی کثیر تعداد مذکور ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ان کے جامعین نے بڑی محنت و جانفشانی سے حدیثوں کو جمع کیا اور ان بزرگوں کی کوششیں قابلِ صد تحسین ہیں اور یہ بزرگ نہایت ادب و احترام کے مستحق ہیں لیکن وہ روایتوں کے جمع کرنے اور ان کی تصحیح و تحسین اور تضعیف کے متعلق انسانی لغزشوں اور غلطیوں سے مبرا نہیں اور ان کی بعض احادیث مرویہ میں سقم پائے جاتے ہیں۔ اس لئے ہم محدثین کے طبقات بیان کرنے کی بجائے حدیث کی چھ صحیح مشہور کتابوں کی کیفیت جسے صحاح ستہ کہتے ہیں بمختصر طور پر ذیل میں لکھتے ہیں۔

صحیح بخاری۔ حافظ محمد اسمٰعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ۔ اس کتاب کی حدیثوں کے جامع ہیں اور کتاب مذکور میں سات ہزار دو سو پچہتر حدیثیں موجود ہیں۔ اگر اسانید مکررہ کو حذف کر دیا جائے تو چار ہزار باقی رہ جاتی ہیں۔ بعض محدثین کے نزدیک بخاری کے اسّی راوی ضعیف ہیں۔ اور ان کے ۴۳۵ راویوں سے مسلم نے روایت نہیں کی۔ (شرح الفیہ عراقی - علامہ سخاوی)

صحیح مسلم۔ مسلم بن حجاج نیشاپوری المتوفی ۲۶۱ھ اس کے جامع ہیں۔ اس کتاب میں ۱۶۰ ضعیف راویوں کی روایت کردہ حدیثیں موجود ہیں۔ اور بخاری نے مسلم کے ۶۲۰ راویوں سے اور بقول حاکم نیشاپوری ۶۲۵ سے روایت نہیں کیا۔

امام نووی کا یہ جواب شافی نہیں کہ مسلم کے نزدیک وہ راوی معتبر ہوں گے۔

دار قطنی نے صحیحین کی حدیثوں کی تنقید کی اور ان میں ۲۱۰ حدیثوں کو مجروح بتایا۔

ابو عبدالرحمٰن نسائی نے ان بعض راویوں کو ضعیف بتایا ہے۔ جن سے بخاری یا مسلم نے مشترکًا یا منفرداً روایت کیا ہے۔ (۱) محققین کے نزدیک صحیحین میں جو احاد حدیثیں مذکور ہیں، وہ صرف ظن کا فائدہ دیتی ہیں نہ کہ یقین کا۔

جامع ترمذی۔ ابو عیسیٰ ترمذی المتوفی ۲۷۹ھ امام بخاری کے شاگرد ہیں۔ علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے کہ ترمذی کے کسی حدیث کو حسن کہہ دینے پر دھوکا نہیں کھانا چاہیئے۔ لا تغتر فی تحسین الترمذی۔ ابن قیم زاد المعاد میں لکھتے ہیں۔ للترمذی نوع تساهل فی التصحیح۔

سنن ابو داؤد۔ اس کتاب کے جامع ابو داؤد سیستانی المتوفی ۲۷۵ھ ہیں۔ کتاب مذکورہ میں چار ہزار چھ سو حدیثیں مذکور ہیں۔ جب ابو داؤد کو کسی باب میں کوئی حدیث صحیح نہ ملے تو وہ اس میں ضعیف حدیث لکھ دیتے ہیں۔ اس خیال سے کہ لوگوں کی رائے لکھنے کے بجائے ضعیف حدیث لکھ دینا بہتر ہے۔

سنن نسائی۔ ابو عبدالرحمٰن نسائی خراسانی المتوفی ۳۰۳ھ نے اس کتاب میں صحیح اور ضعیف ہر قسم کی حدیثوں کو جمع کر دیا۔ پھر اسے بطور تحفہ کے امیر رملہ کے سامنے پیش کیا۔ تو امیر نے دریافت کیا۔ اکل ما فی هٰذا صحیح کیا اس میں جو کچھ مذکور ہے سب صحیح ہے؟ نسائی نے جواب دیا نہیں۔ اس پر امیر نے حکم دیا صحیح حدیثوں کو چھانٹ لو تب نسائی نے مجتبےٰ تصنیف کی۔ فجرد الصحیح فصنف المجتبیٰ۔ زہر الربیٰ علی المجتبیٰ سیوطی۔

شیخ برہان الدین ابراہیم بقاعی جو حافظ ابن حجر کے شاگرد تھے۔ نکت الوفیہ بشرح الفیہ میں لکھتے ہیں کہ سنن نسائی میں کئی راوی مجہول العین والحال اور مجروح ہیں۔ اور اس کتاب میں ضعیف و منکر اور معطل حدیثیں بھی درج ہیں۔

سنن ابن ماجہ۔ حافظ ابو عبداللہ محمد بن یزید بن ماجہ قزوینی المتوفی ۲۷۳ھ نے قزوین کی تعریف میں بہت سی وضعی حدیثیں بیان کیں۔ اس قسم کی حدیثیں میسرہ کی وضع کردہ ہیں۔

کتاب مذکورہ کے متعلق ذہبی نے سیر النبلاء میں لکھا ہے کہ اس میں بعض حدیثیں منکر اور تھوڑی وضعی بھی مذکور ہیں۔

شیخ صلاح الدین علائی کتاب مذکور کو صحاح ستہ میں شامل نہیں کرتے۔ وہ اس کی بجائے مسند دارمی کو چھٹی کتاب بتاتے ہیں اور بعض کے نزدیک موطا امام مالک چھٹی کتاب ہے۔ نہ کہ سنن ابن ماجہ۔

ابن الصلاح لکھتے ہیں کہ کسی حدیث کا ابو داؤد یا ترمذی یا نسائی کے سنن میں پایا جانا اس امر کی دلیل نہیں کہ وہ صحیح ہے۔

امام ابن ہمام حنفی مصنف فتح القدیر صحاح ستہ کو دوسری سب کتب حدیث سے زیادہ صحیح اور مقدم نہیں مانتے۔

علم اصولِ حدیث میں حدیث کی جانچ پڑتال کرنے کے لئے متعدد اصول وضع کئے گئے ہیں لیکن بڑے اصول دو ہیں:۔

۱۔ سب سے اوّل اگر حدیث قرآن کے مطابق ہے تو درست ہے ۔ ورنہ نہیں۔ بیہقی نے مدخل میں لکھا ہے۔ کہ آں حضرتؐ نے فرمایا کہ میرے بعد حدیثیں بہت پھیل جائیں گی۔ جو قرآن کے موافق ہے۔ وہ میری حدیث ہے جو اس کے مخالف ہے وہ میری حدیث نہیں ۔

۲۔ حدیث کے مضمون پر غور کرنا چاہیئے کہ وہ عقل، فطرت اور عام اصول حس و مشاہدہ کے مخالف ہے یا نہیں اگر مخالف ہے تو وہ وضعی ہے ۔ مثلاً اگر کوئی راوی بیان کرے کہ آں حضرتؐ نے فرمایا کہ ضدین کا جمع ہونا جائز ہے یا دو متوازی خط آپس میں مل سکتے ہیں۔ یا پانی کا طبعی میلان اوپر کی سمت اور آگ کا فطری رجحان نیچے کی جانب ہے تو ایسی روایت کو سنتے ہی سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ وضعی ہے ۔

رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ جب کوئی شخص تمہارے پاس میری حدیث بیان کرے ۔ جو معروف ہے اور وہ منکر نہیں تو اس سے انکار نہ کرو اور اگر وہ منکر ہے یعنی عقل سلیم اس کے ماننے سے انکار کرتی ہے ۔ تو جان لو کہ وہ حدیث جھوٹی ہے۔[۱]

پھر فرمایا کہ جو بات اچھی ہے وہ میری حدیث ہے۔ اور جو اچھی نہیں وہ میری حدیث نہیں۔[۲]

ابن جوزی نے اصول مذکورہ واضح الفاظ میں بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں:۔ کہ ہر ایسی حدیث جو عقل کے مخالف یا اصول مسلّمہ کے متناقض ہو اسے جان لینا چاہیئے کہ وہ موضوع ہے۔ پھر اس کے راویوں کا اعتبار نہ کرو اور نہ ان کی جرح و تعدیل یعنی جانچ پڑتال کرنے کی تکلیف اٹھاؤ۔ یا اگر وہ حدیث حس و مشاہدہ اور نص قرآنی و سنت متواترہ اور اجماع کے مخالف ہے تو اس کے متعلق کسی قسم کی تاویل قبول نہیں کی جائے گی۔"[۳]

---

[۱] اخرج الخطیب عن حدیث ابی هریرة مرفوعاً اذا حدثتم عنی حدیثا تعرفونه ولا تنکرونه فصدقوا به واذا حدثتم عنی حدیثاً تنکرونه فکذبوا به (ظفر الامانی ص۲۹۶) [۲] اخرج احمد فی مسنده عن ابی هریرة مرفوعاً لااعرفن احدکم اتاه عنی و هو متکئ علی اریکته یقول اتلوا علی قرآنا ماجاءکم عنی من خیر قلته او لم اقله فلانا اقوله وما اتاکم عنی من شر فانی لا اقول الشر۔ واخرج ابن ملیکه عن ابی هریرة مرفوعاً قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ما قیل من قول حسن فانا قلته (ظفر الامانی ص۲۹۶-۲۹۸)

[۳] کل حدیث رایته تخالفه العقول او تناقضه الاصول فاعلم انه موضوع فلا تتکلف اعتباره ای تعتبر رواته ولا تنظر فی جرحهم وکذا اذا کان مما یدفعه الحس والمشاهدة او کان مباینا لنص الکتاب والسنة المتواترة والاجماع حیث لایقبل شیئاً من ذلك التاویل (فتح المغیث ظفر الامانی ص۲۳ ۔ نزهة النظر ص۴)

فی الجملہ موجودہ زمانے میں حدیثوں کی بہت سی کتابیں موجود ہیں۔ ان میں بمقابلہ دوسری کتب کے صحیح بخاری، صحیح مسلم، موطا امام مالک، جامع ترمذی، سنن ابوداؤد، نسائی، سنن ابن ماجہ۔ سات کتابیں زیادہ معتبر ہیں۔ ہماری رائے میں صحاح ستہ کی بجائے صحاح سبعہ کہنا چاہیے۔ موطا امام مالک کے متعلق امام شافعی فرماتے ہیں کہ "میرے علم میں روئے زمین پر امام مالک کی کتاب سے زیادہ صحیح کتاب کوئی نہیں[1]۔ یعنی حدیث میں"۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ امام مالک تابعی تھے۔ ان کا زمانہ رسول اللہؐ کے زمانہ سے قریب تھا۔ یہ ۹۰ھ کے قریب پیدا ہوئے۔ اور ۱۷۹ھ میں وفات پائی اور مدینہ ہی میں رہے۔ اور اسی جگہ دفن ہوئے لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ ان سات کتابوں میں جو حدیثیں مذکور ہیں وہ سب صحیح اور مستند ہیں اور ان کے سوا دوسری کتابوں میں جو درج ہیں وہ سب صحیح نہیں۔ حالانکہ کئی حدیثیں دوسری کتابوں میں صحیح مذکور ہیں اور متعدد حدیثیں ان کتب سبعہ میں غیر صحیح درج ہیں۔ ان سات کتابوں پر صحت کا اطلاق اغلبی اکثری ہے نہ کہ قطعی و کلی۔ امام بخاری کا اپنا بیان ہے کہ مجھے ایک لاکھ صحیح حدیث اور دو لاکھ غیر صحیح حدیث یاد ہے۔ مگر میں نے طوالت کے خوف سے بہت سی صحیح حدیثوں کو اپنی جامع میں درج نہیں کیا[2]۔

فقہ[3] | وہ علم ہے جس میں قرآن و حدیث اور اجماع و قیاس سے استنباط کئے ہوئے قابل عمل شرعی احکام مذکور ہیں اور حنفی فقہا کے مندرجہ ذیل طبقے ہیں:-

۱۔ متقدمین۔ شاگردان امام ابوحنیفہ ..... فروعی مسائل کے علاوہ بعض اصولی مسائل میں بھی امام صاحب سے مختلف رائے رکھتے ہیں ..... امام غزالی نے منخول میں لکھا ہے کہ ان کی رائے مذہب حنفی کے ⅔ حصہ مسائل میں امام صاحب سے مختلف ہے۔ انهما خالفاہ فی ثلثی مذهبہ۔ ۲۔ اکابر متاخرین۔ ۳۔ اصحاب تخریج۔ ۴۔ اصحاب ترجیح۔ ۵۔ مقلدین۔

تقلید کے متعلق افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے۔ ابن حزم کے نزدیک تقلید بالکل حرام ہے۔ افسوس ہے کہ وہ محلی میں حنفیوں کے خلاف سخت الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ حنفی علما میں بڑے بڑے جلیل القدر بزرگ گذر چکے ہیں۔ دوسری طرف افراط کا یہ حال ہے کہ کورانہ تقلید کو اس حد تک واجب قرار دیا جاتا ہے کہ بعض مرتبہ قرآن مجید کی صریح آیت، حدیث یا اثر صحابی کے مقابل قول فقہ کو ترجیح دی جاتی ہے ..... حالاں کہ ائمہ اربعہ کی یہ تعلیم نہ تھی۔ وہ غور و فکر اور تحقیق کی ہدایت فرماتے تھے۔ بزرگ ترین امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں۔ هذا رأی نعمان ابن ثابت یعنی نفسہ وهو احسن ما قدرنا علیہ فمن جاء باحسن منہ فهو اولی بالصواب۔ یعنی یہ نعمان بن ثابت کی محتاطانہ رائے ہے۔ (باقی ص۴۴ کے نیچے)

---

[1] ما اعلم فی الارض کتاب فی العلم اکثر صوابا من کتاب مالک۔ مقدمہ ابن الصلاح ص۸

[2] احفظ مأتہ الف حدیث صحیح و مائتی الف حدیث غیر صحیح ..... ما ادخلت فی کتاب الجامع الا صحیح وترکت من الصحاح لملال الطول (مقدمہ ابن الصلاح ص۹)

[3] اس عنوان میں ہم نے تلخیص سے کام لیا ہے۔ (مدیر)

دیانت و حکومت

(از مولانا تمنا عمادی مجیبی پھلواروی)

بنی نوع انسان کو فطرت نے ساری کائنات پر حکمران بنایا ہے۔ یہ ایک ایسا بدیہی دعویٰ ہے جس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کائنات کی جس چیز پر بھی انسان قابو پالیتا ہے اس کو اپنی ملک تصور کرکے فوراً اس پر مالکانہ قبضہ کرلیتا ہے اور مالکانہ تصرف شروع کردیتا ہے۔

یہ ہوس اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ ہر قوی انسان اپنے ضعیف ہم نوع کو بھی اپنا مملوک اور اپنا غلام بنائے رکھنا چاہتا ہے مگر یہ ہوس کسی تنہا شخص کی پوری نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ وہ ضعیف بھی آخر انسان ہی ہے۔ وہ اکیلا اس قوی کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ تو چند ضعیف مل کر اس قوی کو کمزور کردیں گے۔

غرض قوی کو بھی کچھ اپنے حمایتی کھڑے کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور ضعیفوں کو بھی اپنی تنظیمی قوت اس قوی کے مقابلے کے لئے مہیا کرنی پڑتی ہے اور بالآخر فریقین میں بادشاہ اور رعایا۔ اور ان کے درمیان حکام و عمال کا رشتہ قائم ہو کر ایک صورت مصالحت و مسالمت پیدا ہو جاتی ہے۔

انسان فطرۃً اپنے بنی نوع کے ساتھ مؤانست رکھنے پر مجبور ہے۔ پھر عقل جیسی نعمت اس کو ملی ہے جس نے آپس کی مؤانست کے ماتحت ہمدردی و محبت و اخلاص بھی اس میں پیدا کردی۔ یہی وجہ ہے کہ بادشاہ و عمال و رعایا میں تعاون کا دستور قائم ہے مگر بدفطرت افراد کبھی اپنی بدفطرتی کا مظاہرہ کئے بغیر نہیں رہتے۔ اس لئے ایک دوسرے پر ظلم بھی کرتا ہے اور طرح طرح کے جرائم کا بھی ارتکاب ہوتا رہتا ہے۔

(بقیہ از صفحہ ۴۳) اگر کوئی اس سے بہتر بیان کرے تو وہ راستی کا زیادہ مستحق ہے۔

بہ از من سخن گفت دانا یکے است   کہ بالاتر از علم او علم نیست

پس ہر اہل نظر کے لئے لازم ہے کہ وہ فقہ کے کسی قول کو صحیح ماننے یا اس پر عمل کرنے سے پہلے دیکھ لے کہ قول مذکور قرآن، حدیث، آثار صحابہ، عقل و فطرت اور حس و مشاہدہ کے مسلمہ اور صحیح اصولوں کے مطابق ہے یا نہیں۔ اگر مطابق ہے یا ان سے مستنبط ہے تو درست ہے ورنہ نہیں۔ (ماخوذ از "تعزیرات پاکستان")

مظالم و جرائم شخصی و خانگی بھی ہوتے ہیں کہ ایک شخص نے دوسرے شخص پر کوئی ظلم کیا۔ یا ایک گھر کے لوگوں نے دوسرے گھر کے لوگوں کو کچھ نقصان پہنچایا اور جماعتی بھی کہ ایک قبیلے پر ایک قوم پر اثر انداز ہو۔ بادشاہ کی طرف سے رعایا پر ہو یا ایک قبیلے، ایک قوم کی طرف سے دوسرے قبیلے یا قوم پر یا ایک فرد کی طرف سے دوسرے فرد پر، تو اس کو ظلم کہتے ہیں۔ یا کوئی فرد یا جماعت یا قوم یا پورا ملک بادشاہ کے خلاف عمل کرے تو بغاوت ہے۔ تو شاہی اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے آئین سیاست بنے اور رعایا کے باہمی ظلم و تعدی کے انسداد کے لئے قوانین حکومت۔

آئین سیاست کا تعلق صرف اندرون ملک ہی سے نہیں بلکہ اس کا ایک حد تک تعلق بیرونی بھی ہوتا ہے یعنی دوسرے ہم سرحد ممالک سے۔ کہ اُن سے مصالحت نہ رہنے کی وجہ سے حملے کے خطرے ہر وقت لگے رہتے ہیں۔ اگرچہ ہم سرحد ممالک الگ الگ کمزور بھی ہوں تو وہ سب مل کر بیک وقت ہر طرف سے حملے کرکے ایک بڑا خطرہ بن جا سکتے ہیں۔ اس لئے ہر ملک کے لئے یہ ضروری ہے کہ اپنے اطمینان کے لئے ہم سرحد ممالک سے مصالحت رکھے۔

معاہدہ | تمام آئین و قوانین کا دار و مدار معاہدے پر ہے۔ قوانین کی دفعات مرتب کرکے اس کے اعلان کے معنی ہی یہی ہیں کہ ان دفعات کے مطابق احکام نافذ کرنے کا بادشاہ اور اس کے عمال کا رعایا کے ساتھ پختہ معاہدہ ہے جس کی پابندی بادشاہ و رعایا اور حاکم و محکوم پر یکساں واجب ہوگی۔ اگر معاہدے کی پابندی کا کسی کی طرف سے بھی یقین نہ رہے۔ تو ملک میں امن محفوظ نہ رہے۔

پڑوسی حکومتوں سے بھی جن شرائط پر مصالحت ہوتی ہے۔ اگر ان کی پابندی کا باہم معاہدہ نہ کریں تو ایک کو دوسرے کی طرف سے کبھی اطمینان نہ ہو۔ غرض یہ کہ حکومت کی عمارت کی بنیاد ہی معاہدے پر ہے۔ اس کی ایک ایک اینٹ معاہدے ہی کے گارے پر چنی جاتی ہے۔

اعتماد | معاہدہ بغیر باہمی اعتماد کے ایک فعل عبث ہے جس طرح حکومت بغیر باہمی معاہدوں کے چل نہیں سکتی۔ اسی طرح کوئی معاہدہ بغیر باہمی اعتماد کے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ فریق زبردست، اپنی من مانی شرطیں کمزور فریق سے منوا لے اور وہ بادل ناخواستہ مجبوراً مان لے" یہ ہو سکتا ہے۔ مگر چونکہ ایسے معاہدے کی بنا جبر اور دباؤ پر ہے، باہمی اعتماد پر نہیں۔ اس لئے ایسا معاہدہ اُسی وقت تک باقی رہ سکتا ہے جب تک فریق قوی کی قوت اور فریق ضعیف کا ضعف باقی ہے۔ فریق ضعیف نے قوت پیدا کی اور معاہدہ تارِ عنکبوت کی طرح اُڑ کر رہا۔

یہ کوئی ایسی باریک بات نہیں جس کو فریق قوی نہ سمجھتا ہو۔ وہ خوب سمجھتا ہے مگر اپنے فریق کی موجودہ کمزوری سے جائز یا ناجائز فائدہ اٹھا کر وقتی ہی طور پر سہی ایک بڑی یا چھوٹی مدت تک کے لئے اپنے اس فریق کی طرف سے مطمئن ہو جانا چاہتا ہے۔

دیانت وایمانداری "دیانت" کے معنی "دینداری" یعنی کسی دین کا پابند ہونا اور "ایمانداری" کا صحیح مفہوم ایک ایسی شخصیت ایک ایسی ذات پر ایمان رکھنا ہے جو تمام عالم اور ساری کائنات کا خالق اور خود مختار مالک اور واجب الاطاعت ہے۔ فرماں برداروں کو انعام واکرام۔ اور نافرمانوں کو سزائیں دینے والا ہے۔ اس کا یقین رکھنا کہ میں اور ہر شخص کو ایک دن اُس خالق کے سامنے اپنی زندگی بھر کے ذرّے ذرّے عمل کا، اپنی قلبی نیتوں اور دلی ارادوں تک کا حساب دینا ہوگا۔ وہ مختار کل ہے جس گنہگار کو چاہے بخش دے جس کو چاہے سزا دے۔ وہ سب سے باز پرس کر سکتا ہے۔ اس سے باز پرس کرنے والا کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ عادل ہے۔ منصف ہے۔ ظلم کبھی روا نہیں رکھتا۔ طاقت ور ظالموں، جفاکاروں سے کمزور مظلوموں کا انتقام لینے والا سب سے بڑا وہی ہے۔

تو جس کا ایمان ایسی ایک ذات پر ہے اور وہ اپنے کو اُس کا بندہ اُس کا ایک مخلوق بھی سمجھتا ہے۔ اس کی رحمت، اُس کی مغفرت کا امیدوار رہتا ہے۔ اُس کی سزا اور اُس کے عذاب سے ڈرتا رہتا ہے تو بس وہی ایمان دار ہے۔

اعتماد صرف ایک ایمان دار ہی پر کیا جا سکتا ہے تو جو شخص جیسا کہ میں نے بتایا صحیح معنی میں ایمان دار ہے تو بس اسی پر اعتماد، اُسی پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔ وہ کسی دنیاوی قانون کے ڈر سے، بدنامی کے خوف سے، مظالم وجرائم سے نہیں بچے گا۔ صرف قانون کا ڈر وہیں تک ہے جہاں تک قانون کی زد پہنچ سکے۔ بدنامی کا خوف وہیں ہے جہاں افشائے راز کا اندیشہ ہو۔ جہاں قانون کی زد نہیں پہنچ سکتی بلکہ جہاں قانون خود اپنے ہاتھ میں ہے۔ جہاں کوئی جھانک تاک کرنے والا نہیں۔ وہاں ایک بے ایمان ملحد کو جو کسی ایسی غیبی قوت کا قائل نہ ہو۔ جو صاحب اختیار وعلم ہو اور جزا وسزا کی مالک ہو کون ظلم وجرم سے باز رکھ سکتا ہے۔ اس لئے اعتماد و بھروسا اسی کے اخلاق، اسی کے کیرکٹر، اسی کے وعدے اور اسی کے معاہدے پر پورے اطمینان قلب وتسلّی دل کے ساتھ کیا جا سکتا ہے جو اس خالق کائنات کا وفادار و فرماں بردار بندہ ہو اور اُسی کی فرماں برداری اپنے پر واجب جانتا ہو۔ اس کی نافرمانی سے ڈرتا ہو۔

ایک ملحد بے دین پر مطلق اعتماد نہیں کیا جا سکتا کتنے لوگ ایسے ملے اور ملتے ہیں جو ملحد اور بالکل بے دین ہیں۔ وہ اتنا تو ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ تمام کائنات کا ایک خالق ضرور ہے مگر وہ ایک قوت محض، بالکل بے علم وادراک، بے مشیت وارادہ اور بے قدرت واختیار کو خالق قرار دیتے ہیں۔ یہ خیال جس نے پہلے پہل پیدا کیا۔ اور جن لوگوں نے جب بھی اس خیال کو قبول کیا محض ہوا وہوس کے ماتحت۔ بہتیری خواہشیں ایسی ہیں جن کو ہر دیندار ہر ایماندار جرم اور گناہ سمجھتا ہے اور یہی ایمان داری کی وجہ سے وہ تو بھی ہوا پرستی سے سخت احتراز کرتا ہے اور ہر موقع پر احتراز کرتا ہے۔ جہاں دنیا میں اس کا کوئی بھی گرفت کرنے والا نہ ہو، وہاں بھی وہ گناہ کرتے ہوئے ڈرتا ہے۔ کیوں کہ وہ اپنے خالق کو عالم الغیب اور جزا وسزا

کا مالک مانتا ہے، مگر یہ بے دین ملحد تو جزا و سزا ہی کا قائل نہیں۔ جہاں یہ قانون اور مخلوق کی ملامت کی زد سے محفوظ ہے وہاں اس کو کون ہوا و پستی سے روک سکتا ہے؟ اگر وعدہ خلافی و عہد شکنی کا اس کو موقع ہو۔ اور وعدہ و عہد اس کے مفاد میں سنگ راہ ہوں اور فریق معاہدہ کمزور و ضعیف ہو، جو اس سے بزور پابندیٔ عہد نہ کرا سکے تو کیا یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ایک ملحد، بے دین شخص یا ایک جماعت یا قوم اس وعدے اور عہد کی پابند رہے گی؟ ہرگز نہیں، بار ہا کے تجربے اس کے گواہ ہیں۔ مشکل تو یہ ہے کہ جو دین نہیں رکھتا۔ اس کی قسم کا بھی اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔

ہر حکومت کا ایک دین ہونا ضروری ہے | گذشتہ تصریحات کی روشنی میں یہ ماننا پڑے گا کہ ہر حکومت کے لئے لازم ہے کہ اس کا ایک دین ہو اور اس کے حکم ران اسی دین کے پابند اور معتقد ہوں اور وہ کوئی نیا خود ساختہ دین نہ ہو۔ بلکہ کوئی مشہور و متعارف دین ہو۔ تاکہ اس کی پابندی صحیح اعتقاد و یقین کے ساتھ ہوسکے۔ خود ساختہ دین پر کبھی ایمان و اعتقاد نہیں ہوسکتا اور یہ معلوم کرکے کہ فلاں حکومت کا فلاں دین ہے، رعایا اور آس پاس کی دوسری حکومتیں اس کے دین سے اس کی دیانت اس کے آئین اور اصول قوانین و طریق حکومت سے واقف رہ سکتے ہیں۔ اور اپنے اطمینان و خوف کا توازن قائم رکھ سکتے ہیں۔

کیسا دین قابل اعتماد ہوسکتا ہے؟ | یہ ایک نہایت اہم سوال ہے جس پر غور کرنے کے لئے خود ایمان داری اور وسعت قلب ضروری ہے۔ ایک متعصب ضدی شخص اس سوال پر ٹھنڈے دل سے کبھی غور نہیں کرسکتا۔ بہر حال ذیل کے نمبروں پر نگاہ غور ڈالئے۔

۱۔ جو دین خود کوئی مضبوط آئین سیاست، کوئی مکمل قانون حکومت نہیں رکھتا، وہ ہرگز قابل اعتماد نہیں۔

۲۔ جس دین کے ماننے والوں کے پاس کوئی دستور نامہ (ان کے عقیدے کے مطابق) اس خالق کائنات کی طرف سے آیا ہوا نہ ہو جس پر اس دین کے ماننے والوں کا ایمان ہے اور وہ دستور نامہ تمام ضروریات انسانی کے متعلق ہدایت و تعلیم پیش نہ کرسکے۔ اور پھر انسانی دست برد و تصحیف و تحریف سے ہر طرح تاریخاً اور واقعتہً پاک بھی نہ ہو۔ ایسا مفلس دین کسی طرح قابل اعتماد نہیں ہوسکتا۔

۳۔ دین کی بنیاد بے لوث اور خالص توحید پر ہونی چاہئیے۔

۴۔ اس دینی دستور نامے نے اپنے ماننے والوں کو بھی اپنے نئے نئے پیش آنے والے معاملوں میں غور و خوض اور قیاس و اجتہاد کا حق دیا ہو۔ تاکہ انسانی دماغ معطل نہ رہے۔ اور تدبر و تفکر کی بھی عادت رہے۔

۵۔ "دین حق" وہی ہے جس نے انسانوں کی حکومت انسانوں پر جائز نہ رکھی ہو۔ جس نے تمام انسانوں میں بلا امتیاز

نسل و رنگ و ملک و وطن پوری مساوات قائم رکھی ہو، جو انسانوں میں عزت و ذلت کا سبب صرف تقویٰ و عدم تقویٰ کو اور علم و جہالت کو قرار دیتا ہو۔ اس کے سوا اور کسی وجہ سے ایک کو دوسرے پر کسی طرح کی برتری کا حق نہ دیتا ہو۔ اس دین کا پابند خلیفہ ہو یا بادشاہ، حکام ہوں یا عمال یہ سب اسی خالق کائنات کی حکومت، کائنات اور انسانوں پر چلانے کے ذمہ دار ہوں اور اس دین کے قوانین شاہ و گدا، امیر و مامور اور حاکم و رعایا سب پر یکساں، ایک ہی طریقے سے نافذ ہوں۔

آئینِ سیاست | اس دین کے آئین سیاست ایسے پاک و صاف ہوں، جن کو دغا و فریب، بدعہدی و وعدہ خلافی، جھوٹ اور ظلم و تعدی سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہ ہو جس کی بنیاد دلیری و ہمت و جرأت و شجاعت پر ہو اور جس کی عمارت صداقت و ہمدردی و رحم کی دیواروں پر قائم ہو۔ کمزوروں سے عفو و درگذر اور سرکشوں سے مقابلہ و انتقام جس کا اصول ہو۔

قوانینِ حکومت | حکومت کے قوانین کے تمام اصول کو اس دینی دستورنامے سے ثابت ہونا چاہیئے۔ انسانی عقل کے ذمے اسی قدر ہونا چاہیئے کہ وہ ان اصول کو فروع پر منطبق کرے اور اس کے لئے اگر ضرورت پڑے تو قیاس و اجتہاد سے بھی کام لے۔ اگلوں نے جو قیاس و اجتہاد کئے ہیں۔ ان نظائر کو بھی پیشِ نظر رکھے۔ مگر ماحولِ ماضی و حال کے فرق کو بھی برابر ملحوظ رکھے۔ ایسا نہ ہو کہ زمانۂ ضیق کے اجتہادات پر وسعت کے وقت اور عہدِ وسعت کے فتووں پر زمانۂ ضیق[1] میں عمل کر کے شریعت و قانونِ شریعت کے اصل منشاء ہی کو بدل کر نقصان پہنچایا جائے۔

قانون کا مقصد | قانون کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ جرائم نہ ہونے پائیں۔ ایک مجرم کی سزا سے مطلع ہونے کے بعد پھر کسی کو ایسے جرم کے ارتکاب کی ہمت نہ پڑے۔ آج کل تو قانون مجرمین کو یہ مشورہ دیتا ہے کہ جرم کرو تو اس طرح کرو کہ قانون کی گرفت میں نہ آجاؤ۔ اور اگر اتفاقاً گرفت میں آجاؤ تو اس طرح اس گرفت سے نجات حاصل کرو۔ اگر بدقسمتی سے نجات نہ حاصل کر سکو اور سزا بھگتنی ہی پڑے، تو اس مرتبہ کسی طرح بھگت لو، مگر دوبارہ جب ارتکاب کا موقع آئے تو اب یہی جرم یا دوسرا اس سے بھی سنگین جرم ذرا کافی ہوش و گوش اور چالاکی و ہوشیاری سے کرو۔ قانون کی گرفت سے بچنے کی قانونی ترکیبوں کو پہلے ہی سے اچھی طرح سوچ کر۔

الغرض آج کل "قانون" انسدادِ جرائم کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ سلیقۂ جرائم کی تعلیم دینے کے لئے ہے یہی وجہ ہے، کہ موجودہ قوانین سے کسی ملک میں بھی جرائم کا انسداد بالکل نہیں ہوتا۔ بلکہ جرائم کی تعداد روز بروز ہر ملک میں بڑھتی ہی رہتی ہے جیسے جیسے قوانین بنتے ہیں۔ اسی قدر جرائم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

اطاعت، اِتباع اور تقلید | "اطاعت" دراصل صرف اُس خالق کائنات ہی کی ہونی چاہیئے۔ یعنی بے چون و چرا

---

[1] ضیق و وسعت یعنی تنگی و فراخی۔ (مدیر)

سر اطاعت خم رہے۔ اس کی نیابت میں پھر اس کی اطاعت جس کے ذریعے پہلے پہل اس کا بخشا ہوا دستور نامہ ملا۔ اس کے بعد اس کی اطاعت جو اپنا خلیفہ یا بادشاہ یا امیر ہو یا بادشاہ کا مقرر کردہ والی یا حاکم ہو۔ ان کے احکام کے ماتحت عورت اپنے شوہر کی اور اولاد اپنے والدین کی خانگی امور میں اطاعت کریں گے۔ اور بس۔

"اتباع" احکام کا اور قائدینِ ملت و پیشوا اور رہنما کا ہوتا ہے مگر اصل اتباع اس دستور نامے کا ہونا چاہیئے اور اس کا جس کے ہاتھ سے پہلے پہل وہ دستور نامہ ملا۔ پھر ان لوگوں کا جو لوگ دستور نامے کے مطابق چل رہے ہیں۔

"اتباع" کے معنی "پیروی" ہیں۔ اس لئے پیروی کا مفہوم ذہن نشین رہے۔

"تقلید" کوئی دینی اصطلاح نہیں۔ ایک نیا لفظ ہے جو بعد والوں نے نکالا۔ قریب قریب "اطاعت" ہی کے اس کا مفہوم ہے۔ اس کی وجہ سے غور و فکر کی صحیح صلاحیت چھن جاتی ہے اور چھن گئی۔ پھر جماعت میں اختلافات اور فرقہ بندی بھی اسی سے پیدا ہوئی۔ یہ نئی اصطلاح زمانۂ سلف میں بالکل کسی کے ذہن میں نہ تھی۔ اس لئے اس کو بالکل مٹا ہی دینا چاہیئے۔ تاکہ فرقہ وارانہ غلو جماعت میں باقی نہ رہے۔ اور پوری جماعت ایک شیرازے میں منسلک ہو جائے۔

اسلامی حکومت معاہدۂ ربّانی ہے۔ اسلام کا تصوّرِ حکومت، طاقت اور امانت کا ایسا آمیزہ ہے جو افرادِ معاشرہ کے قلب اور قالب پر تسلّط رکھتا ہے۔

انسان اس معاہدہ کی رو سے خدا کی اطاعت کرتا ہے اور خدا اپنے وعدے کے مطابق بندوں کو حکومت دیتا ہے۔

"اسلام کا نظامِ حکومت" حامد الانصاری

(از مولانا قاری سید جعفر شاہ صاحب)

یسبح للہ ما فی السموات وما فی الارض الملک القدوس العزیز الحکیم۔ (جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب اُس اللہ کی تسبیح کرتے ہیں جو بادشاہ پاک غالب اور حکمت والا ہے۔

دنیا کا کوئی معقول انسان یہ پسند نہیں کرتا کہ اُس کی بیوی اولاد، دوست، رشتے دار یا کوئی شخص جس سے وہ مخلصانہ لگاؤ رکھتا ہو، اپنے اندر کسی عیب کی پرورش کرے بلکہ اس کی آخری تمنا یہ ہوتی ہے کہ ہر اجس سے کچھ بھی تعلق ہے وہ اپنی برائیوں کو زیادہ سے زیادہ دُور کرے۔ اور زیادہ سے زیادہ خوبیاں اپنے اندر پیدا کرے۔ یہ فطری خواہش کچھ آدمیوں ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر انسان کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ اس کے پاس جتنی چیزیں ہیں ان میں بھی خوبیاں ہی خوبیاں ہوں۔ کوئی خرابی حتی الامکان نہ ہو۔ بدمزہ کھانا چھوڑ دیا جاتا ہے کیونکہ اس میں بدمزگی کا عیب پیدا ہو گیا ہے۔ ڈھیلا یا مَیلا لباس نہیں پہنا جاتا۔ اس لئے کہ اس کے اندر ایک عیب موجود ہے۔ غرض جس چیز میں جس قدر عیب پیدا ہوتے جائیں گے، اسی قدر اس سے نفرت بڑھتی جائے گی۔ اور جتنی خوبیاں آتی جائیں گی، اتنی ہی اس کی طرف محبت کی کشش زیادہ ہوتی جائے گی۔ انسان کی یہ نہ بدلنے والی فطرت ہے کہ وہ اپنی کسی ادنےٰ سے ادنےٰ چیز میں زیادہ سے زیادہ اچھائیاں اور کم سے کم بُرائیاں دیکھنا چاہتا ہے پھر یہ کیس طرح ممکن ہے کہ کوئی چیز اپنے اندر کوئی عیب رکھتی ہو اور وہ انسان کی محبوب ترین متاع بن جائے؟ یہ کیونکر ممکن ہے کہ کسی ہستی میں کوئی نقص، خامی اور کمزوری نظر آتی ہو اور انسان اسے اپنا معبود، الٰہ اور خدا مان لے؟ اگر ہمیں کسی بڑے سے بڑے انسان کے متعلق بھی یہ علم ہو جائے کہ یہ غدار ہے تو ہم اس پر توکل اور بھروسہ نہیں کر سکتے۔ اگر یہ معلوم ہو کہ وہ بے فیض ہے تو اس سے امید نہیں لگاتے۔ اگر یہ پتہ چل جائے کہ اس کے پاس کوئی طاقت نہیں تو اس سے خوف نہیں کھاتے۔ اگر یہ گمان غالب ہو کہ اس میں کوئی خوبی نہیں اور اس سے کوئی مقصد پورا نہیں ہوتا تو اس سے محبت نہیں کرتے اور اس کی طلب نہیں رکھتے۔ اگر معبود میں بھی اس قسم کی کوئی خامی و کمزوری مانی جائے تو بندگی کا دائمی تعلق کیوں کر قائم رہ سکتا ہے؟ اس پر توکل یا اس سے امید یا اس کی محبت و طلب یا اس سے خوف ہمیشہ کبھی نہیں قائم رہ سکتا، اگر اس میں کوئی نقص یا

عیب تسلیم کر لیا جائے۔ لہذا معبود سے بندگی کا تعلق قائم رکھنے کے لئے سب سے پہلے اس حقیقت کا قرار اور اعتراف ضروری ہے کہ اس میں کوئی عیب کسی قسم کی خامی کسی طرح کا نقص اور کسی نوع کی کمزوری کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر اس کا وہم بھی ہو تو اس کی طرف لپک پیدا ہونے کی بجائے اس سے دوری پیدا ہوگا۔

قرآن کریم نے اسی لئے تسبیح کا سبق سب سے زیادہ دیا ہے۔ تسبیح کے معنی ہیں خدا کی پاکیزگی کا اقرار کرنا یعنی یہ اعتراف کرنا کہ وہ ہر عیب سے پاک ہے۔ اس میں کوئی نقص نہیں، ہر خامی سے مبرا ہے۔ اس میں کوئی کمزوری نہیں اور اس کی شہادت میں پوری کائنات کو پیش کر دیا کہ یسبح للہ مافی السموات ومافی الارض۔ زمین اور آسمان کی تمام چیزیں اللہ کی تسبیح کرتی ہیں یعنی ہر چیز اپنی زبان حال سے یہ اعتراف کر رہی ہے کہ ہم خود ناقص ہیں اور ہمارا صانع بے عیب اور بے نقص ہے اگر ساری کائنات بے عیب ہو تو اس میں اور خالق میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ غرض نہ دونوں بے عیب ہیں اور نہ دونوں ناقص۔ بلکہ خالق بے عیب ہے۔ باقی تمام مخلوقات میں کوئی نہ کوئی عیب یا کمزوری موجود ہے۔ اور ان کا یہ نقص ہی بتاتا ہے کہ خالق میں کوئی نقص نہیں جس طرح ہر مخلوق کا وجود یہ بتاتا ہے کہ ایک خالق موجود ہے اسی طرح ہر ناقص یہ پتہ دیتا ہے کہ ایک بے نقص ذات موجود ہے اور وہی معبود ہے۔ معبود کے لئے سب سے پہلی اور ضروری صفت یہی ہے کہ اس میں کسی طرف سے کسی طرح کا کوئی عیب نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جتنا اس تسبیح پر زور دیا ہے کسی اور چیز پر نہیں دیا۔ اگرچہ نماز کا بہت بڑا جز تکبیر ہے جس کی تشریح ہم کر چکے ہیں لیکن بصیغۂ امر اس کا حکم سارے قرآن میں صرف دو جگہ ہے۔ کبرہ تکبیرا اور وربک فکبر۔ دوسرا جز ہے حمد اس کا علیحدہ حکم بصیغۂ امر سارے قرآن میں کسی جگہ نہیں۔ تیسرا جز ہے تسبیح، اس کا بار بار حکم دیا گیا ہے اور حمد کو الگ رکھنے کی بجائے اسی کے ساتھ چپکا دیا گیا ہے۔ سبح اسم ربک الاعلی۔ فسبح باسم ربک العظیم۔ قل سبحان ربی۔ فسبح بحمد ربک واستغفرہ۔ فسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس۔ ان سبحوہ بکرۃ واصیلا۔ ومن اللیل فاسجد لہ وسبحہ لیلا طویلا۔ غرض بہت جگہ صیغۂ امر کے ساتھ بار بار تسبیح کا حکم دیا گیا۔ نماز کو دیکھئے۔ تکبیر تحریمہ کے بعد بھی سب سے پہلے کہتے ہیں سبحانک اللھم۔ پھر رکوع میں سبحان ربی العظیم کی تکرار۔ پھر سجدوں میں سبحان ربی الاعلی بار بار۔ پھر یہ بھی دیکھنے کی چیز ہے کہ تسبیح فاطمہ میں ۳۳ بار سبحان اللہ ۳۳ بار الحمد للہ اور ۳۴ بار اللہ اکبر کہتے ہیں۔ یعنی اس میں تسبیح بھی ہے تحمید بھی ہے اور تکبیر بھی ہے۔ مگر اس کا نام تحمید فاطمہ نہیں بلکہ تسبیح فاطمہ ہے۔ یہی صورت صلوۃ التسبیح کی ہے جس میں سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر کی تکرار ہوتی ہے لیکن اس کا نام بھی صلوۃ الحمد یا صلوۃ التکبیر نہیں رکھا گیا۔ بلکہ صلوۃ التسبیح نام رکھا گیا اس سے اندازہ

سکتا ہے کہ تسبیح کا مقام کتنا بلند ہے اور یہ بندگی کی زندگی کے لئے کیسی ضروری چیز ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ تسبیح کرنے سے کیا مقصد ہے؟ کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ صرف زبان سے سبحان اللہ سبحان اللہ کی تکرار کرلی جایا کرے؟ نہیں بلکہ اس تکرار سے اس عظیم الشان مقصد کو بار بار یاد دلانا ہے جو انسان کے عقیدہ و عمل میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ اور پوری زندگی کا دھارا بدل جاتا ہے۔ اس کی تفصیلات سننے سے پہلے ایک بات ذہن نشین کر لیجئے کہ انسانی تصور کی قوتِ پرواز بجائے خود ناقص ہوتی ہے۔ وہ جتنی بھی لطافت کے ساتھ تنزیہ خدا کرے اور اس تصور میں جتنی بھی بلند پروازی کرے، اس کے تصور میں پھر بھی خامی رہ جائے گی۔ یعنی دوسرے لفظوں میں ہماری انتہائی بلند پرواز تصور سے بھی خدا کی ذات بلند ہے۔ تعالیٰ عما یصفون۔ ہمارا کوئی تصور زمان و مکان کی قید سے باہر نہیں ہو سکتا اور ذاتِ الٰہی زمان و مکان سے بھی بالاتر ہے۔ وہ ہر قید سے آزاد، ہر تصور سے بلند اور تمام خیالی حدود سے بھی بالاتر ہے۔ اگر وہ ہمارے تصور کے دائرے میں پوری طرح آجائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ہمارے خیال کے دائرے میں محدود ہو گیا، حالاں کہ وہ اس سے بھی پاک اور لا محدود ہے۔ سبحان اللہ اسی حقیقت کا اعتراف ہے کہ ہمارا انتہائی بلند تصور بھی ناقص ہے اور اللہ اس نقص سے پاک ہے جو ہمارے انسانی تصور میں باقی رہ جاتا ہے ؎

اے برتر از خیال و گمان و قیاس و وہم　　　وز ہر چہ گفتہ ایم و شنیدیم و خواندہ ایم

ذہن کی اس صفائی کے بعد صرف عقیدہ ہی نہیں بلکہ پوری عملی زندگی بھی ستھری ہو جاتی ہے۔ اگر سبحان اللہ کہنے سے ہماری زندگی پر اثر نہیں پڑتا تو سمجھ لینا چاہئیے کہ ایک بے جان وظیفے سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ اب آئیے ذرا دیکھیں کہ تسبیح سے ہماری زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے اور کیا پڑنا چاہئیے۔ دوسرے لفظوں میں یہ دیکھنا چاہئیے کہ تسبیح کے تقاضے کیا ہیں؟ پہلی چیز تو یہ ہے کہ تسبیح کرنے یعنی خدا کو تمام عیوب سے پاک تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اُس میں کوئی بات بھی ایسی نہیں جس پر کوئی اعتراض یا تنقید ہو سکے کیونکہ اعتراض یا تنقید تو کسی عیب یا کمزوری یا نقص یا خامی پر ہوتا ہے۔ اور خدا میں کوئی نقص یا عیب ہی نہیں پس جب وہ تنقید سے بالاتر ٹھہرا تو اس سے کسی قسم کی کوئی شکایت نہیں پیدا ہو سکتی۔ اُس کا کلام یا کام یا احکام کسی پر کوئی اعتراض ہو سکتا ہے نہ شکایت۔ اگر ساری زندگی میں کوئی تمنّا یا دعا پوری نہ ہو، جب بھی اس سے کوئی شکایت یا اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اس مقام کا نام ہے رضا بقضا یعنی مشیت پر اعتماد، اور یہ تسبیح سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ پھر تسبیح کے دو متضاد اثر اور بھی ہیں۔ انسان میں اگر کوئی نقص نہ ہوتا تو وہ خود خدائی کا دعویدار ہو جاتا۔ لیکن انسان کے بے جا کے غرور کو بھی تسبیح ختم کر دیتی ہے۔ اور جب انسان دیکھتا ہے کہ بے عیب ذات خدا ہی کی ہے اور ہم سراپا عیب و تقصیر ہیں تو اپنی نا دقعیت کا یہی تصور انسان میں بندگی اور عبدیت پیدا کر دیتا ہے اور اس کے سر کو ایک بے عیب معبود کے آگے

جھکا دیتا ہے۔ اب دوسری طرف دیکھئے۔ اگر انسان اپنے آپ کو عیب مجسّم اور مظہر نقائص سمجھ لے تو کسی کام میں اس کا دل نہیں لگے گا۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ انسان کا کوئی کام نقص سے خالی نہیں ہو سکتا۔ لیکن تسبیح کرنے والا کبھی اس طرح شکستہ دل نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ بے عیب کام تو صرف اللہ ہی کے ہو سکتے ہیں۔ ہمارے کام میں تو بہرکیف کوئی نہ کوئی نقص ضرور ہوگا۔ لہٰذا محض اتنی سی بات سے کام کو چھوڑنا نہیں چاہیئے۔ غرض تسبیح سے اپنا ناقص ہونا تو ضرور واضح ہو جاتا ہے۔ لیکن اس سے پست ہمتی نہیں پیدا ہوتی بلکہ یہ ایمان پیدا ہوتا ہے کہ ہم جس قدر اپنے نقص و عیب کو دور کرتے جائیں گے۔ اُسی قدر خدا سے قریب ہوتے جائیں گے۔ تکبیر کی طرح تسبیح بھی انسان کو نہ خدا سے اونچا جانے دیتی ہے نہ حد سے نیچا ہونے دیتی ہے۔ پھر تسبیح کرنے والا کتنا بلند حوصلہ ہو جاتا ہے۔ جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ تنہا میں ہی تسبیح نہیں کر رہا ہوں بلکہ یسبح للہ مافی السمٰوات و مافی الارض۔ زمین و آسمان کی تمام چیزیں کائنات کا ایک ایک ذرّہ تسبیح الٰہی میں اس کا ساتھ دے رہا ہے۔

مختصر لفظوں میں درس کا خلاصہ یہ ہُوا کہ تسبیح کے معنی ہیں اللہ کے بے عیب ہونے کا اقرار کرنا اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ خدا کے کام کلام اور احکام سے کوئی شکایت یا اس پر کوئی تنقید و اعتراض نہ ہو اور اپنے آپ کو انسانی تنقید سے بالا تر نہ سمجھے۔ اور یہ یقین رکھے کہ اپنے عیبوں کو جتنا زیادہ دُور کیا جائے گا۔ اسی قدر سبوح و قدوس خدا کا قرب حاصل ہوگا۔

(باجازت ڈائرکٹر لاہور ریڈیو اسٹیشن)

تسبیح چہ شود مرد بے عرفاں را،
جز آں کہ شناسد مگر آں سلطاں را
ہر چیز کہ گوید آدمی تسبیح است
گر بشناسد بواجبی سبحاں را،

صحابی

قرآنی نظام؟

(محترم یعقوب توفیق)

حصُولِ پاکستان کی عظیم الشان تحریک نے جگہ جگہ حرکت وعمل کی بے نظیر مثال قائم کر دی تھی۔ قوم کی یکجہتی، قائدِ اعظم کے فرمان اور عوام کے بے پناہ جوشِ عمل نے ایک مردِ قلندر کے خواب کی تعبیر یوں پیش کی کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو اہالیانِ دہر کے نام دھڑکتا ہُوا خورشیدِ نمود پاکستان کا پیغام لایا۔ دنیا کی بساطِ سیاست پر ایک مُہرہ اور بڑھا ——— پاکستان زندہ باد!

جن احباب کو اس تحریک سے واسطہ رہا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے پہلے اِک جنون تھا کہ بروئے کار تھا۔ اور حق تو یہ ہے کہ کسی مقصد کے حصول کا احسن طریقہ بھی یہی ہے کہ عشق ومستی کی حدوں سے اُس پار جوشِ کردار کی جنوں انگیز وادیوں میں پہنچ جائیے تو کامیابی وکامرانی آپ کے استقبال کو راہ تک رہی ہوں گی۔ ایک ولولہ تھا حیرت افزا، اک جوش تھا نصرت آموز۔ معصوم بچوں کی ننھی ننھی ٹولیاں نعرۂ پاکستان لگاتی گذرتیں تو خُون کو کھولا دیتی تھیں۔ بُرقع پوش عورتوں کے جلوس فرطِ مسرت سے آنکھوں میں نمی ٹپکا دیتے تھے۔ اس زبردست ہنگامہ کا مقصد کیا تھا؟

وُہ نعرے جو لگائے جاتے تھے، پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد اس کی ہیئتِ اجتماعیہ کی دھڑکنیں تھیں۔ قائدِ اعظمؒ کی تقاریر اور محترم لیاقت علی خاں کے بیانات بار بار اس نظریّہ کی تائید کرتے رہے کہ مسلمان کا مذہب اس کی سیاست سے علیحدہ نہیں۔ پاکستان کا قیام اس لئے ضروری تھا کہ ایک خطۂ ارض ایسا میسّر آئے، جہاں مسلمان اپنے مذہب، اپنی معاشرت اور دیگر نظریاتِ زندگی کو آزادانہ بروئے کار لاکر اسلامی حکومت کا قیام عمل میں لاسکے۔ اللہ کی اس سرزمین پر اللہ کی حکومت قائم کرنا تھا۔ وہ حکومت جس کا نظام قرآنی ہو اور معاشرہ اسلامی۔

پاکستان بن چکا اور ایک علیحدہ خطۂ ارض خدائے قدوس نے مسلمانوں کو تفویض کر دیا، تاکہ وہ اپنے نعروں کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ وہ مواعید جن کی بنا پر حصولِ پاکستان کی جنگ سر ہوئی تھی، مخصوص حالات کی بنا پر معرضِ التوا میں پڑے رہے۔ عوام نے ہجرت کے مصائب اور اقتصادی بدحالی سے نکل کر جب امن وسلامتی کا سانس لیا تو ذہن میں گزشتہ نعروں نے

ہیجان برپا کردیا۔ نجی محفلوں کو پھاند کر جب عوام کے جذبے نے اخبارات کے الفاظ کا لباس پہنا، تو خاموش دھڑکنیں مل کر ہجوم بن گئیں خیالات کے اظہار کا۔ ہر طرف سے اسلامی قانون کے نفاذ کا غلغلہ بلند ہوا اور مسلسل پروپاگنڈا کا وہ سیلاب اٹھا کہ ایوانِ حکومت کی دیواریں لرز گئیں۔ حکومت کے اربابِ بست وکشاد اپنی سیاسی الجھنوں کو سلجھانے میں گو اتنے محو تھے، مگر وہ بھی اس سیلاب کے دُور رس نتائج سے بے پروا نہ رہ سکے۔ چودھری خلیق الزّمان نے اسلامی قانون کے التوا کے لئے فضل الہٰی منطقی دلیل پر عوام کو ٹرخانا چاہا۔ مگر وزیر اعظم کو قرار دادِ مقاصد پیش کرتے ہی بنی۔ جذبات کا سیلاب تھا عوام کی بے چینی سکون پذیر ہوئی اور اخبارات میں اس قرار داد پر چند دنوں کی بحث و تمحیص کے بعد اسلامی قانون کے نفاذ کا ذکر پھر بھولی بسری بات ہو گئی۔

قرآنی نظام اور اسلامی معاشرہ کا نفاذ آنکھ جھپکنے سے تو ہوگا نہیں۔ الہ دین کے چراغ کے معجزات الف لیلہ کی داستان کے لئے سامانِ تفریح سہی زندگی کے حقائق سے اُن کا دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس نظام و معاشرہ کی تشکیل کے لئے قوم کو پھر عشق و مستی کی حدوں سے پرے جنوں خیز عمل سے انقلاب برپا کرنا ہوگا اور یہ انقلاب ذہنی ہوگا اور روحانی۔ ایک مملکت پر قبضہ کے معنی ہیں پہلے زمین پر قبضہ اور پھر سالہا سال کی محنت و کاوش کے بعد ذہن اور تخیل پر قبضہ۔ کسی حکومت کے ختم ہونے کے بھی دو دَور ہیں۔ پہلے ذہنوں سے حکومت کا وقار اور دبدبہ اُٹھتا ہے پھر زمین سے۔ ہمیں قرآنی نظام کی تشکیل کے لئے سب سے پہلے ذہنوں میں تبدیلی پیدا کرنا ہوگی اور وہ تبدیلی ہوگی قرآن حکیم کی راہبری قبول کر کے۔

قد جاءکم من اللہ نور وکتاب مبین یہدی بہ اللہ من اتبع رضوانہ سبل السلام و یخرجہم من الظلمٰت الی النور باذنہ و یہدیہم الٰی صراط مستقیم ۵ (المائدہ)	تمہارے پاس خدا کی طرف سے روشنی اور کتاب مبین آچکی۔ جو رضائے الٰہی اور امن کی راہ پر چلنا چاہتا ہے۔ یہ کتاب اس کی رہنمائی کرتی ہے اور ان کو ظلم و تاریکی سے نکال کر حکم ربی سے نُور کی طرف لے جاتی ہے اور ان کو صراطِ مستقیم پر چلاتی ہے۔

حکومت کی مشکلات عوام کے جذبات و خواہشات سے کہیں زیادہ ہیں۔ پاکستان کا حصول سیاسی دانشمندی کا معجزہ ہے۔ مذہبی اختلافات کی چنگاری فوراً ایک مہیب آگ میں متبدل ہو جائے گی جب حکومت اسلامی قوانین کے نفاذ کا عملی نمونہ پیش کرے گی۔ قیامت ہے کہ ایک خدا ایک رسول، ایک کتاب اور ایک مذہب کے ماننے والے مختلف گروہوں میں یُوں بٹے ہوئے ہیں کہ حیرت در حیرت۔ ایک مسئلہ اٹھائیے، سینکڑوں برسوں کے منجمد خیالات گرما گرم بحثوں کا موضوع بنتے بنتے خُون کی حدت کو تیز کر دیں گے۔ اور بحث معرکۂ کارزار میں متبدل ہو جائے گی۔ انگریز غیر جانبداری

کا دعویدار تھا۔ اور مختلف گروہ اس کے حکم و فیصلہ کے آگے سرخم کرتے تھے۔ اب ان مواقع پر حکومت کس گروہ کو سچا کہے اور کس کو جھوٹا؟ حکومت کا ذکر بھی چھوڑیئے، علماء کسی ایک مسئلہ پر شائد ہی کبھی متفق ہوئے ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ ماضی پرستی نے ہمارے ذہنوں کو زنگ آلود کر دیا ہے۔ ہر مولوی اور ہر عالم ایک مخصوص دارالعلوم کا نظریہ لئے ہوئے ہے۔ وہ اس نظریے کو کسی قیمت پر ترک کرنے کو تیار نہیں۔ عہدِ قربان پہ خانہ کعبہ کے علاوہ ہر قریہ اور بستی میں قربانی کا جواز یا عدم جواز بحث کا موضوع بنے رہے۔ مختلف قسم کے خیالات کا اظہار ہوا اور بعض علماء نے تو دشنام و طعن کے تمام تیر اپنے ترکش خیال سے بھی چلانے سے گریز نہیں کیا۔ سوال یہ ہے :۔ ان اختلافات کی وجہ کیا ہے؟ ان اختلافات کی موجودگی میں اسلامی قانون کا نفاذ کیا ممکن ہے؟

ان اختلافات کا ذخیرہ قرآن حکیم کے سوا وہ تمام کتب ہیں جن کو بدقسمتی سے دین اسلام کا جزو تصور کر لیا گیا ہے۔ حالاں کہ ان کا وجود نہ حضور اکرم صلعم نہ خلفائے راشدین کے زمانہ میں ثابت ہے۔ عباسی عہدِ حکومت میں روایات کا سلسلہ اتنا بڑھا کہ قرآن حکیم کی وہ تابناکیاں جن سے مشرق و مغرب کی وادیاں بقعۂ نور بنی ہوئی تھیں، گہنا گئیں اور ماضی پرستی نے اجتہاد کی ترقی پذیر طاقتوں کو مفلوج کر دیا۔ ذہن ناکارہ ہو گئے اور دین کی مسخ شدہ صورت کو آنے والی نسلوں نے اسلام کا حقیقی چہرہ سمجھ لیا۔ اب اگر اسلام کے چہرے کے صحیح خدوخال اور اس کے پُر نور نقش و نگار کو منظرِ عام پر لانے کے لئے کوئی ہاتھ بڑھے تو تقلید پرست علماء کا طبقہ اُس ہاتھ کو روکنے کے لئے دیوارِ چین بن جاتا ہے اور اسلام کا منور چہرہ صدیوں کی تہ در تہ گرد تلے ہنوز دبا ہوا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت علوم حاضرہ اور دینی علوم سے بہرہ ور علماء کی جماعت کی تشکیل کرے اور خدا کی حکومت کے قیام کے لئے مصروفِ عمل ہو جائے۔ مگر اس جماعتِ علماء کا اصول کیا ہو؟

علماء کو اگر فروعات میں اُلجھنے کا موقع دیا گیا تو مقامِ مجلس پانی پت کا میدان بن جائے گا۔ شیعہ احباب سُنّی دوستوں کی بات نہیں مانیں گے۔ اُن کی روایات، اُن کے نظریات الگ۔ مقلد اور غیر مقلد اپنی "سچائی" کو ثابت کرنے کے لئے روایات کا خاص مجموعہ پیش کریں گے۔ غرض جتنے مُنہ اُتنی باتیں۔ البتہ ایک بات کے ماننے میں کسی کو تامل نہیں ہو گا۔ قرآن حکیم پر سب کا ایمان مسلّم ہے۔ اسلامی قانون کے نفاذ کے لئے اصلی مواخذہ صرف قرآن مجید سے کیا جائے۔ اور اس کی آیات سے اِدھر اُدھر ہٹنے یا فروعات کو بحث میں لانے کی قطعاً اجازت نہ دی جائے کہ قرآن حکیم اتحاد و ایقان کا ضامن ہے۔ اور فروعات جنگ و جدل کی پیامبر۔ رہے وہ دُنیاوی مسائل جن کی تفصیل فرقانِ حمید میں موجود نہیں تو حکومت وقت کو اختیار دیا جائے کہ وہ اسمبلی میں مشورہ و بحث و تمحیص کے بعد عوام کی بھلائی کے لئے قوانین کا نفاذ کرے یا رد و بدل —

(باقی صفحہ ۴۹ کے نیچے)

پاکستان کے بارہ دشمن

(پروفیسر فیروز الدین صاحب رازی ایم اے)

دیکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف　　　آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

انسان فطری طور پر اپنی جان ومال کے حفظ وبقا کے لئے تدابیر سوچتا رہتا ہے۔ یہ ایک فطری جذبہ ہے جو ہر جاندار کی جبلت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ مملکتِ پاکستان تو ہمیں جان ومال سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ یہ وُہ گراں بہا متاع ہے جس کے حصول کے لئے ہمیں خون کے دریا میں ڈوبنا پڑا، آگ کے شعلوں سے کھیلے۔ لاکھوں عورتوں کا سہاگ لٹایا، ہماری عفت مآب بہنوں کی عصمتیں شہید ہوئیں، لاکھوں مسلمانوں نے جامِ شہادت نوش کئے۔ جان ومال اور خان ومان اسی کی خاطر نچھاور کر دیئے گئے۔ مختصر یہ کہ اسی پاک مملکت کے لئے ایسی ایسی بے نظیر قربانیاں دی گئی ہیں، جن کی مثال دنیا

(صفحہ ۴۶ کا بقیہ) دنیاوی مسائل اس لئے کہ دین مکمل ہو چکا قرآن حکیم میں؟ یہی ایک صورت ہے پاکستان کے اسلامی حکومت بننے کی۔ قرآنی نظام کا اطلاق صرف قرآن حکیم کے احکام سے وقوع پذیر ہو اور ہر فرقے کو اپنی مخصوص روایات و فروعات پر عمل پیرا ہونے کی اجازت دی جائے۔

مسلمانوں کے دنیاوی اور دینی فلاح وبہبود کا حاوی صرف قرآن مجید ہے۔ زندہ خدا کا زندہ پیغام، وہ زندہ رسول جو حضور اکرم صلعم کے وصال کے بعد بھی اپنی صحیح شکل میں ہمارے پاس موجود ہے یہی تو ہے جس سے اقوام دملل کے اعمال جانچے جاتے ہیں اسی میزان پر مشرق ومغرب کے اعمال تُلتے ہیں۔ اسی پیمانہ سے اعمال پیمائش ہو کر اہالیٔ دہر کو حکومت، جاہ وثروت کے انعام تقسیم ہوتے ہیں۔ یہی فطرت کا قانون ہے یہی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا معجزہ ہے، یہی خدائے قہار کا پیمانۂ ازلی و ابدی ہے آؤ کہ اس قانون کو اپنانے کے لئے ہم اپنے ذہنوں میں قرآنی نظام کا تصور برپا کر کے مصروف عمل ہو جائیں اور پاکستان کی یہ سرزمین "پاکستان کا مطلب کیا ہے؟ لاالٰہ الّا اللہ" کی عملی تفسیر سے امن وسلامتی اور ترقی وسروری کی ایسی آماجگاہ بن جائے کہ مشرق ومغرب خدائی قانون کے آگے یوں سجدہ ریز ہوں جیسے حیوانی طاقت انسانی ذہن کے آگے۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن　　　نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

کی تاریخ کے صفحات پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

اب ہمارا مقدس فرض ہے کہ اس پاک سرزمین کے استحکام کے لئے ہر ممکن کوشش کریں۔ سابقہ بے اعتدالیوں نے مجھے مملکت کی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے گندے عناصر اور زہریلے جراثیم کو ہلاک کر ڈالیں۔ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے والے دشمنوں کی آنکھیں پھوڑ دیں اور بدخواہوں کو کچل ڈالیں۔

یاد رکھئے! دشمن دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اندرونی اور بیرونی۔ بیرونی دشمن کی دشمنی آشکارا ہوتی ہے۔ اس کا مداوا چنداں مشکل نہیں۔ ایسے دشمن سے نپٹا جا سکتا ہے لیکن اندرونی دشمن زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ نپٹنے کے لئے زیادہ عقل و فراست کی ضرورت ہوتی ہے۔ مملکت پاکستان دونوں قسموں کے دشمنوں سے دوچار ہے۔ عوام کے تعاون کے بغیر ان دشمنوں کا کچلنا مشکل ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اس سلسلہ میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں۔ ورنہ یہ دشمن پاکستان کی جڑیں کھوکھلی کر دیں گے۔ آئیے دیکھیں کہ یہ اندرونی دشمن کون ہیں۔

۱۔ بلیک مارکٹ کرنے والے

یہ یہودی منش تاجر ہیں، جن کو زر اندوزی کی حرص نے اندھا کر رکھا ہے۔ ذخیرہ اندوزی کے ذریعے عوام میں اضطراب اور پریشانی پیدا کر دیتے ہیں۔ منڈیوں کا توازن بگاڑ دیتے ہیں۔ اپنی جنس کو کئی گنا زیادہ قیمت پر فروخت کرتے ہیں۔ پاکستان کے عوام ان یہودیوں کے ہاتھوں نالاں ہیں۔ حکومت کے خلاف عوام میں بددلی، بے اطمینانی اور نفرت پیدا کرنے کا باعث اس طبقے کا وجود ہے۔ یہ لوگ انسانیت کے دشمن، حکومت کے بدخواہ اور عوام کے قاتل ہیں۔ حکومت اگر ان کو معاف کر دے یا چشم پوشی سے کام لے تو عوام کے سامنے وہ خود مجرم ہوگی۔

۲۔ کمیونسٹ و سوشلسٹ

کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز کے یہ چیلے چانٹے ہندوستان اور روس کے تنخواہ دار پاکستان کو ضرر پہنچانے میں رات دن مصروف ہیں۔ ان کا زہریلا پروپیگنڈا لوگوں میں بددلی پیدا کر کے کمیونزم اور سوشلزم پیش کرنا ہے۔ منافقت اور ریاکاری میں ماہر ہیں۔ ابن الوقت ہیں۔ موقع و محل دیکھ کر بات کرتے ہیں اور اسلام کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ ان لوگوں کے زہر سے بچنا بھی ضروری ہے۔ یہ لوگ مذہب اور اخلاق کے بدترین دشمن ہیں۔ پاکستان کی بنیاد مذہب پر رکھی گئی ہے۔ اگر ہم نے ان زہریلے اثرات کو قبول کر لیا تو پاکستان کا وجود سخت خطرہ میں پڑ جائے گا۔ ہمارے پاس الہامی نظام (قرآن پاک) موجود ہے۔ پھر انسانوں کے بنائے ہوئے کمیونزم اور سوشلزم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

۳۔ سرمایہ پرست

دنیا میں یہودیوں کے زوال کا باعث یہی زر پرستی ہوئی تھی۔ بدقسمتی سے مسلمانوں میں بھی ایک طبقہ ہی قسم کا پیدا ہو چکا ہے۔ یہ لوگ اپنی دولت کو دیکھ دیکھ کر جیتے ہیں۔ پاکستان کی فلاح و بہبود یا صنعت و تجارت میں روپیہ لگانا پسند نہیں کرتے۔ پاکستان کی مشکلات کا انہیں قطعاً کوئی احساس نہیں۔ حلال و حرام میں تمیز نہیں کرتے۔ پاکستانی مال کی لُوٹ کھسوٹ سے ان لوگوں نے اپنے خزانے بھر لیے لیکن مسلمان یا مملکتِ پاکستان کو ان کی ذات سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ ایسے لوگوں کا وجود بھی پاکستان کے لئے لعنت ہے۔

۴۔ رشوت خور اور بد دیانت افسر

پاکستان کے عالمِ وجود میں آتے ہی رشوت ستانی کا بازار گرم ہوا۔ افسروں نے دھاندلی مچا دی حقیقت یہ ہے کہ حرام کھاتے کھاتے ان لوگوں کی ضمیر سیاہ ہو چکی ہے اور یہ عادت ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے۔ پیادہ، چپڑاسی، پٹواری، کلرک، منشی، محرر، اوورسیر، انجینیر، تحصیلدار، تھانیدار سے لے کر بڑے بڑے افسروں تک کے دامن آلودہ ہیں۔ جو لوگ بچ گئے یا ایماندار رہے، اُن کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے لطف یہ ہے کہ ان لوگوں نے رشوت کو بالائی آمدنی کا نام دے رکھا ہے۔ وہ وقت قریب آ رہا ہے جب یہ روسیاہ لوگ کیفرِ کردار کو پہنچیں گے۔ بہر حال یہ لوگ ہمارے بدترین دشمن ہیں۔ انشاءاللہ مسلمان ان کے منحوس چہروں کو دیکھنا بھی گوارا نہ کریں گے۔ پاکستان کے نظم و ضبط اور عوام کو ان لوگوں نے بہت نقصان پہنچایا ہے۔

۵۔ کام چور افسر و ملازمین

جو صاحبان اپنے فرائض و وظائف دیانت داری سے کماحقہٗ انجام نہیں دیتے وہ بھی پاکستان کے بدترین دشمن ہیں۔ کام سے جی چرانا، گپ زنی میں وقت ضائع کرنا، تساہل پسندی ایسے گناہ ہیں، جن کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔ یہ لوگ مفت کی تنخواہیں لے کر پاکستان کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا رہے ہیں۔ کاش! وہ اب بھی سمجھ جائیں، ورنہ اُن کی ہلاکت قریب ہے۔

۶۔ خود غرض رہنما

خود غرض اور بد دیانت راہنماؤں کے ہاتھوں عوام سخت نالاں ہیں۔ ان باہمی رقابتوں اور ریشہ دوانیوں نے عوام کو بددل بنا دیا۔ یہ لوگوں کا اعتماد کھو چکے ہیں۔ پاکستان جیسی نوزائیدہ مملکت کو مخلص اور دیانت دار رہنماؤں کی ضرورت تھی مسلمانوں کو چاہیئے کہ نئے انتخابات میں چوروں، ٹھگوں اور راہزنوں کی حوصلہ افزائی نہ کریں۔ ورنہ آنے والی نسلیں

ان کی عقل و دانش کا ماتم کریں گی اور اس کا نتیجہ ظاہر ہے ۔

سلامتی کو وہاں قافلوں کی رو بیٹھیں　　جہاں ہے راہزن خلق رہنما ایک ایک

۷۔ ففتھ کالم

پاکستان کے مختلف گوشوں میں دشمن کے جاسوس موجود ہیں۔ یہ ہماری کمزوریوں کو دشمن تک مختلف ذرائع سے پہنچاتے ہیں۔ ہماری ہر نقل و حرکت پر کڑی نگرانی رکھتے ہیں۔ خفیہ طور پر لوگوں میں بددلی پیدا کر کے پاکستان کو نقصان پہنچانے میں مصروف ہیں۔ حکومت کو اس طرف جلد متوجہ ہونا چاہیئے۔ اور عوام کو احتیاط کی ضرورت ہے ۔

۸۔ غاصب

وہ انصار یا مہاجر جنھوں نے غیر مسلموں کی جائدادوں، دکانوں، مکانوں، زمینوں، کارخانوں، فیکٹریوں اور مال و متاع پر ناجائز یا بلا استحقاق قبضہ جمایا وہ بھی پاکستان کے دشمن ہیں۔ ان کی وجہ سے آبادکاری میں کئی رکاوٹیں پیش آ رہی ہیں۔ حکومت کی مشکلات میں اضافہ کر کے انھوں نے پاکستان کی دشمنی کا ثبوت دیا ہے۔

۹۔ کاہل اور جاہل لوگ

جھوٹی افواہیں اور من گھڑت باتیں پھیلانا ان آوارہ مزاج لوگوں کا روزمرہ کا کام ہے۔ پاکستان جیسی نوزائیدہ مملکت کے بقا و استحکام کے لئے عوام کو چاہیئے کہ کاہلی اور تن آسانی کی بجائے جفاکشی، جانفشانی، عرق ریزی اور محنت و مشقت سے کام کریں۔ عہد غلامی کی جاہلانہ حرکات اور لہو و لعب سے باز رہیں۔ ورنہ ان کا وجود پاکستان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہو گا۔

۱۰۔ غلط فہم کے نکتہ چین

تعمیری نکتہ چینی تو ہر مسلمان کا حق ہے لیکن فاسد ارادوں کے ساتھ تخریبی نکتہ چینی مملکت کے حق میں سم قاتل ہے۔ بعض لوگوں نے پاکستان پر نکتہ چینی اپنا شیوہ بنا لیا ہے کسی کی مرغی گم ہو جائے تو پاکستان کا قصور، کسی کا ٹوٹ اڑ گیا تو پاکستان برا کسی کے گھر میں چوہوں کی کثرت ہو گئی تو پاکستان کا گناہ علیٰ ہذا القیاس۔ بات بات پر پاکستان کو کوسنا محض جہالت اور کم علمی کا نتیجہ ہے۔ بعض لوگ نادانستہ طور پر بھی اس گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں ۔

۱۱۔ میر جعفر و صادق جیسے غدار

بدقسمتی سے ہماری قوم میں جعفر و صادق جیسے غداران ملت کی بھی کمی نہیں۔ یہ لوگ مختلف رنگ و لباس میں لوگوں کے سامنے آتے ہیں۔ ہمارے درمیان ان کا وجود ہماری انتہائی بدبختی ہے۔ ان لوگوں کا مقصد وحید ذاتی

اغراض اور نام ونمود کی آرزو ہے۔ ان میں کچھ لوگ ایسے ہیں جن کا آبائی پیشہ بھی غداری تھا۔ اور بعض ایسے ہیں، جو ابھی نوآموز ہیں۔ اور ہمارے دشمنوں سے اپنی اغراض مشئومہ کو پورا کرلینے کی اُمیدیں وابستہ کئے بیٹھے ہیں۔ یہ لوگ پاکستان کے سب سے بڑے دشمن اور مسلمانوں کے بدخواہ ہیں۔ ان رُو سیاہ لوگوں سے بھی نجات حاصل کرنا ازبس ضروری ہے۔

۱۲۔ ریاکار، رخنہ انداز، تفرقہ باز

یہ اُن منافقوں کا گروہ ہے، جو بظاہر بڑے بلند بانگ دعاوی سے اپنے آپ کو اسلام دوست ظاہر کرتے ہیں۔ خدا، رسولؐ اور قرآن سے اپنے عشق کا ڈھنڈورہ پیٹتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ بڑے منافق وریاکار ہیں۔ ان کا نصب العین محض اپنی لیڈری کو چمکانا اور اغراض نفسانی کا پورا کرنا ہے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی فتنہ کھڑا کر دیتے ہیں اور پھر اسے اصلاح وتعمیر کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جو کام ان کے زیرسایہ یا اشارۂ ابرُو سے کیا جائے، اس کے تو یہ ممد ومعاون، ورنہ رخنہ اندازی کے لئے کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کی پیشانیوں پر تو جلی حروف میں اسلام، ورخادمِ قوم لکھا ہوتا ہے لیکن اُن کے دلوں کو چیر کر دیکھیں تو سیاہ باطنی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ نُورِ ایمان کی ایک کرن تک بھی باقی نظر نہ آئے گی۔ تفرقہ بازی میں بھی یہی لوگ پیش پیش نظر آتے ہیں۔ سادہ لوح مسلمانوں کو ان دشمنوں سے باخبر رہنا چاہیئے۔ بار بار ان کے دامِ فریب میں آنا خودکشی کرنے کے مترادف ہے۔

استفسارات

قرآن و انسان

ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں:-

"اَلرَّحْمٰنُ، عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ـــــ اس آیۂ مقدسہ میں عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ پہلے لایا گیا ہے اور انسان کی خلقت بعد میں دکھائی گئی ہے۔ اس تقدم و تاخر میں کیا حکمت مضمر ہے؟ امید ہے کہ آپ اس پر روشنی ڈال کر ممنون فرمائیں گے۔"

جواب۔ آپ کا سوال پڑھتے ہی میرے ذہن میں اس کا اجمالی جواب تو آ گیا، لیکن میں نے مناسب سمجھا کہ بزرگوں کی تحقیقات بھی دیکھ لینی چاہیئے۔ میرے پاس جو چند تراجم و حواشی موجود ہیں، ان میں ٹٹولا تو معلوم ہوا، بڑی مفید باتیں لکھنے کے باوجود اس سوال کی طرف ان کا ذہن منتقل ہی نہیں ہوا۔ پھر وہ اس پر غور ہی کیوں کرتے۔ البتہ خواجہ احمد الدین رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر "بیانُ النّاس" کو دیکھا تو وجد کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ ان کے سامنے یہ سوال اپنی پوری استفہامیت کے ساتھ موجود تھا اور پھر اللہ تعالےٰ نے اس کے جواب کے لئے ان کی جو رہنمائی فرمائی ہے، وہ اتنی شاندار تفسیری دولت ہے کہ قدماء مفسرین کے سامنے پیش کی جاتی تو پھڑک اٹھتے ـــــ اب جو کچھ میں نے سمجھا تھا، اس کو چھوڑیئے اور خواجہ صاحب کی بات سنئے۔ فرماتے ہیں:-

رحمٰن کے معنی ہیں، ابتدائً رحمت کے بنیادی سامانوں کا خالق۔ اور کسی مقدم حق (دعا، طلب، عبادت، عمل وغیرہ) کے بغیر انسان کو اپنی رحمت بے پایاں سے نوازنے والا ـــــ اگر خدائے تعالےٰ صحیفہ کائنات کو حق (قرآنی بیانات) کے مطابق نہ بناتے اور اس میں حق کے نشان نہ رکھتے، تو انسان کو حق کا علم کہاں سے حاصل ہو سکتا تھا۔ بلکہ تو این حق کی مطابقت نہ ہونے کی وجہ سے انسان وجود پذیر ہی نہ ہو سکتا ـــــ قرآن میں بار بار اس مفہوم کی آیتیں آئی ہیں کہ "قرآن حق ہے" ـــــ قرآن حق کے مطابق اترا ہے۔ یہ کائنات بھی (جس میں انسان اشرف ہے) حق کے مطابق بنائی گئی ہے ـــــ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ۔ خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ۔ ظاہر ہے کہ اگر اللہ تعالےٰ سورج چاند، آسمان زمین، فضا اور خورد و نوش کے سامانوں کو پیدا نہ فرماتے، تو انسان کا وجود و قیام ہی محال تھا۔

تو مطلب یہ ہوا کہ حضرت رحمٰن (جلّ جلالہ) کی سب سے مقدم رحمت قرآن مجید ہے جس کا علم رحمٰن نے صحیفۂ فطرت میں رکھا ہے۔ اور اسی علم کو فطری نشان بنایا" علّمَ" کے دو معنیٰ ہیں۔ ۱۔ سکھایا، ۲۔ نشان یا علامت بنایا۔ قرآن مجید لوح محفوظ یا کتٰب مکنون[۵۱] (یعنی صحیفہ کائنات میں) انسان کی پیدائش سے پہلے ہی موجود ہے؛ اس کے مطابق اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے (خلق السماوات والارض بالحق) پھر اسی فطرت اللہ کے مطابق انسان کو بنایا۔ (فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا) اب حضرت مرحوم کا تشریحی ترجمہ بھی دیکھ لیجئے۔

اَلرَّحْمٰنُ، عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ، عَلَّمَهُ الْبَيَانَ، اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ۔

رحمٰن نے (صحیفہ فطرت میں) قرآن کا علم رکھا (اور قرآن کو نشان بنایا) (پھر اپنے عملی قرآن، سراسر حق کے مطابق) انسان کو پیدا کیا۔ انسان کو بیان سکھایا، او تشریح بتفصیل کرنے کی طاقت دی۔ دیکھو سورج اور چاند بھی حساب کے ساتھ ہیں اور حقانی قواعد کے مطابق گردش کرتے ہیں۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے۔ کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے قرآنی بیانات کو آیات کہا ہے۔ بالکل اسی طرح کائنات عالم کو مجموعہ آیات فرمایا ہے۔ اسی کے مطابق کسی عارف نے کہا ہے۔

وفی کل شیٔ لہٗ آیۃٌ

تدل بہا انہ واحدٌ

ہر شئے میں اللہ تعالیٰ کی آیت یعنی نشانی ہے، جو اس کی توحید پر دلالت کرتی ہے۔ لہذا ایک قولی قرآن ہُوا، دوسرا عملی۔ دونوں ایک دوسرے کے بالکل مطابق ہیں۔ قولی قرآن حالی طور پر عملی قرآن میں پہلے سے موجود ہے۔ انسان اس کے مطابق بعد میں بنتا ہے۔ اسی سے قرآن کے قدیم یا حادث ہونے کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔

——— مَیں نے خواجہ صاحب کا بلیغ مفہوم لے لیا ہے اور اپنے الفاظ میں واضح و عام فہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ (ع)

---

[۵۱] صحیفۂ عالم کو "کتاب مکنون" غالباً اس وجہ سے فرمایا گیا ہے کہ اس کے اسرار کی کوئی تھاہ نہیں۔ وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا۔ تم کو بہت کم علم ملا ہے۔ لَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ۔ تیرے رب کے لشکروں کو وہی جانتا ہے۔ اور کائنات کو کتاب کہنے کی وجہ زمین کے طبقات و رکازات کا مطالعہ کرنے والوں سے پوچھئے۔ بس ع

ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

یورپین مسلمان

۱۔ ماسکو کے مشرق میں دو مسلمان خود مختار جمہوریتیں قائم ہیں۔ ایک بشکیریا، جس کا پایہ تخت قازان ہے دوسری قلموقیا، جس کا پایہ تخت طونا ہے۔

۲۔ صوبہ بوسینا میں مُسلم تمدن ماشاءاللہ پوری طرح زندہ و فعال ہے۔ اور مرکز حکومت میں اس کے نمائندہ نہ صرف پارلیمنٹ کے ارکان ہیں بلکہ ایک مسلمان وزیر بھی ہے۔

۳۔ فن لینڈ میں بھی مسلمانوں کی خاصی آبادی موجود ہے ۱۹۴۳ء میں قرآن مجید کا ترجمہ بھی اس ملک کی زبان میں ہوا ہے۔

۴۔ شمالی افریقہ، ٹیونس، الجزائر اور مراکش سے منتقل ہو کر کوئی ۲½ لاکھ مُسلم اِس وقت تک فرانس اور بلجیم میں آباد ہو چکے ہیں۔

۵۔ پیرس میں مزدوری پیشہ مسلمان ایک لاکھ کی تعداد میں ہیں اور مارسیلز میں بھی کئی ہزار ہیں۔

۶۔ برطانیہ کے بندرگاہوں میں مسلمانوں کی خاصی اور خوش حال آبادی ہے بخصوصاً حضرمی عربوں، ہندیوں اور پاکستانیوں کی۔

۷۔ یورپین عورتیں جو مسلمانوں کے عقد میں آ گئی ہیں۔ خاصی بڑی تعداد میں خود بھی مسلمان ہو گئی ہیں۔ نہ صرف بڑے شہروں میں، بلکہ دیہات میں بھی۔

۸۔ خواجہ کمال الدین مرحوم کے مشن کے علاوہ دوسرے قادیانیوں کے مشن انگلستان اور فرانس کے علاوہ ہالینڈ، بلجیم، سوئٹزرلینڈ اور اسپین میں بھی کام کر رہے ہیں۔ بہت سے ڈسلوں سے مل کر یہ اندازہ ہوا کہ یہ کتب بینی سے بڑھ کر مسلمانوں کو دیکھ دیکھ کر متاثر ہوئے۔ ان ملکوں کے سپاہی جو مُسلم ملکوں میں فوجی ڈیوٹی پر رہے۔ انہوں نے مسلمانوں کا مشاہدہ کیا اور پھر وطن آ کر اپنے ہم وطنوں کو متوجہ کیا۔

۹۔ قرآن مجید کے ترجمے اس وقت یورپ کی چھوٹی بڑی زبانوں میں ملا کر ۲۳ زبانوں میں موجود ہیں۔ اور بعض زبانوں میں تو ایک آدھ نہیں بلکہ کئی کئی ہیں۔

انگریزی میں ۱۹۔ فرنچ میں ۱۳۔ لاطینی میں ۱۷۔ اسپینی میں ۶۔ جرمن میں ۱۵۔ اٹالین میں ۹۔ روسی میں ۹۔ ڈچ میں ۴۔

یہ مقالہ عثمانیہ یونی ورسٹی کے استاذ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی تالیف ہے اور لاہور کے جدید رسالہ "اسلامک لٹریچر" کے نمبر اوّل میں نکلا ہے۔ وہاں سے "صدق" میں اُردو میں منتقل ہُوا۔

یہ یورپی علاقوں کے مسلمان باشندے اور اور دوسرے بر اعظموں کے مسلمان سب ایک تسبیح کے دانے ہیں۔ اور یہ تمام بر اعظموں کی مشہور و غیر مشہور زبانوں میں قرآن مجید کے ترجمے سب کے سب ایک مقدس دھاگے کا حصہ کم نکتے نہیں ہیں جسے خود قرآن نے "حبل اللہ" یعنی اللہ کی رسّی کہا ہے اور اس میں سب کو مل کر پروئے جانے کا حکم دیا ہے (واعتصموا بحبل اللہ جمیعًا) پاکستان بننے کے بعد ان سب بکھرے ہوئے دانوں کے اسی ایک تاگے میں منسلک ہونے کے امکانات قریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ ماہرین قرآن اور مشیت خداوندی کے عارفوں کا خیال ہے کہ مسلمان پھر اُٹھیں گے۔ اور ساری دنیا پر چھا جائیں گے، انشاء اللہ۔ آؤ ہم اپنے آپ کو اس مبارک مستقبل کے لئے تیار کریں۔

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا

سنا ہے قدوسیوں سے مَیں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

ادبیات

ایکٹ ۱۹۳۵ء

شومیٔ قسمت نخچیر کہاں بدلی ہے   خوابِ صیّاد کی تعبیر کہاں بدلی ہے
وہی پرویز کے حیلے وہی فرہاد کا جان   اہلِ تدبیر کی تدبیر کہاں بدلی ہے

لفظِ "محکوم" کی تفسیر کہاں بدلی ہے   یعنی جمہور کی تقدیر کہاں بدلی ہے
یہ تو سچ ہے کہ بدل لی ہے قمرؔ ہم نے نیام   پر وہ انگریز کی شمشیر کہاں بدلی ہے

سحر......؟

رات رخصت ہوئی اور ڈوب چکے ہیں تارے
پھر بھی کس مُنہ سے کہوں صبح ہوئی جلوہ فگن
جگمگا اُٹھی ہیں محلوں کی منڈیریں بے شک
جھونپڑوں تک مگر آئی نہیں سورج کی کرن

لب پہ آئی ہوئی اِس تلخ حقیقت کے سوا
اور جو کچھ بھی کہوں گا وہ فسانہ ہوگا!
یا تو محرومیٔ خورشید گوارا کر لو
یا ان اُٹھتے ہوئے محلوں کو گرانا ہوگا

قمرالدّین قمرؔ

حسابِ دوستان

آمد

محترم خواجہ عبدالحفیظ	۱۰۵-۰-۰
معرفت عبداللہ خاں صاحب	۲۵۰-۰-۰
محترم مستری محمد عبداللہ	۱۵-۰-۰
محترم شیخ محمد اسحاق	۲۰-۰-۰
نامعلوم صاحب	۱۰-۰-۰
متفرق احباب	۸-۰-۰
محترم بابو محمد دین رنگ محل	۵-۰-۰
" خواجہ محمد افضل وسن پورہ	۵-۰-۰
" مرزا عبدالرب لاہور	۲۰-۰-۰
" سید غلام یزدانی مہتمم خزانہ	۵-۰-۰
" میاں بشیر احمد ایم اے اکونٹنٹ جنرل لاہور	۱۰-۰-۰
" میاں مبارک دین کونسلر لاہور	۵-۰-۰
" شیخ محمد دین بیرسٹر ایٹ لا، لاہور	۵-۰-۰
" ذوالفقار علی گوجرانوالہ	۵-۰-۰
" ڈاکٹر ایس ایم شریف	۵-۰-۰
" ڈاکٹر غلام نبی اچھرہ	۵-۰-۰
" حاجی چراغ دین لاہور	۵-۰-۰
" بزم توحید محلہ پیر گیلانیاں لاہور	۵-۰-۰
" معرفت کریم بخش سکھانی کراچی	۱۲-۰-۰
" وزیر زادہ سردار گل لاہور	۵-۰-۰
محترم ڈاکٹر علی گوہر لاہور	۵-۰-۰
محترم مستری تاج دین لاہور	۵-۰-۰
محترم بابو غلام رسول منٹگمری	۵-۰-۰
میزان	۹۲۸-۰-۰

خرچ

سٹیشنری	۳-۰-۰
دو عدد مہریں	۴-۰-۰
بورڈ لکھوائی وغیرہ ادارۂ اُمتِ مسلمہ و ادارۂ البیان	۴-۰-۰
کتابت رسالہ ماہ ستمبر	۵۸-۱۰-۰
کاغذ بمعہ اُجرت	۲۹-۰-۰
چھپائی	۴۸-۶-۰
خرچ ڈاک	۶-۱۰-۰
بل بجلی دارالقرآن	۸-۰-۰
کاغذ مسطر برائے کتابت	۲-۰-۰
میزان	۲۲۰-۲-۰

نوٹ:- جن اصحاب کا چندہ یا عطیہ اس فہرست میں درج نہیں۔ وہ ناظم اُمتِ مسلمہ کو "دارالقرآن، نسبت روڈ" کے پتے پر مطلع فرمائیں۔

(مینجر)

جن اصحاب

کو

رسالہ پہنچ چکا ہے وہ اپنے چندے اور عطیے

ڈاکٹر غلام حسن صاحب ۲۲، نسبت روڈ، لاہور

کے پتے پر بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں، اور
پیغامِ توحید کو زیادہ سے زیادہ انسانوں تک
پہنچانے کے لئے توسیع اشاعت کی کوشش کریں
فرصت کے لمحوں کا بہترین مصرف تبلیغ حق ہے۔

(ادارہ)

اطلاع

خط و کتابت اور ترسیل زر مندرجہ ذیل
پتوں پر کیجیے:-

—— خط و کتابت: ——

ادارہ البیان، دار القرآن، نسبت روڈ، لاہور

—— ترسیل زر: ——

ڈاکٹر غلام حسن صاحب، ۴۴ نسبت روڈ، لاہور

قمرالدین قمر پرنٹر پبلشر نے کوہ آرٹ پرنٹنگ پریس لاہور
میں چھپوا کر دار القرآن، گیتا بھون، نسبت روڈ، لاہور
سے شائع کیا

الرحمٰن علم القرآن خلق الانسان علمہ البیان

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اُمتِ مُسلمہ کا ماہوار صحیفہ

مرتب

علمے کہ زتو راحت وصحت برباید
بگریز ازاں علم در آغوش جہالت
المانوی معجز نگار گوئٹے کہتا ہے۔

صحت

کم زور طالب علم اپنے زرد چہرے اور گنجے سر کے ساتھ اکثر آہ بھر کر یہ کہتا ہے۔

"او پورے اور شان دار چاند، جسے میں نے اس میز سے کتنی ہی مرتبہ نیم شب کے وقت آسمان پر اپنا نور بکھیرتے ہوئے دیکھا ہے — کاش تیری چاندنی آخری مرتبہ میرے غموں کو دیکھتی! اے نہایت ہی غم خوردہ دوست تیری آنکھ نے ہمیشہ مجھے کاغذوں اور کتابوں پر جھکے ہوئے دیکھا ہے — لیکن — اے کاش میں بلند اور پر عظمت پہاڑوں پہ تیری مبارک روشنی کے درمیان کھڑا ہوتا — پہاڑوں کی غاروں میں نیک ارواح کے ساتھ منڈلاتا پھرتا، اور چراگاہوں میں تیری چاندنی میں تیرتا ہوتا — اور علم کے دھوئیں سے جس نے مجھے جکڑ رکھا ہے، آزاد ہو کر اپنے آپ کو تیرے پرنم چشموں میں غسل دے کر صحت مند ہو سکتا!"

گوئٹے کو گزرے ہوئے — زمانہ ہو چکا ہے۔ آج علم کا آسیب ہم پر اور زیادہ مسلط ہو چکا ہے، پچکے ہوئے گال، چہرے کی ابھری ہوئی ہڈیاں، زرد زرد اور دھنسی ہوئی آنکھیں، چڑچڑا مزاج، دائمی قبض، معدے کی خرابی، متواتر زکام، ہر موسمی مرض کے لئے سراپا استقبال — یہ ہے پاکستان کی تہذیب زدہ نسل کا نقشہ جس سے ہمارے ملک کی شان دار

امیدیں وابستہ ہیں۔

بنی اسرائیل کی نرینہ اولاد کو ہلاک کرنے کے لئے فرعون کو کالج کی نہ سوجھی" لیکن دانش مند انگریز کو سوجھ گئی ــــ اُس نے اس تدبیر سے ع

"کرتے ہیں قتل، ہاتھ میں تلوار بھی نہیں"

کا پارٹ خوب ادا کیا، شکایت نہیں ــ آفریں ہے اس کی سیاست پر۔ ہمارا داؤ اگر چلتا تو ہم بھی انگریز کے ساتھ ایسا ہی کرتے!

مکروا ومکروا اللہ واللہ خیر الماکرین۔

داؤ کرنے والوں سے جوابًا اللہ نے داؤ کیا۔ اور اللہ کا داؤ نتیجۃً سب سے بہتر اور خیر ہے اور اب جب کہ ملک اپنا، قوم اپنی، قانون اپنا، سب کچھ اپنا ہے ۔اس حالت میں صحت و توانائی کی طرف سے غفلت و بے پروائی کیا معنی رکھتی ہے ۔ افراد قوم کا اس اہم فریضے سے غافل رہنا، دشمن کو حملے کی دعوت دینے کے مترادف ہے ۔جس طرح آج علم کا فریب ہلاکت کا موجب ہو رہا ہے، اسی طرح پرانے زمانے میں روحانیت کا فریب جسمانیت کی اہمیت سے غافل کرتا تھا ــــ لیکن اسلام میں ایسی روحانیت اور ایسے علم کے لئے کوئی جگہ نہیں ــ

ــــ رومیؒ کے ملفوظات میں لکھا ہے کہ آپ ایک دفعہ اپنے محبوب مرید وزیر السلطنت معین الدین پروانہ کی ملاقات کو تشریف لائے، پروانہ بہت مسرور اور شکر گذار ہوئے اور کہنے لگے آج حضرت نے بے حد احسان فرمایا اور خود تشریف لاکر اپنے خادم کو نوازا۔

مولانا نے فرمایا ــــ "روحانی ملاقات تو ہوتی ہی رہتی ہے، آج جسمانی ملاقات کو جی چاہا، اس لئے آپ کے پاس پہنچ گئے"۔

اس پر مولانا نے حسب عادت ایک شاندار اور معنی خیز تقریر کر دی جس کا ملخص یہ ہے کہ "روح کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، بلا شبہ ظاہری اعضا، باطنی احشا، حواس خمسہ ظاہرہ اور حواس خمسہ باطن کا تمام کارخانہ روح کے دم سے چل رہا ہے، روح ہی زندگی ہے، روح ہی توانائی اعمال ہے، روح ہی فہم و ادراک ہے، الغرض سب کچھ روح ہی ہے، اسی ذریعے سے ترقی، پرداز، نمود اور بالیدگی حاصل کرتی

ہے ـــــ مثال کے طور پر یوں سمجھئے ـــــ اناج جو ہماری بقاءِ صحت کا موجب ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ مغز اور چھلکا، آٹا اور بھوسی، اگر ہم راہبوں اور جوگیوں کی طرح اس مغالطے میں مبتلا ہو جائیں کہ جو کچھ ہے۔ روح، مغز یا آٹا ہی ہے، اور جسم، چھلکا یا بھوسی ناقابلِ التفات ہے، اور اس نظریئے کے ماتحت گیہوں کے دانے کا چھلکا اتار کر صرف مغز کو بیج کے طور پر زمین میں دبا دیں اور آب پاشی و نگہ داری میں کوئی کمی روا نہ رکھیں، تو کیا یہ امید ہو سکتی ہے کہ زمین کی قوتِ نمو، پانی کی غذا رسانی، دھوپ اور ہوا کی کیمیائی تاثیر، دہقان کا خون گرم اور وہ تمام اسباب و ذرائع جو نشو و نما میں معاون ہو سکتے ہیں، اس میں جان ڈال سکیں گے، اس کے ابھرنے میں کچھ مدد کر سکیں گے؟ ـــ نہیں قطعاً نہیں ـــــ جس طرح چھلکا مغز کے بغیر کچھ نہیں، اسی طرح مغز بھی چھلکے کے بغیر لاش ہے۔ جس کو ہم زمین میں دفن کر رہے ہیں۔"

قرآن پاک نے جسمانی صحت کو بے حد اہمیت دی ہے۔ اگر آیاتِ صحت کو الگ کر کے ان کی شرح کی جائے تو ایک مبسوط و مفصل صحت نامہ بن جائے گا، جس کے مقابلے میں ہماری مروجہ اقسامِ علاج ہیچ نظر آئیں گی ـــــ یہ جو بار بار کہا گیا ہے کہ

"اللہ تعالیٰ صاف ستھرے لوگوں کو محبوب رکھتے ہیں" (توبہ - ۱۰۸)

یہ ارشاد قانونِ حفظِ صحت کی روح نہیں تو کیا ہے۔

"زمینی پیداوار سے پاکیزہ اور حلال چیزیں کھاؤ" (البقرہ ۱۶۹)

اس کا کیا مطلب ہے؟

"کھاؤ پیو اور کھانے پینے میں زیادتی نہ کرو" (انعام - ۱۴۲)

ساری طبّوں کی جان ہے یہ ایک فقرہ ـــــ اگر ان تین فقروں پر من حیث القوم عمل کیا جائے تو کروڑوں روپیہ کے ایلوپیتھک کے تکلفات سے نجات مل جائے۔ فرنگی ڈاکٹری کا سارا کارخانہ (میں علی وجہ البصیرت و التجربہ کہتا ہوں کہ) ایک وسیع و پیچ در پیچ سائنس ہے بیماریوں کی تعداد اور نوعیت میں ہولناک اضافہ کرنے کے لئے ـــــ کوئی نہیں جانتا کہ ان ڈبلوں اور

ڈگری والے پُرشکوہ ڈاکٹروں سے پہلے اس ملک کی صحتیں اچھی اور عمریں طویل ہوتی تھیں —— آج بچے آنکھوں پر عینک لگائے پھرتے ہیں —— اگلے لوگ سو سو سال کی عمر تک پہنچ کر عینک کے محتاج نہیں ہوتے تھے —— ان کی سادہ اور پاکیزہ طرزِ زندگی ہی ان کی صحت و قوت کو برقرار رکھنے کی ضامن ہوتی تھی —— اور یہ ہسپتالوں کی فراوانی جس پر ہمارے اخبار نویس اتنا زور دے رہے ہیں،

"آپ احساں نہ کرتے تو یہ احسان ہوتا"

اس کی بجائے زور اس بات پر دینا چاہیئے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو صفائی، ستھرائی، سادگی اور پاک زندگی کی تعلیم دی جائے۔ شہروں اور مکانوں کی تعمیر میں صاف ہوا، دھوپ اور روشنی کا خاص لحاظ رکھا جائے بازار میں کھانے پینے کی چیزوں کا خاص احتساب کیا جائے، کسی غذا میں کوئی مضرِ صحت جزو شامل نہ ہو سکے

وہ غلظت، صلابت، قوت اور سختی جس کا ہر مسلمان میں پایا جانا قرآن لازمی قرار دیتا ہے (توبہ۔۱۲۳) ہمارے کالج اور یونیورسٹیاں اس سے عبرت ناک حد تک محروم ہو چکی ہیں۔

برنارڈ شا نے ٹھیک کہا تھا کہ ہمارے نوجوان جب یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں تو بالکل مصنوعی دماغ کے حامل ہوتے ہیں۔ آزاد فطرت کے دل کش جمال و کمال سے محروم ہو جاتے ہیں۔

یونیورسٹیاں ہمارے طریقِ عمل اور طرزِ فکر کو بالکل اپنے مصنوعی سانچے میں ڈھال دیتی ہیں —— ہم ہر چیز کو اسی محدود ماحول کی نظر سے دیکھنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اس کے خلاف کہیں کوئی حق و صداقت کی جھلک دکھائی دے تو ہم پورے جوش و خروش سے اس کا انکار کر دیتے ہیں —— دین و اخلاق کا انکار، خدا کا انکار جو آج کل عام ہو رہا ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ کالج ٹریڈ مارکہ دماغ میں اس کی جگہ نہیں رکھی گئی۔ ہمارے مشرقی دارالعلوموں کا حال بھی اس سے بہتر نہیں۔ بریلوی اسکول کا طالب علم اسلام اسی کو سمجھتا ہے جو اس کے تنگ نظر اساتذہ نے اسے بتایا۔ اسی طرح دیوبند وندوہ والے اپنی اپنی الگ راہیں رکھتے اور ایک دوسرے پر آوازے کستے ہیں۔ اپنی تقلید کے پنجرے سے باہر ان کو کوئی دنیا نظر نہیں آتی۔ ان کا جہان اتنا

ہی ہے جتنا ان کے زمانہ طالب علمی کا ماحول اور لبس۔ یہ روش جسم و روح دونوں کی استعدادوں کو کھل کے رکھ دیتی ہے۔

ان نقائص کی اصلاح حکومت کا کام ہے۔ لیکن جب تک حکومت کی آنکھیں نہیں کھلتیں افراد پر اپنے امکان بھر کوشش کرنا لازم ہے۔ ملک کی اس حقیقی ضرورت کو بار بار کے شور و فریاد سے حکومت کے کانوں تک پہنچانا ہر مقرر و محرر کا فرض ہونا چاہیئے۔ جسمانی صحت کے بغیر ہمارا اخلاق، ہمارا دین، ہماری مملکت بلکہ ہمارا سب کچھ قطعاً غیر محفوظ ہے، غیر متوازن دماغ، غیر معقول مطالبات، مذہبی اور صوبائی فرقہ آرائی، باہمی چپقلشیں، شہرت کا جنون، دولت وعہدہ کے حصول کا خبط، تعیش کی لامتناہی تمنا، حسد و رقابت وغیرہ تمام برائیوں کی جڑھ ناتندرست زندگی ہے ــــ تندرست انسان ہی سلیم الطبع اور متوازن الدماغ ہو سکتا ہے، تندرستی ہی سچی قناعت بخشتی ہے، تندرستی ہی سے اطمینان قلب اور روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے، تندرستی ہی سے ہمارے گھروں کے جھگڑے، انجمنوں کے اختلافات اور لیڈروں کی فتنہ پردازیاں ختم ہو سکتی ہیں۔ اگر ان سب بڑے لوگوں کا طبی معائنہ کرایا جائے جو دنیا کو بار بار جنگ، قحط اور مظلومیت کی بھٹی میں جھونک رہے ہیں۔ تو سب کے سب بیمار نکلیں گے۔ صحیح آدمی کبھی کسی کی حق تلفی نہیں کر سکتا۔ کسی کو ضرر پہنچا کر خوش نہیں ہو سکتا۔ اور ان قائدین عالم نے لاکھوں گردنیں کٹوائیں، کروڑوں کو بھوکوں مارا اور مار رہے ہیں، لیکن ان کا دل نہیں پسیجتا ـــ کیا کوئی سلیم و صحیح دل ایسا پتھر ہو سکتا ہے؟

مجھے ایک مرتبہ پھر یہ پکارنے کی اجازت دی جائے کہ پاکستان تندرستوں کا ملک ہونا چاہیئے۔ ہمارا دین تن درستی سے شروع ہوتا ہے۔ مسلمانی اور تندرستی دو چیزیں نہیں ہیں۔ اگر مسلمانی کو قائم رکھنا اور دنیا میں پھیلانا ہے، اگر عبادت سے لذت یاب ہونا ہے تو تندرست بنو، اپنے جسموں کی دیکھ بھال رکھو۔ اور تندرستی حاصل کرو جو دواؤں کی محتاج نہ ہو۔ بلکہ جو احتیاط اور پاکیزگی سے حاصل کی جائے۔

شذرات کی محدود فضا میں اس وسیع مضمون کی گنجائش نہیں اس لئے ہم اشارات پر اکتفا کر رہے ہیں۔ اللہ تعالٰے نے توفیق دی تو البیان کی آئندہ اشاعتوں میں اس موضوع پر مزید

روشنی ڈالی جائے گی۔

عالم اسباب کسی نے خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ سے توکل واسباب کے متعلق سوال کیا۔ آپ نے فرمایا۔ اسباب سے کام نہ لینا مسبب (جل جلالہ) کی شان میں گستاخی ہے۔

بات بھی ٹھیک ہے۔ آخر اسباب کا خالق اللہ تعالیٰ ہی تو ہے، اسباب کی یہ گوناگونی اور غیر محدودیت کیا اپنے اندر کوئی حکمت نہیں رکھتی؟ کیا یہ محض فضول ہے؟ کیا کوئی دانا شخص اس کو شیطانی کارخانہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے؟ ــــــ ضرورت ہے توسط واعتدال کی۔ اسباب کے اندر الجھ کر رہ جانا اور اُن سے اوپر نظر نہ اٹھانا بے دینی ہے۔ اور اسباب سے نفرت کرنا جاہلانہ رہبانیت اسلام ان دونوں کے درمیان ہے۔ اسباب کو مسبب کے خادم سمجھو۔

اللھم کل شئ خادمك	اے اللہ ہر شے آپ کی خادم ہے۔
اذا اراد اللہ شیئًا ھیّ اسبابہٗ	جب اللہ تعالیٰ کسی شے کا ارادہ فرماتے ہیں۔ تو اس کے اسباب مہیا ہو جاتے ہیں۔

جب یہ ہمارا ایمانی اصول ٹھہرا تو اجازت دیجئے کہ ہم ان اوراق کے اسباب کے متعلق آپ سے چند باتیں کریں، جو اس وقت آپ کے پیش نظر ہیں۔

ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کو البیان کے ذریعے اس ملک کی کوئی خدمت لینا منظور ہے۔ تو وہ ضرور اس کی بقا کے سامان فراہم فرمائیں گے، جہاں تک ظاہری اسباب کا تعلق ہے، اس کی فراہمی کے متعلق ہم سے جو کچھ ہو سکتا ہے، بتوفیقہٖ کر رہے ہیں۔ زیر نظر پرچہ دورِ جدید کا تیسرا نمبر ہے، جن مشکلات سے نکل کر یہ اپنے دوستوں کے ہاتھوں میں پہنچ رہا ہے۔ اس کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ گذشتہ کو چھوڑ دیئے۔ آئندہ کے متعلق سوچئے۔ جن دو ایک بھائیوں نے اب تک یہ بوجھ اٹھایا ہے، ظاہر ہے کہ وہ ہمیشہ تک تو اٹھا نہیں سکیں گے۔ انہوں نے اس اٹکی ہوئی گاڑی کو پہلا، دوسرا اور پھر تیسرا دھکا لگا دیا۔ ان کی سعی محض مخلصانہ اور لوجہ اللہ ہے ــــــ اب اسے آگے کھینچنا دوسرے اسباب کو چاہتا ہے ــــــ اب اس کا عالم اسباب آپ ہیں جو اس وقت اس کو پڑھ رہے ہیں اور اس کی پالسی سے

اتفاق رکھتے ہیں۔ اور پاکستان کی موجودہ صورت حال کے لئے اس آواز کو قائم رکھنا چاہتے ہیں ۔ ہمیں اس صداقت کے اظہار میں کوئی باک نہیں کہ ہمارے پاس نہ پیسہ ہے نہ کتابیں اور نہ ہی معاونین کی تسلی بخش تعداد جن حلقوں سے امید تھی کہ "البیان" کا اجرا ہوتے ہی وہ اس کو تھام لیں گے، ابھی تک ان کی طرف سے کوئی قابلِ ذکر اقدام نہیں ہوا ـــــ پرانے رفیق جانتے ہیں کہ "البیان" کبھی تجارتی پرچہ نہیں رہا اور نہ اب ہے تبلیغی خلوص ہی ہمیشہ اس کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ اس کے کارکن دو ایک جو مہیا ہو سکے ہیں اس وقت پہلے سے بھی زیادہ ایثار و خدمت کے مقام پر کھڑے ہیں اور یہ محض اللہ کریم کی توفیق سے ہے۔ اگر آپ پرانے خدام سے خدمت لینا چاہتے ہیں تو ان کو کچھ نہ دیں۔

لا اسئلکم اجراً

ہم تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتے

لیکن اس کاغذ کی بازاری قیمت، کاتب کی اجرت، پریس کا معاوضہ، ڈاک خانے کا خرچ۔ بس چند ماہ کے لئے اس کا انتظام فرما دیجئے۔ پھر دیکھئے آپ کی ہمت دیکھ کر پردہ غیب سے امداد کے کیسے سامان ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ سالانہ چندے منی آرڈر کر دیجئے۔ زائد عطیے بھی بھیجئے۔ اپنے حلقہ احباب کو اس کے مطالعہ و اعانت پر متوجہ کیجئے۔ اور دفتر امت مسلمہ کی مطبوعات استعارۃً یا قیمتاً یا عنایت فرما دیجئے۔ اس کے علاوہ بھی دینی، تاریخی اور علمی کتابیں بھجوائیے۔

ادارہ "البیان" ان اصحاب کا شکر گذار ہے۔ جنہوں نے البیان کی مالی مدد کی اور توسیع اشاعت کے لئے کوشاں ہیں خصوصاً۔ ماسٹر کریم بخش صاحب سکھانی کراچی۔ محمد اسحاق خالد صاحب کراچی پروفیسر زرین رازی سرگودھا۔ خواجہ عبدالوحید صاحب پشاور۔ خواجہ عبدالحفیظ صاحب چٹاگانگ۔ عبداللہ خان صاحب پور۔ مرزا عبدالرب صاحب اور میاں بشیر احمد صاحب لاہور ہمارے پُرخلوص شکریے کے مستحق ہیں۔

جزاھم اللہ احسن الجزا۔

اگلے پرچے میں

مولانا تمنا عمادی صاحب کا بلند پایہ علمی مقالہ "ظن" شائع ہو رہا ہے۔ (ادارہ)

حسابِ دوستاں

جن اصحاب کے چندے یا عطیئے اس فہرست میں درج نہیں، ناظمِ اُمتِ مسلمہ کو
دارالقرآن نسبت روڈ کے پتے پر مطلع فرمائیں۔ (ناظم)

آمد

سابقہ بقایا	۴۰۷-۱۴-۰
عبدالکریم صاحب سرگودھا	۵-۰-۰
خواجہ عبدالکریم عبدالحمید صاحبان کراچی	۵-۰-۰
خان محمد فصیح الدین صاحب	۱۰-۰-۰
خان محمد زمان خاں صاحب	۱۰-۰-۰
ایم نورالدین صاحب کراچی	۵-۰-۰
پروفیسر فیروزالدین صاحب رازی سرگودھا	۲۰-۰-۰
قیمت دو کاپی رسالہ	۱-۰-۰
ماسٹر کریم بخش صاحب سکھانی کراچی	۱۵-۱۵-۰
سید اکرام الدین صاحب جمرود	۵-۰-۰
مینجر صاحب مکتبہ شعوریہ قادر پور	۳-۵-۰
چودھری بشیر احمد صاحب سوی	۵-۰-۰
ڈاکٹر عبدالغفور صاحب قریشی پشاور	۵۰-۰-۰
چودھری نیاز علی خاں صاحب پشاور	۵-۰-۰
مسٹر منظور بٹ صاحب پشاور	۵-۰-۰
خواجہ عبدالوحید صاحب پشاور	۵-۰-۰
میزان	۵۵۸-۲-۰

خرچ

قیمت کاغذ	۲۲-۵-۰
اُجرت کتابت البیان ماہ اکتوبر و نومبر ۱۹۴۹ء	۷۴-۰-۰
طباعت [illegible] شمارہ ماہ اکتوبر و نومبر ۱۹۴۹ء	۴۳-۱۰-۰
ڈاک	۲۵-۱-۰
	۱۶۵-۰-۰
بقایا	۳۹۳-۲-۰

سابقہ ماہ کے حساب میں شیخ محمد اسحاق صاحب کے تیس روپے اور نامعلوم اصحاب کے دس روپے غلطی سے درج ہوگئے ہیں۔ دراصل ان تیس روپوں کی تفصیل یوں ہے:۔

محمود علی صاحب	۲۵-۰-۰
نامعلوم	۵-۰-۰

ناظم اُمتِ مسلمہ پاکستان

۲۰/۱۱/۴۹ لاہور

عقل مند کون ہے؟

(جناب عرشی صاحب)

(۱) عقل مند وہ ہے جو بہت زیادہ مذہبی معلومات حاصل کر کے کوئی نیا فرقہ کھڑا کر دے۔ اپنے فرقہ کے لوگوں میں اپنی مقدس دوکان داری کو عروج دینے کا جنون پیدا کر دے۔ اپنے پیروؤں کے سوا باقی ساری دنیا کے خدا پرستوں، ایمان داروں اور پرہیزگاروں پر نجات وجنّت کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دے۔ اپنے عقیدت مندوں کی آنکھوں پر ایسی پٹی اور دل پر ایسا تالا لگا دے کہ اُس کی عقیدت ومحبت اُن کے اندر سے کسی طرح باہر نہ نکل سکے۔ اس کی لغو سے لغو حرکت اور فضول سے فضول بات ان کی نگاہ میں کرامت و اعجاز کا درجہ رکھتی ہو۔ دوسرے لوگوں کی معقول و مدلل بات اور اعلیٰ روحانی و اخلاقی صفات انہیں ہیچ و پوچ نظر آئیں۔

(۲) عقل مند وہ ہے جو کسی مشہور مزار کی سجادہ نشینی کرے۔ اپنے آپ کو صاحب مزار کی اولاد مشہور کرے۔ عرس کے موقع پر اچھے قوال اور طائفے مہیا کرے۔ ناچ رنگ اور ہوحق کی مجالس گرم کرے۔ اور زیادہ کامیابی حاصل کرنی چاہے تو سلسلہ بیعت بھی شروع کر دے۔ مریدوں کو تصوّرِ شیخ کی چاٹ لگائے۔ ایسا ہو کہ وہ اپنی اولاد، رزق، اور عمر وصحت کو اُسی کا فیض سمجھنے لگیں۔ خود عیش وآسائش اور حبِ مال بنانے کی راہ پر ہو لے اور ان کو فنا و طریقت کی راہ پر ڈال دے۔ اُن کی نگاہ میں اپنی اہمیت خدا اور رسولؐ سے زیادہ ثابت کر دے۔

(۳) عقل مند وہ ہے جو بہت بڑا سیاست دان ہو۔ اُس کی رگ رگ سے مکر و فریب کے فوارے چھوٹ رہے ہوں۔ جو بہت ارادے و خدے کرے اور اُن میں سے ایک بھی پورا نہ ہو۔ اور اس پر بھی اپنے آپ کو سچا ثابت رکھنے کی قابلیت رکھتا ہو۔ اپنا کام ہر بار نکال لے اور دوسروں کے کسی کام نہ آئے۔ ہو سکے تو طاقت و دولت خرچ کئے بغیر صرف باتوں اور چالوں ہی سے کمزوروں کو ہڑپ کر جائے۔

(۴) عقل مند وہ ہے جو نظم ونثر، تقریر وتحریر، ریڈیو اور لاؤڈ سپیکر کے ذریعے گلا پھاڑ کر یا ترنّم ریز آواز میں مزدور کی حمایت کرے۔ بیوہ اور یتیم کی مصیبت پر آنسو بہائے۔ ملک کی غربت وافلاس کا دل دوز ماتم کرے۔ لیکن خود موقع

پڑے، تو اپنی عیاشانہ ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے مزدور کی مزدوری، بیوہ کی امانت اور یتیم کا مال بے ڈکار ہضم کر جائے۔

(۵) عقل مند وہ ہے جو ادبی یا سیاسی اخبار یا رسالہ نکالے۔ زمانے کی ہوا پہچانے۔ جس راستہ پر عوام کی کثرت اور عقل کی قلت ہو، اُس پر چل نکلے۔ کامیابی چاہے تو عوام کی نظر میں معتوب جماعت کے خلاف الفاظ کے انگارے اور قلم کے شرارے پھینکے۔ قائدوں کو غلیظ گالیاں دے۔ اس طرح لیڈر بن جائے۔

(۶) عقل مند وہ ہے جو اپنی تجارت کو فروغ دینے کے گُر جانتا ہو۔ ایک دفعہ گاہک اس کی دوکان پر آجائے تو اُسی کا ہو رہے۔ گھٹیا مال کو اپنی ساحرانہ گفتگو سے اعلیٰ اور نادر ثابت کرے۔ کنویسنگ اور پروپیگنڈہ اس کا بہترین سرمایہ ہو۔ اس کی شیریں زبان زہر سے زیادہ قاتل اور چھُری سے زیادہ تیز ہو، لیکن کوئی اُس کی اہمیت اور دھار کو محسوس نہ کر سکے۔

(۷) عقل مند وہ ہے جو اپنے بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلائے۔ کیمبرج، ایڈنبرا اور آکسفورڈ کے ایوانوں کی سیر کرائے۔ سعی و سفارش سے ایسی ملازمت پر لگائے کہ کافی تنخواہ اور کافی سے زیادہ بالائی آمدنی ہو۔ پھر ایسی جگہ اُن کی شادی کرے، کہ حسین، تعلیم یافتہ اور تندرست بہو کے ساتھ کافی دولت بھی ہاتھ لگے۔

اسی طرح کے بے شمار عقل مند ہو سکتے ہیں، جن میں ظاہری حالات کے اختلاف کے باوجود صرف ایک بات مشترک ہو سکتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کی جائے۔ زیادہ سے زیادہ عیش و عشرت کے سامان فراہم کئے جائیں۔ اس حصول و فراہمی کے ذریعے کچھ ہی ہوں، اس کی پروا نہیں، مقصد پر نظر رکھنی چاہیئے۔ وسائل کے اچھے بُرے ہونے سے کچھ سروکار نہیں۔

لیکن

جب ہم قرآن کو دیکھتے ہیں تو وہ عقل مندوں کی کچھ اور ہی صفات بتاتا ہے۔ جس کا شائد کسی پُرانے زمانے میں چلن رہا ہو۔ آج تو وہ بالکل "خلافِ فیشن" معلوم ہوتی ہیں۔ تاہم انہیں بھی سُن لو۔ سُن لینے میں کیا حرج ہے۔ اور بھی کئی پُرانی تاریخی باتیں سُن ہی لیتے ہو۔

إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ۝ الَّذِينَ يُوفُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَلَا يَنقُضُونَ الْمِيثَاقَ ۝ وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُونَ سُوءَ الْحِسَابِ ۝ وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۝

ترجمہ: عقل والے ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ جو اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اقرار کو نہیں توڑتے۔ اور جو اسے جوڑتے ہیں جسے جوڑنے کا اللہ تعالےٰ نے حکم دیا ہے اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور بُرے حساب کا خوف رکھتے ہیں۔ اور جو اپنے رب کی رضا چاہتے ہیں اور صبر کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور اُس میں سے جو ہم نے دیا انکو چھپ کر اور ظاہر خرچ کرتے ہیں۔ اور بُرائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں، انہیں کے لئے (اس دنیا کے) گھر کا اچھا انجام ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔"

قرآن کے نزدیک عقل مند کی یہ دس نشانیاں ہیں۔ اگر کسی میں یہ پوری پائی جائیں تو وہ پُورا عقل مند ہے۔ اگر استطاعت کے باوجود کم ہیں تو اسی تنا سب سے اس کی عقل میں کمی ہے۔ اگر کوئی ان سب کو جواب دے چکا ہے، تو سمجھ لو کہ اس کے سر سے عقل بالکل ہی رخصت ہو چکی ہے ——— اب ہم ان اعلانات و صفات کو ذرا پھیلا کر نظر ڈالتے ہیں اور ساتھ ہی دیکھتے جائیں گے کہ ہم میں یہ کہاں تک پائی جاتی ہیں

۱۔ سب سے پہلے نشان عقل مند کا یہ ہے کہ وہ نصیحت کا متلاشی رہتا ہے۔ جہاں سے بھی ملے، اس کی قدر کرتا ہے

ے نگویند از سر بازیچہ حرفے　　　کزاں پندے نہ گیرد صاحب ہوش
وگر صد باب حکمت پیش ناداں　　　بخوانی آیدش بازیچہ در گوش، (سعدیؒ)

یعنی —— "ہر کسے ناصح برائے دیگراں" ہو رہا ہے۔ گویا وہ سکہ جس کا دنیا کے کسی بازار میں چلن نہیں نصیحت ہی ہے۔ جاہل سے عالم، غریب سے امیر اور بچے سے بوڑھے تک سب اس سے بے پروا ہو کر اپنی اپنی خواہش نفس میں محو رہے ہیں۔

۲۔ اس کے بعد یا اس کے لازمی نتیجے کے طور پر ایفاء عہدِ الٰہی کا نمبر آتا ہے۔ یہ عہد کئی طرح پر ہو سکتا ہے۔ اوّل وہ جو بشرطِ صحت ضمیر اندر سے اُبلتا ہے اور وہ اُسے پورا کئے بغیر تسکین نہیں پاتا اس کو قرآن کی زبان میں 'عہد الست' کہا جاتا ہے۔ ثانیاً وہ جو کسی نبی یا دینی کتاب پر ایمان لا کر کیا جاتا ہے۔ کسی پر ایمان لانے کا مطلب یہی ہے کہ اس کی بات مانے گا، ورنہ ایمان محض ڈھکوسلا ہے ——— آج کہنے کو ہم سب ایمان دار ہیں، لیکن بہت کم لوگ یہ دریافت کرنے کی تکلیف کرتے ہیں کہ ہم جس نبی یا کتاب کے مومن ہیں، وہ ہم سے کیا مطالبہ کرتی ہے۔ ہم اُس کی کس بات پر ایمان لائیں۔ بس اتنا ہی ہے کہ ایک حبھتا انجیل، انجیل پکارتا ہُوا بھاگا جا رہا ہے۔ دوسرا قرآن قرآن کی رٹ لگا رہا ہے تیسرا گیتا کے گیت گا رہا ہے۔ کروڑوں نسخے بک رہے ہیں۔ ترجمے اور تفسیریں بک رہی ہیں۔ خوب اشاعت ہو رہی ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس سب کا یہی حال ہے۔ کسی کو یہ جاننے اور ماننے کی ضرورت نہیں کہ یہ کتابیں کہتی کیا ہیں؟ اور

اگر کوئی ان کا مطلب و معنی سمجھنے کے درپے ہوتا بھی ہے، تو وہ بھی محض بطور فن یعنی عالم، پنڈت، پادری بن گئے۔ لوگوں کو وعظ اور اپدیش سناتے، کماتے اور کھاتے رہے۔ خود عمل کی کوئی ضرورت نہیں، کیوں کہ پہلے ہی سے بخشے بخشائے ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔

۳۔ عقل مندوں کی تیسری نشانی یا ایفاءِ عہد الہٰی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ کسی سے بھی عہد کر کے اُسے نہیں توڑتے۔ وعدے کی پابندی ایک نیو ہے جس پر اخلاقِ حمیدہ کی ساری عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ اگر یہ بنیاد ہی موجود نہ ہو تو باقی فضائل جن سے انسانی سیرت تعمیر ہوتی ہے یعنی انسان انسان بنتا ہے کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتے اور اب تو یہ حال ہے کہ جو لوگ بڑے آدمی ہیں، وہی بڑے وعدہ شکن بھی ہیں۔

ے "وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا"

پابندیٔ عہد کی تقریر کرنے والے، دوسروں کی پیمان شکنی کی مذمت کرنے والے خود نظیری کے اس شعر کے مصداق بنے ہوئے ہیں جس میں وہ اپنے معشوق سے خطاب کرتا ہے ے

دیدہ ام دفترِ پیمان وفا حرف بحرف : نامِ خوباں ہمہ ثبت است ہمیں نام تو نیست

(۴) چوتھی صفت اہلِ عقل کی یہ ہے کہ وہ صلۂ رحم کرتے ہیں یا ایمان کو عمل کے ساتھ جوڑتے ہیں یا حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کا مناسب احترام کرتے ہیں۔ انسانی اتحاد کو تفریق سے مبدل نہیں کرتے۔ الغرض جوڑنے کی چیزوں کو جوڑتے ہیں۔ انہیں توڑنے کی کبھی جرأت نہیں کرتے۔ اور آج صلۂ رحم کا حشر یہ ہے کہ

ع ہیچ الفت نہ برادر بہ برادر دارد (حافظ)

ہر طرف آپا دھاپی اور نفسا نفسی کا طوفان اُمڈ آ رہا ہے۔ گرتے کو اٹھانے کی بجائے اَور زیادہ گہرے گڑھے میں گرانے کی فکر کی جاتی ہے۔ اسی سے حقوق اللہ اور حقوق العباد کا احترام سمجھا جاتا ہے۔

(۵) پانچویں بات یہ ہے کہ عقل مند لوگ اپنے پروردگار کے خوف سے کبھی خالی نہیں ہوتے۔ وہ جابر سلطانوں، سرکش قوموں اور بڑے بڑے دارالحکومتوں کو تہس نہس ہوتا ہوا دیکھتے ہیں تو خدائے جلیل عظیم کے پہلو دستِ انتقام سے لرز جاتے ہیں، عبرت حاصل کرتے ہیں ـــــ لیکن حال کی دنیا میں ایسی تباہیاں مچیں جو پہلے کبھی نہیں آئی تھیں۔ بے شمار آنکھوں نے یہ خونین مناظر دیکھے اور بے شمار کانوں نے سُنے۔ کوئی متنفس نہ بچا، جس پر کسی نہ کسی رنگ میں ان کا اثر نہ پہنچا ہو۔ لیکن کسی کے جسم کا ایک رونگٹا بھی کھڑا ہوا؟ کسی نے آئندہ کے لئے کوئی عبرت حاصل کی؟ جرمن، جاپان، اٹلی، فرانس، امریکہ، برطانیہ، روس وغیرہ میں سے کسی نے بھی ان بُرائیوں

کو چھوڑنے کا تہیہ کیا، جن کے نتیجے میں ان سب کو اور ساری دنیا کو ہولناک مصائب جھیلنے پڑے؟ ——— نہیں نہیں، یہ لوگ اب بھی ایک دوسرے کے خلاف آستینیں چڑھاتے ہوئے خنجر بکف آمادہ ہیں۔ وہی جو کل حلیف تھے، آج حریف ہیں اور ایک دوسرے کو نگل جانے کے لئے دہان آز کھولے ہوئے کھڑے ہیں۔ کیا یہ سب ایک عالم گیر خودکشی کی طرف سرپٹ نہیں دوڑے جارہے؟ کیا یہ قیامت سے پہلے اپنے ہاتھوں سے قیامت برپا کرنے کے لئے بے تاب نہیں ہیں؟

(۶) اس سے اگلا مقام آتا ہے "یوم حساب" کا۔ عقل مند صرف اسی دنیا کے نہیں ہو رہتے۔ اُن کی عقل تقاضا کرتی ہے کہ اُن کی زندگی کے آگے بھی ضرور کچھ ہے۔ اور وہی سب کچھ ہے۔ یہاں نہ تو ہر بدی کی سزا دکھائی دیتی ہے نہ ہر نیکی کا انعام۔ اس لئے عدل و انصاف کا کوئی وقت ضرور ہونا چاہیئے۔ اگر اس کے لئے ابھی سے تیاری نہ کی تو یہاں (دنیا میں) آکر کچھ نہ کیا۔ وہ دیکھتے ہیں، سورج، چاند، ستارے، زمین وغیرہ سب ہی اپنی رفتاروں میں ایک ایک لمحے کے پابند ہیں۔ طلوع و غروب میں لمحہ بھر ادھر اُدھر نہیں ہو سکتے۔ وہ جو بے شمار اجرام سماوی کو لمحوں کے حساب سے جکڑے ہوئے ہے۔ ہمارے عمل کا کوئی ذرہ اس سے کیوں کر اوجھل ہو سکتا ہے؟ عقل مند کے قلب سے یہ اندیشہ ضرور لپٹا رہتا ہے ——— اور وہ جو دنیا ہی کو سب کچھ سمجھ چکے ہیں۔ جن کی کوششیں لے دے کے یہیں ختم ہو جاتی ہیں۔ جن کے نزدیک نہ حساب کوئی شدنی چیز ہے اور نہ حاسب کا کوئی وجود محقق ہے ہماری زمین کی پیٹھ زیادہ تر انہیں سے لدی ہوئی ہے۔ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک چلے جاؤ، ہر جگہ ایسی ہی برساتی مخلوق پاؤ گے، جو چند روز اپنی ہریاول دکھا کر ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی ہے۔ یہ چوپاؤں کی سی زندگی ہے۔ جس کسی کا کھیت سامنے آیا، منہ مار دیا۔ پیٹ بھرا اور آگے ہوئے بس چرتے ہی چرتے اس چراگاہ سے رخصت ہوئے۔ نہ کوئی ذمہ داری کا احساس ہے نہ باز پُرس کا خیال۔ اسی گلے میں وہ لوگ بھی عملاً شامل ہیں جو روز حساب کے وقوع پر دلائل دیتے اور مواعظ کہتے ہیں۔ (الا من شاء اللہ)

۷۔ ساتویں خوبی جس سے عقل مند کا متصف ہونا ضروری ہے، صبر ہے:-

"ہر کہ صبر نیست حکمت نیست"

جس کے اندر صبر نہیں اس میں عقل بھی نہیں۔ محال ہے کہ نظام کائنات بے شمار متضاد و مختلف خواہشات رکھنے والے انسانوں میں سے ہر ایک کے منشاء کے مطابق چل سکے۔ ناممکن ہے کہ محدود عقل و تجربہ کے انسان کا ہر مدعا ہمیشہ معقول و صحیح ہوا کرے۔ ہم ہر روز صبح سے شام تک کتنی ارادی و غیر ارادی غلطیاں کرتے ہیں کتنی

مرتبہ بھگولتے ہیں، ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے کام بگاڑ لیتے ہیں۔ اپنی صحت کو خود بگاڑ لیتے ہیں پھر
ہماری سب طفلانہ مرضیاں کیوں پوری کی جائیں اور جب بہت سی مرضیاں پوری نہ ہوں گی تو ان پر صبر کرنا ہی حکمت
اور عقل مندی ہے۔ عاقل کبھی بھی خلافِ طبیعت واقعہ سے گھبرا کر راستی کی راہ سے قدم نہیں ہٹاتا اور گناہ کی طرف نہیں
جھکتا۔ اور اس کا یہ صبر و ثبات اِس لئے نہیں ہوتا کہ وہ اہلِ دنیا سے اس کی دادِ تحسین وصول کرے، بلکہ اس لئے کہ
یہ خدا کا حکم ہے اور اس لئے کہ اس میں خدا کی رضا اور اُس کا اپنا فائدہ ہے — اس کے برعکس ہمارا وہی حال ہے
جو شاعر نے کہا ہے ؎

جوہر جام جم از طینت کان دگر است   تو توقع ز گِل کوزہ گراں مے داری

اوّل تو ہمارا زمانہ گذشتہ تمام زمانوں سے زیادہ اضطراب و بے صبری کا زمانہ ہے۔ ہم اپنی ہر خواہش کو مشین
کی سی سرعت سے پورا کرلینا چاہتے ہیں اور پورا نہ ہونے کی صورت میں بے صبری اور بے چینی کا کوئی مظاہرہ ایسا نہیں
جو ہماری طاقت میں ہو اور ہم نہ کریں مصائب اور سختیاں سہنے کے حوصلے ختم ہو چکے ہیں۔ یہ چیز تھی جس سے انسانیت
کے جوہر کھلتے تھے۔ سیرت میں پختگی آتی تھی۔ اسے شرافت و مردمی کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ آج اس کی جگہ نازآفرینی،
پست ہمتی و آسائش پسندی نے لے لی ہے۔ ہمارے نوجوان بوڑھوں سے زیادہ بوڑھے اور بچوں سے زیادہ بچے
ہیں۔ ان سے کوئی اُمید نہیں کہ کوئی اہم کام شروع کرکے اس کو پورا کریں گے اور راہ کی رکاوٹوں کا مقابلہ صبر سے
کریں گے۔

اور اگر کسی قوم میں کچھ صبر و استقلال پایا بھی جاتا ہے (جیسا کہ بعض اقوامِ مغرب میں) تو وہ پست مقاصد کے لئے۔
(خدا کے لئے نہیں) تمام بنی نوع کے مفاد کے لئے نہیں — خود غرضیوں سے آلودہ، نفسانیت سے بھرپور، کمزوروں
کو کم زور تر اور غلام بنانے اور اُن کے حقوق ہضم کرنے کے لئے، اس شیطانی استقلال کا جو نتیجہ آج تک نکلتا رہا ہے
وہی آئندہ بھی نکلے گا۔ گدھی کے پیٹ سے اسپ تازی کبھی پیدا ہوا ہے نہ ہوگا۔ کیکر کے بیج کو انار کے خوشے کبھی
لگے ہیں نہ لگیں گے۔

(۸) آٹھواں بابرکت وصف جس کا عقل مندی کی عقل تقاضا کرتی ہے اور جس سے اس کی روح غذا و تسکین
حاصل کرتی ہے، "نماز" ہے — رات بھر کے خوابِ غفلت سے افسردہ اور دن بھر کے دنیوی انہماک سے تھکی
ہوئی روح کو کچھ وقت زندانِ تفکرات سے آزادی و اطمینان دینے کے لئے ہلکے محتاج ہستی کو آستانہ عنا و کرم پر آسودہ
کرنے کے لئے، قلبی سوز و عطش کو کوثر و تسنیم سے سیراب کرنے کے لئے نماز کی بے حد ضرورت ہے۔ نماز زندگی کے اُس

خلاء کو پُر کرتی ہے، جو کسی اَور طرح پُر نہیں ہو سکتا۔ کوئی سچا مذہب نماز سے خالی نہیں۔ نماز ہی وُہ سیڑھی ہے، جو تراب نادہ بشر کو ارضی پستیوں سے اٹھا کر سماوی بلندیوں پر پہنچا دیتی ہے۔ سچ کہا ہے ہمارے سردار، کہنے والے (صلی اللہ علیہ وسلم) نے:

الصلوٰۃ معراج المومنین

(نماز ایمان داروں کی معراج ہے)

لیکن آج کی دنیا میں نماز سے زیادہ غیر ضروری اور تضیع اوقات شاید اَور کچھ نہیں ـــ ٹینس، ڈانس، فٹ بال، کلب کی حاضری، گھوڑ دوڑ، برج، سینما، تاش، پوپٹ، شطرنج وغیرہ تمدن کے اجزا اور تہذیب کے عناصر ہیں۔ ان کے بغیر کوئی قوم مہذب نہیں کہلا سکتی اور نماز انسان کے دَورِ وحشت و عہدِ جاہلیت کی یادگار ہے۔ جس کی اس دورِ علم میں ضرورت نہیں (معاذ اللہ)

(۹) نویں خوبی جو عقل مند انسان کا طرّۂ امتیاز ہے، یہ ہے کہ وہ اپنی مالی استطاعت کی صورت میں اپنے آپ کو سوسائٹی کا مفید ترین جزو ثابت کرتا ہے، وہ حتی الوسع کسی پر بوجھ نہیں بنتا، لیکن ان کے بوجھ اٹھاتا ہے جو اپنا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ اپنے خزانے پر سانپ بن کر نہیں بیٹھ جاتا، اس کو اس طرح استعمال نہیں کرتا کہ اپنے اخلاق اور صحت دونوں کو برباد کر لے۔ اس کی وجہ سے متکبر بن کر ناداروں پر ظلم نہیں ڈھاتا، بلکہ اُن کو اس میں شریک سمجھتا ہے۔ (فِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ ذاریات۔۱۹) وہ اپنی عقل کے سبب اس ختم ہو جانے والی دولت سے کبھی نہ ختم ہونے والے فائدے حاصل کر لیتا ہے۔ روتوں کو ہنساتا ہے۔ گرتوں کو اٹھاتا ہے، روٹھوں کو مناتا ہے اور لوگوں کے بگڑے کام بناتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ دولت میری ذاتی چیز نہیں۔ میں اسے ساتھ لے کر پیدا نہیں ہوا، ساتھ لے کر نہیں مروں گا۔ دینے والے نے دی ہے کہ اس کی مرضی کے مطابق استعمال کروں۔ اگر میں اس کی مرضی سے اِدھر اُدھر ہوا۔ تو یہ جاہ و حشمت کی ناؤ ایک دن ضرور ڈوب جائے گی اور ساتھ ہی مجھ کو بھی لے ڈوبے گی۔ خرچ تو اَور لوگ بھی کرتے ہیں، لیکن عقل مند کے خرچ کرنے کا انداز نرالا ہے۔ وہ اس طرح دیتا ہے، جیسے کسی کی امانت واپس کر رہا ہے یا اپنا قرض چکا رہا ہے۔ اپنے سر سے بوجھ ہلکا کر رہا ہے۔ دے کر شکر گزار ہوتا ہے، لینے والے کے سر احسان نہیں دھرتا۔ اس سے کسی مادی بدلے اور لفظی شکریے کی تمنا نہیں رکھتا۔ دائیں ہاتھ سے دیتا ہے تو بائیں کو خبر نہیں ہوتی۔ لینے والے کی پوزیشن کو پوری طرح محفوظ رکھتا ہے لیکن اگر قومی یا اجتماعی کاموں میں کوئی ایسا موقع آ جائے، جہاں نمونہ بننے اور دوسروں کو ترغیب دلانے کی ضرورت ہو تو اس کی عقل سلیم تقاضا کرتی ہے کہ اپنی داد و دہش کو پورے خلوص سے نمایاں کرے۔ اس طرح جو لوگ اس کو

دیکھ کر کسی نیک کام میں شرکت کریں گے ۔ ان کو راغب کرنے کا مزید ثواب بھی اس کو ملے گا۔

اس کے مقابلے میں ہمارا کیا حال ہے ۔ خرچ ہم بھی کرتے ہیں لیکن عقلی نتائج اور مقتضیات سے بالکل بے نیاز ہو کر، شادی، بیاہ، ختنہ، عقیقہ، موت اور موت کے بعد کی رسوم پر دل کھول کر بلکہ قرض اٹھا کر خرچ کیا جاتا ہے ۔ اماموں کی نذریں اور مشائخ کی نیازیں دی جاتی ہیں۔ چلتے پھرتے توانا لوگوں میں خیرات تقسیم کی جاتی ہے ۔ بدمعاش مجاوروں کی شہوت رانی اور نفس پروری کے لئے ہر سال، ہر ماہ، ہر جمعرات بلکہ ہر روز زائر زرِ نقد اور تحفے تحائف لے کر درگاہوں پر حاضر ہوتے ہیں، میلے لگتے ہیں، قوالیاں ہوتی ہیں، بازاری عورتوں کے رقص و موسیقی کی محفلیں گرم ہوتی ہیں ۔ سالکانِ طریقت کے مخلص مرید ہزاروں روپے نچھاور کر کے مکتبِ عرفان کی سند حاصل کرتے ہیں۔ قوم میں مقدس بے کاروں، گداگروں اور بدمعاشوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے اور سمجھا یہ جا رہا ہے کہ یہ دین ہے ۔ اس سے خدا رسول اور مشائخ کی ارواح خوش ہو کر ہم پر مہربان ہوتی ہے ۔

ع ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی

(۱۰) دسواں اور آخری شرف عقل مندیں یہ ہوتا ہے کہ وہ اس دنیا کو، جہاں ابلیس کو کھلے بندوں پھرنے اور کرتب دکھانے کی مہلت حاصل ہے، ابلیسی اثرات سے پاک کرتا ہے ۔ کوئی شخص کتنا ہی بے شر اور بے ضرر ہو، یہ دنیا اُسے گزند پہنچانے سے نہیں چوکتی ۔ اس کو دُکھ دینے کے لئے کوئی سبب تلاش نہیں کرتی — کُتوں کی طرح خواہ مخواہ پھاڑنے، کاٹنے کا قصد کرتی ہے ۔ لیکن اہلِ عقل ڈسنے والے کو نہیں ڈستے، کیوں کہ وہ سانپ اور بچھو نہیں ہیں، وہ کاٹنے والے کو نہیں کاٹتے، اس لئے کہ وہ کُتے اور بھیڑیے نہیں ہیں :

سہ تواں کردبا بد گہر بدرگی ولیکن ز مردم نیاید سگی (سعدی)

وہ عقل سے سوچتے ہیں کہ برائی کو کس طرح دُور کیا جا سکتا ہے ۔ اس کا بہتر ذریعہ کیا ہے ۔ یہ بہت نازک مقام ہے، اگر سزا کے موقع پر درگزر کی جائے تو بُرائی کی حوصلہ افزائی ہو گی، وہ اَور زیادہ پھیلے گی ۔ اس وقت سزا ہی بہترین ذریعہ ہو گا ۔ اگر معافی سے بُرائی مٹ سکے تو یہ اَور بہتر ذریعہ ہے اور اگر سزا، معافی دونوں سے الگ کوئی ذریعہ ہو سکے مثلاً برائی کرنے والے لوگوں کا ماحول بدل دیا جائے ۔ ان کی دماغی تربیت کی جائے ۔ ان کو تعلیم سے آراستہ کیا جائے ۔ ان کے نفسی و جسمانی نقائص کی طرف توجہ کی جائے ۔ الغرض عقل مند لوگ بُرائی کو دُور کرنے اور مٹانے کے اچھے اچھے طریقے اختیار کرتے ہیں ۔ آیت میں برائی کو خوبی سے مٹانا لکھا ہے، بُروں کو مٹانا نہیں لکھا — اگرچہ ایک موقع پر آ کر اس کی ضرورت بھی لاحق ہو جاتی ہے جب خاص شرائط سے قتال کی اجازت ملتی ہے ۔ اس وقت

وہی خوبی سمجھی جائے گی، جیسے نشتر فصاد اور آلاتِ جراحی اپنے موقع پر نہایت کار کی چیزیں ہیں۔ لیکن آج تو قتل و غارت عام ہے۔ جعل سازی، چھل چھلا کر سب عیب ہنر بن چکے ہیں۔ پولیس سے دوستی رکھو۔ قانون کی دفعات یاد کرو، وکیلوں سے سازباز کرو اور جس کی چاہو پگڑی اتار دو، جسے چاہو ڈانٹتے پھرو۔ چوریاں کیوں برآمد نہیں ہوتیں، اس لئے کہ چوروں نے پولیس افسروں کے ہدیے مقرر کر رکھے ہیں۔ بدمعاش کیوں کھلے پھر رہے ہیں؟ اس لئے کہ رشوت کا بازار گرم ہے۔ شریف لوگ کیوں اذیتیں اٹھاتے اور انصاف نہیں کرتے؟ اس لئے کہ حکومت کی بارگاہ میں شرافت کی کوئی قیمت نہیں۔ وہ جو سعدی نے لکھا تھا کہ چوروں کے سردار نے مدح کے صلے کی بجائے غریب شاعر پر اپنے کتے چھوڑ دیئے، وہ ان کو مار کر ہٹانے کے لئے زمین میں دبے ہوئے پتھر اٹھانا چاہتا تھا، لیکن وہ اپنی جگہ نہیں چھوڑتے تھے۔ تنگ آکر اس کی زبان سے نکلا:

"چہ حرام زادہ مردمانند کہ سگ را کشادہ و سنگ ہا را بستہ اند"

شاید یہ قول اس زمانے اور اس حکومت پر سب سے زیادہ چسپاں ہوتا ہے۔ یہاں جو لوگ برائی کو ذریعہ معاش بنانا چاہیں، وہ حکومت سے لائسنس حاصل کر کے بھرے بازار میں برائی کی دکان کھول لیں۔ ان کی عزت پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ سوسائٹی میں ان کا وقار کسی سے کم نہیں سمجھا جائے گا۔ لائسنس کی پناہ میں شراب، افیم، چانڈو، مدک وغیرہ کی تجارت ہو رہی ہے۔ لائسنس کے طفیل ہر شہر میں عصمت فروشی کے اڈے قائم ہیں اور وہ بھی لائسنس ہی ہے جس کے سہارے وکیل سچ کے مخبروں کو یقیناً مجرم سمجھتا ہوا بے جرم ثابت کرنے کی انتہائی کوشش کرتا ہے، یعنی لائسنس سے کیا ہوا ظلم، فریب اور جھوٹ سب جائز ہے ـــــ قزاق ہتھیاروں سے مسلح رہتے ہیں۔ شریفوں کی لاٹھی اور چاقو پر بھی حکومت کی نظریں پڑتی ہیں۔

عقل کی دسوں نشانیاں بیان ہو چکیں اور یہ بھی ثابت ہو چکا کہ من حیث القوم وہ کہیں نہیں پائی جاتیں۔ نہ مسلمانوں میں نہ غیر مسلمانوں میں۔ یوں دعوٰی سبھی عقل ہی کا کر رہے ہیں۔ امریکہ ہو یا برطانیہ، روس ہو یا فرانس، جاپان ہو یا جرمن، بلکہ مغلوب و مقہور قومیں یہود ہوں یا ہنود، جس کے دل کو ٹٹولو گے، سب ہی دنیا کو بے وقوف اور اپنے آپ کو عقل مند کہیں گے ؎

گر از بساطِ زمیں عقل منعدم گردد بخود گماں نبرد ہیچ کس کہ نادانم (سعدیؒ)

ادھر قرآنی بیان کو صحیح مانیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا بے وقوفوں سے بھری ہوئی ہے۔ کوئی ڈھکا چھپا فرد عقل مند ہوگا، تو اس کی سنتا کون ہے۔ قرآن نے آیت کے آخر میں ایک بات کہہ دی ہے جس کی روشنی میں

(از مولانا سید جعفر شاہ صاحب)

ان الدین عند اللہ الاسلام (دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے)

لفظی ترجمہ تو آپ نے سن لیا۔ لیکن اس آیت میں دو لفظ ایسے ہیں جن کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ ایک دین، دوسرے لفظ اسلام۔ لغت میں دین کے کئی معنی ہیں اور تقریباً ان سب معنوں میں یہ لفظ قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے۔ اس کے ایک معنی ہیں جزا یعنی بدلہ۔ چنانچہ مالک یوم الدین میں یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے اسی لئے اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں "مالک روزِ جزا کا"۔ دین کے دوسرے معنی ہیں قانون جیسا کہ اس آیت میں ہے، ما کان لیاخذ اخاہ فی دین الملک، اس کا ترجمہ ہے کہ سیدنا یوسف اپنے بھائی کو رائج الوقت شاہی قانون کی رو سے گرفتار نہیں کرسکتے۔ یہی لفظ دین ایک خاص قرآنی اصطلاح بھی ہے جس میں بدلہ اور قانون دونوں کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے یعنی دین ایک ہمہ گیر نظام زندگی کو کہتے ہیں جس کی گرفت سے زندگی کا کوئی گوشہ باہر نہ ہو اور جس میں جزا و سزا کا قانون موجود ہو۔ سزا و جزا کا قانون اور ایک مخصوص طرزِ زندگی کا مفہوم تو مملکت یا حکومت یا سلطنت میں بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن دین اس سے بہت زیادہ وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ سلطنت و حکومت تو محض ملکی و سیاسی دار و گیر کا قانون رکھتی ہے اور زندگی صرف قانون یا سیاست کا نام نہیں۔ اس میں اور بہت سی چیزیں داخل ہیں۔ قانون صرف وہیں پکڑ سکتا ہے، جہاں علانیہ کوئی ملکی یعنی ناپسندیدہ کام ہو۔ لیکن زندگی کے ہزاروں گوشے ایسے ہیں جہاں قانون کی کوئی گرفت نہیں ہوسکتی۔ اگر کوئی شخص چوری چھپے کوئی جرم کرے تو قانون اس کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص دن رات بغاوت کی اسکیمیں دل میں بناتا رہے، تو کون سی سیاست اسے گرفت میں لے سکتی ہے۔ اگر کوئی شخص حدودِ مملکت سے باہر ہو کر کوئی شرارت کرے تو مملکت اور اس کا قانون کیا دار و گیر کرسکتا ہے۔ اگر کوئی انسان اپنے دوسرے پڑوسی کے ساتھ اخلاقی ہمدردی نہ کرے تو کون سا آئین اسے حسنِ خلق پر مجبور کرسکتا ہے۔ غرضیکہ ایک دو نہیں بیسیوں گوشے زندگی کے ایسے ہیں جہاں مملکت اور اس کا قانون بے بس ہو کر رہ جاتا ہے اور ان کو

اپنی گرفت میں نہیں لے سکتا۔ لیکن دین وہ نظام زندگی ہے جس کی گرفت زندگی کے ہر گوشے پر یکساں ہوتی ہے۔ دل کی، نیت، زبان کا کوئی لفظ، ہاتھ پاؤں کی کوئی حرکت ایسی نہیں، جس پر دین کی کڑی نظریں نگراں نہ ہوں۔ اگر فی الواقع کوئی انسان دین میں داخل ہو گیا ہے تو اب اس کا کچھ نہیں رہ جاتا۔ وہ جو کچھ سوچے گا، جو کچھ بولے گا اور جو کچھ کرے گا، وہ سب کا سب اس دین کے مطابق ہوگا جسے وہ اختیار کر چکا ہے۔ دین کے مفہوم میں تنہا ملکی سیاسی قانون ہی داخل نہیں۔ اس میں معاش بھی ہے، معیشت بھی، خلافت بھی ہے سیاست بھی، مادیت بھی ہے روحانیت بھی، دل بھی ہے زبان بھی۔ عمل بھی ہے نیت بھی، ظاہر بھی ہے باطن بھی، معاملات بھی ہیں عبادات بھی، انفرادیت بھی، اجتماعیت بھی، حقائق بھی ہیں اور جذبات بھی۔ بغرض انسانی زندگی میں جتنی جہات ہیں، جتنے پہلو اور جتنے گوشے ہیں، وہ سب کے سب دین کے مفہوم میں داخل ہیں اور اس کی ہمہ گیر حکومت سے کوئی شے بھی باہر نہیں۔ زندگی کے سارے پہلوؤں کو جو شے اپنی مٹھی میں لئے ہوئے ہو اور جس میں سزا کا خوف اور جزا کی توقع بھی ہو، اس حقیقت کا نام ہے دین۔ اس مفہوم کو پوری طرح ادا کرنے کی غرض سے ترجمے کے لئے کوئی لفظ ہمارے پاس نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم اسے ہمہ گیر نظام زندگی کے لفظ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ عام طور پر دین کا ترجمہ مذہب کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ لفظ یعنی مذہب دین کے وسیع مفہوم کو ادا کرنے سے قاصر ہے۔ مذہب کے معنی ہیں انفرادی نجات کے لئے چند رسوم کو ادا کر لینا بخلاف دین کے کہ اس کے معنی ہیں ہمہ تن اجتماعی اور ہمہ گیر نظام حیات۔ مذہب کے معنی میں دین کو استعمال کرنے کا نتیجہ یہ ہو لیا ہے کہ بہت سی وہ باتیں دین سے خارج سمجھی جاتی ہیں جو یقیناً دین میں داخل ہیں۔ دین داری کا مطلب بس اسی قدر سمجھ جاتا ہے کہ نماز روزہ ادا کر لیا جائے اور حتی الامکان مرنجاں مرنج زندگی گذاری جائے۔ الحمد للہ یہ مسلہ اتنا بھی ہوتا تو غنیمت تھا کمال تو یہ ہوا کہ نماز وظیفے کے علاوہ اور جتنی باتیں زندگی سے تعلق رکھتی ہوں، ان سب کو دین سے الگ تصور کیا جانے لگا۔ بلکہ بعض اوقات ان کو خلاف دین بھی سمجھا جانے لگا۔ جب کوئی بات سامنے آئی، اور کہہ دیا کہ ہم تو حاملان دین ہیں ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم   از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

اگر یہ سچ ہے کہ دین وہی ہے جو قرآن میں ہے اور اگر یہ درست ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہی دین کا دوسرا نام ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ کتاب و سنت میں فقط پوجا پاٹ ہی کی چند رسمیں بتائی گئی ہیں، اور اس کے علاوہ زندگی کی دوسری چیزیں وہاں موجود نہیں؟ سرور عالم کی زندگی میں یا قرآن کے احکام میں ہمیں وہ ساری چیزیں ملتی ہیں، جو انسانوں کی سلامتی کے لئے ضروری ہیں، خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی۔ یہاں ساری زندگی کو

عبادت اور دین بنایا اور بتایا گیا ہے۔ یہاں شب بیداری بھی ہے اور عیال داری بھی۔ تجارت بھی اور سیاست بھی۔ جنگ بھی ہے اور صلح بھی ہے اور دار و گیر بھی (تلک سلطنت بھی) ہے اور جزا و سزا بھی۔ دینیت بھی ہے اور روحانیت بھی۔ وہ کون سی چیز ہے جو انسانی زندگی میں پیش آسکتی ہے اور اُس کے لئے قرآنی ہدایات اور رسول کا عملی نمونہ موجود نہ ہو؟ پس اگر دین وہی ہے جو قرآن میں ہے یا رسول کی زندگی میں ہے تو ظاہر ہے کہ وہ تنہا ایک دو چیزیں نہیں بلکہ پورا مجموعہ ہے اور دین یہ ہے ؎

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست　　　اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی ست

غرض یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ دین پوری زندگی کے ہمہ گیر اصولِ حیات کا نام ہے۔ یہ محض مذہب نہیں جس کا مقصد انفرادی نجات کے لئے پوجا پاٹ کی رسم ادا کر دینا ہوتا ہے۔ اب آئیے ذرا اسلام پر بھی غور کریں تاکہ ان الدین عند اللہ الاسلام کا مطلب پوری طرح واضح ہو جائے۔ اسلام کے لغوی معنی ہیں گردن بہ اطاعت نہادن یعنی فرمانبرداری میں گردن جھکا دینا، لیکن الاسلام قرآنی اصطلاح میں ذرا اور وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ فرماں برداری کے لئے گردن جھکا دینا تو دباؤ سے بھی ہو سکتا ہے۔ طاقت کے ڈر سے بھی ممکن ہے۔ اور منافقت سے بھی فرماں برداری کا اقرار کیا جا سکتا ہے تو کیا قرآن ہم سے ایسی ہی فرماں برداری کا مطالبہ کرتا ہے؟ ہرگز نہیں، ایسی فرماں برداری لغت کے اعتبار سے تو اسلام ہو جائے گی، لیکن قرآنی مطالبہ اس سے پورا نہیں ہوگا۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے، الاعراب اشد کفراً و نفاقاً۔ یہ اعراب یعنی بدوی گنوار اپنے کفر و نفاق میں بڑے سخت ہیں۔ پھر دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ قالت الاعراب آمنا قل لم تومنوا ولٰکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم۔ یعنی یہ اعراب دعوٰی کرتے ہیں کہ ہم مومن ہیں ان سے کہہ دو کہ ابھی تم مومن نہیں ہوئے ہو بلکہ یوں کہو کہ ہم نے اسلام یعنی اطاعت قبول کر لی ہے اور ہنوز تمہارے دلوں میں ایمان نہیں اُترا ہے۔ دیکھئے اللہ تعالےٰ خود ان اُجڈ گنواروں کو فرماتا ہے کہ تم یہ کہو کہ ہم نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ دوسری طرف دیکھئے، حضرت ابراہیمؑ فرماتے ہیں کہ اسلمت برب العلمین ہم نے رب العلمین کا اسلام یعنی اطاعت قبول کر لی ہے۔ اب کیا دنیا کا کوئی صاحب عقل یہ کہہ سکتا ہے کہ سیدنا ابراہیمؑ کا اسلام اور منافق گنواروں کا اسلام یکساں ہے؟ نہیں۔ بات بہت صاف ہے۔ وہاں لفظی اور لغوی اسلام ہے اور یہاں قرآنی و حقیقی اسلام۔ اور یہی اصل مقصود ہے جہاں تک قرآنی اصطلاح کا تعلق ہے الاسلام محض گردنِ اطاعت جھکا دینے کو نہیں کہتے بلکہ یہ ایسی اطاعت و فرماں برداری ہے جس میں دباؤ اور منافقانہ سیاسی چال نہ ہو۔ ہمہ تن رضا کارانہ خوش دلی ہو اور اخلاص روحِ اطاعت بن جائے۔ یہاں اطاعت جبر نہیں ہوتی، بلکہ زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ خوشی طاعت ہی ہوتی ہے۔

یہاں قانون کا دباؤ نہیں ہوتا بلکہ محبت کا غیر فانی جذبہ طاعت کے لئے بے چین کئے رہتا ہے۔ یہاں ایک اشارے پر تن من دھن اولاد و ازواج دونوں سب کو قربان کر دینا فوز و فلاح کی معراج کمال ہوتی ہے۔ عقل علم تمنا سب کچھ تابع فرمان ہوتا ہے۔ یہ ہے قرآنی اصطلاح کا اسلام۔ محض گردن بہ طاعت نہادن نہیں۔ مختصر لفظوں میں الاسلام کا مفہوم یہ ہوا کہ اپنے سارے دل و جان سے اللہ کی فرماں برداری ہو۔ اب دین اور اسلام کو ملا کر دیکھئے۔ آیت کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ دین کے معنی ہیں طریق زندگی اور اسلام کا مطلب سارے دل و جان سے اللہ کی اطاعت یعنی ان الدین عند اللہ الاسلام کا مطلب ہوا کہ طرز زندگی اور ضابطۂ حیات اللہ کے نزدیک وہی ہے جس میں سارے دل و جان سے ہر شعبۂ زندگی میں اللہ کی فرماں برداری ہو۔ یہ ہر وقت پیش نظر رکھئے کہ دنیا میں ہمیشہ دو ہی طرز زندگی جاری رہے ہیں۔ ایک وہ جو انسانوں نے خود بنایا ہو۔ اور دوسرے وہ جو اللہ نے بتایا ہو۔ بیشتر اور نادان انسانوں نے ہمیشہ اپنا بنایا ہوا اصول زندگی چلایا۔ اور انبیاء علیہم السلام کی آمد ہی صرف اس غرض سے ہوتی رہی کہ انسانوں کو خدا کے دیئے ہوئے طرز حیات کی دعوت دی جائے۔ یہی ہے اسلام۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اسلام صرف وہی دین ہے جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لائے ہیں۔ یہ صحیح نہیں۔ نبی جو بھی آیا ہے وہ اسلام ہی کی دعوت لے کر آیا ہے۔ کیونکہ ہر ایک پیغمبر کی دعوت ایک ہی تھی یعنی اطاعت خدا کی۔ البتہ شریعتیں بلاشبہ مختلف رہی ہیں۔ اس لئے کہ ہر زمانے کے تقاضے مختلف تھے لیکن دین ایک ہی رہا ہے اور وہ ہے اسلام یعنی سارے دل و جان سے اللہ کی تابعداری۔ یوں سمجھئے کہ ضلع یا صوبے یا ملک کے حکام یکے بعد دیگرے آتے رہیں اور اپنے اپنے ماحول کے مطابق ان کے ذیلی قوانین میں تھوڑا تھوڑا اختلاف بھی رہے لیکن اطاعت ایک ہی بادشاہ کی ہوتی رہے۔ غرض ان الدین عند اللہ الاسلام کا مقصد یہ نہیں کہ دین اللہ کے نزدیک اب اسلام ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیشہ ہی سے دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے۔ عند اللہ یعنی اللہ کے نزدیک کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کی نگاہ میں صحیح اور قابل قبول دین بس اسلام ہے۔ اسی مفہوم کو دوسری جگہ یوں واضح کیا گیا ہے کہ ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ۔ اسلام یعنی اطاعت الٰہی کے اصول کے سوا کوئی سا اصول زندگی جو بھی پسند کرے گا تو وہ قبول نہ ہوگا۔ اب اللہ نے ہمیں پاکستان دیا ہے تو ہم کیوں نہ اپنی زندگی کو اسلامی زندگی بنائیں۔

سچی کہانی

وہ گنبد

"وہ خوش نما گنبد جو تم دیکھ رہے ہو۔ اس سے میری تلخ جوانی کا ایک واقعہ وابستہ ہے!" ۔۔۔ امین نے اپنی خوب صورت چھڑی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں بنک میں ۴۵ روپیہ ماہوار کا نیا نیا ملازم ہوا تھا یعنی کلرک ۔۔۔ لاہور سے دور راولپنڈی میں غریب کی تنہا زندگی ۔۔۔ علی محمد سے شناسائی تو تھی ہی کبھی کبھی ملاقات ہو جاتی تو وہ مجھے کہتا:۔

"امین! تم یہاں بہت تکلیف میں ہو۔ بازاری کھانا تمہاری صحت پر برا اثر ڈال رہا ہے۔"

میں سنتا اور اظہار معذوری پر اکتفا کرتا۔

آخر اس نے ایک دن اصرار کیا کہ میں کچھ ماہوار رقم اسے دے دیا کروں اور اس کے گھر سے کھانا کھایا کروں۔ میں نے منظور کر لیا۔ یہ میرا معمول ہو گیا۔ دونوں وقت اس کے گھر جاتا اور کھانا کھاتا۔ اس طرح اس کی تینوں بیویوں سے بھی راہ و رسم بڑھ گئی ۔۔۔ بیوی نمبر ۱ سیدھی سادی اور معمولی قسم کی عورت تھی۔ نمبر ۲ اس سے دوسرے درجے پر تھی۔ اس کے بعد تیسری بیوی جو اسے ملی وہ سابقہ دونوں سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ اور آخری یعنی چوتھی تو ہر لحاظ سے ملکۂ جمال تھی ۔۔۔ عمر میں بالکل نوخیز، آواز میں لوچ، نگاہ میں جادو، خرام میں دل کشی، لباس کے رکھ رکھاؤ میں نفاست، ذہن و دماغ میں تیزی و تازگی ۔۔۔ اس کی ہر جنبش، جنبش ناز اور ہر ادا، ادائے دلکش ۔۔۔ بس یوں سمجھئے:

"ز بائے تا بسرش ہر کجا کہ می نگرم"

کا مجسمہ تھی وہ ساحرہ جمال" ۔۔۔ کہتے کہتے امین رک گیا۔

میں آپ سے امین کا تعارف بھی کرا دوں ۔۔۔ امین جو اس وقت معمولی کلرک تھا اور نہایت عسرت سے زندگی بسر کرتا تھا ۔۔۔ اپنی بے پناہ محنت و ذہانت سے اسسٹنٹ بن چکا تھا۔ اور اس وقت جب کہ وہ اپنی داستان شباب سنا رہا تھا، ریٹائرڈ ہو کر امیرانہ بڑھاپے کے دن گزار رہا تھا۔

"میں شادی شدہ تھا اور علاقہ فروشی سے نفرت" ۔۔۔ امین نے پھر کہنا شروع کیا ۔۔۔ علی محمد کبھی کبھی

مجھ سے اپنے "حضرت صاحب" کی بزرگی اور کرامتوں کا ذکر کرتا اور کوشش کرتا کہ میں بھی اس کے پیر و مرشد حضرت
صاحب کی خدمتِ بابرکت میں حاضر ہوا کروں۔ نتیجہ؟ اس کے اصرار و ترغیب سے میں کبھی کبھی اس کے ساتھ ہو لیتا
اور حضرت صاحب کے صوفیانہ نکتے سنتا۔۔۔ لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ جس طرح نسوانی حسن کی کمندیں مجھے اپنی طرف
کھینچ نہیں سکتی تھیں۔ اسی طرح روحانی کشف و کرامات میں بھی میرے لئے کوئی جاذبیت نہ تھی۔۔۔ علی محمد مجھے
حضرت صاحب کا مرید بننے کی ترغیب دلاتا رہتا اور میں اُسے پیری مریدی کے دام سے نکالنے کی کوشش کرتا۔
میری اس بے دینی کی خبریں حضرت صاحب تک بھی پہنچنے لگیں۔۔۔ آخر حضرت نے علی محمد سے کہہ دیا کہ وہ
میرے ساتھ اپنے تعلقات منقطع کرلے اور مجھے اپنے ہاں آنے جانے سے روک دے۔ علی محمد اختلافِ عقیدہ
کے باوجود میری شرافت سے متاثر تھا۔ وہ اپنے گھر میں میری آمد و رفت بند کرنے کی جرأت نہ کرسکا۔

کچھ دن بعد مجھے خود ہی ملازمت کے سلسلے میں اپنی سکونت بدلنی پڑی۔ اب میں علی محمد سے ملنے کے لئے موقع
نہیں نکال سکتا تھا۔۔۔ مدت گزر گئی۔۔۔ کئی سال کے بعد ایک دن علی محمد مجھے راستے میں مل گیا۔ علیک سلیک
کے بعد مزاج پرسی ہوئی۔ میں نے پہلی ہی نظر میں دیکھ لیا، اس کا بوسیدہ لباس، افسردہ جسم اور اُترا ہوا چہرہ اُس
کی بدحالی کی غمازی کر رہا تھا۔ میں نے کیفیت و حالت پوچھی۔۔۔

"میں بہت بیمار رہا ہوں۔ موت کے منہ سے نکل کر آرہا ہوں" علی محمد نے کہنا شروع کیا "امین!
تم سچ کہتے تھے۔ مجھے عقیدت نے اندھا بنا رکھا تھا، میں نے تمہاری بات نہ مانی۔۔۔ میں اپنی کمائی کی ایک چوتھائی
اپنے مصرف میں لاتا اور غریبانہ گزارا کیا کرتا تھا، باقی تین حصے ہر مہینے حضرت صاحب کی نذر کر دیا کرتا تھا اور سمجھتا تھا
کہ یہ سب انہی کی برکت ہے۔ اور وہی اس کے اصلی مالک ہیں۔ اسی طرح عمر بھر کما کما کر انہیں کھلاتا رہا۔۔۔ آخر
اپنی طویل بیماری میں کوڑی کوڑی کا محتاج ہو گیا۔ حضرت صاحب میری عیادت کو بھی نہ آتے۔ میں نے امداد کے
لئے پیغام بھیجا، کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ آخر میں نے کہلا بھیجا کہ اپنے پاس سے نہیں تو میری ہی کمائی سے کچھ عنایت
فرمائیں تاکہ اس آڑے وقت میں میرے کام آئے۔ اس گزارش کا بھی کچھ اثر نہ ہوا"۔۔۔ علی محمد کا سلسلہ کلام اور
آگے بڑھا۔۔۔ "امین! اب تم سے کیا چھپاؤں میری چاروں بیویاں حضرت ہی کا عطیہ تھیں۔ پہلے تو آنکھوں پہ پردہ
پڑا رہنے کے سبب میں "اسرارِ درون پردہ" کی نشاندہی، خباثت کو سمجھنے سے قاصر رہا۔ اب جو اس امتحان میں مبتلا
ہوا اور حالات نے پلٹا کھایا، تو سب حجاب اٹھ گئے۔۔۔ حضرت صاحب فنِ اغوا کے بڑے ماہر تھے۔ اس فن کی
بدولت مریدوں اور معتقدوں کی صفائی پر ڈاکہ ڈالا جاتا اور انہیں ہمیشہ ممنونِ التفاتِ خاص رکھا جاتا۔ اور تقدس کی

"آئینِ نو چلیت؟"

(جناب یعقوب توفیق صاحب)

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں جب مغربی طاقتوں نے امریکیت حاصل کر کے دولت کے بل بوتے پر مشرق کی تسخیر کی ٹھانی تو مصر اور وسط ایشیا کے مسلمانوں سے مڈھ بھیڑ ہوئی۔ مسلمان گو عیاش و کوتاہ بین تھے۔ اور اُن کے حکمران آمریت کے دلدادہ اور تعیش پسند، مگر اُن کی رگِ حمیت کو جھنجوڑا جاتا، تو وہ پھڑک ضرور اٹھتی تھی۔ مغرب نے مصر اور مسلمان حکومتوں کو بے بہا دولت دے کر اس چالاکی سے مراعات حاصل کیں کہ اقتصادی بندھنوں سے یہ ممالک بلبلا اٹھے۔ پاؤں جمنے کی دیر تھی کہ یورپی طاقتوں نے صنعتی انقلاب اور پراپیگنڈے کے زور سے عوام کے ذہنوں کو محسور کر لیا۔ ذہنی غلامی، اقتصادی بندشیں اور عیاش حکمران جس ملک کو نصیب ہوں، وہاں اغیار کے سیاسی اقتدار کا پھیل جانا چنداں مشکل نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انیسویں صدی کے آخری بیس سالوں میں افریقہ سے لے کر مشرقِ بعید تک تقریباً تمام اسلامی ممالک (اور چند غیر اسلامی بھی) مغرب کے استعماری تجربہ کی زد میں آ چکے تھے اور ان بدنصیب ممالک کے گلے میں سیاسی یا اقتصادی غلامی کا طوق پڑ چکا تھا۔

مسلمان اپنی زبوں حالی اور بد کردار کے باعث خوار و زبوں تو ہو گئے۔ مگر ماضی کی شاندار روایات، تعلیمی فتوحات اور اخوتِ اسلامی کے تخیل نے مغرب کی آمریت کے خلاف محاذ کھڑا کرنا چاہا۔ چالاک یورپ کی دور رس نگاہیں مشرقی مسلمانوں کی سادہ لوحی کو بھانپ گئیں اور اخوتِ اسلامی کی جگہ نیشنلزم کے جذبہ کو بروئے کار لانے کے لئے زبردست مہم شروع کر دی نتیجہ یہ ہوا کہ "مصر مصریوں کے لئے"، "ترکی ترکوں کے لئے"، "ایران ایرانیوں کے لئے" کے نعرے مختلف اطراف سے ابھرے اور اخوتِ اسلامی کے جذبہ کو ختم کرتے رہے۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد مغرب کی فتح نے مشرقِ وسطیٰ کو اور بھی مفلوج کر دیا۔ مصر اور سوڈان کے دو صوبے بنا دیئے گئے۔ شام و فلسطین کے حصے بخرے کئے گئے۔ عرب کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا گیا اور اس جنگ کے بعد ابھی یہ سلسلہ اور بڑھ رہا ہے۔ سوڈان کو مصر سے علیحدہ کیا جا رہا ہے۔ اس کے دو حصے کر دیئے گئے ہیں۔ فلسطین کا زرخیز ترین حصہ

یہودیوں کے قبضہ میں دیا جا چکا ہے۔ ایریٹیریا کے حصص ہونے والے ہیں۔ جاوا سماٹرا کو علیحدہ کرنے کے منصوبے باندھے جا رہے ہیں۔ کشمیر کو تقسیم کرنے کی سازش ہو رہی ہے۔

سوال یہ ہے: یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ یورپی ممالک مسلمانوں کو پارہ پارہ کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں؟

جواب یہ ہے کہ گدھ کبھی زندہ انسان یا جانور پر نہیں لپکتے۔ وہ مردے کے گوشت اور پوست پر پل پڑتے ہیں۔ مسلمان مغرب کے مقابلہ میں اب تک مُردہ رہا۔ اب اُس کی لاش میں زندگی کے آثار پیدا ہو چکے ہیں۔ ضرورت ہے کہ مسلمان پھر ایک دفعہ متحد ہو کر اپنی روایتی طاقت، یک جہتی اور ہیبت ناک قوت سے منظم ہو کر خدا کی زمین پر خدا کے قانون کو اپنانے کے لئے اٹھیں۔ قرآن حکیم ہمارا رہبر ہو، عَلَمِ محمدؐ ہمارا پرچم ہو، ہمارا نظام اسلامی ہو۔ ہم اپنی حالت بدلنے کو خود اٹھیں خدا ہماری مدد کرے گا۔ اور ہمارے اعمال و کردار کا سرچشمہ کیا ہو؟

صرف قرآن مجید

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۝

ترجمہ: اُس کی پیروی کرو جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتارا گیا ہے اور اُس کے سوا اولیاء کی پیروی نہ کرو۔

جس دماغ سے پاکستان کا تخیل اُبھرا۔ اُسی نے پاکستان کا آئین اور اس کی بقا کی تدبیر بھی ہمارے سامنے واضح الفاظ میں پیش کر دی ہے:

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست ... زیرِ گردوں سرِ تمکینِ تو چیست
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم ... حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات ... بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرفِ او را ریب نے، تبدیل نے ... آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
نوعِ انساں را پیامِ آخریں ... حاملِ او رحمۃ للعالمیں
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ... ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست ... عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
بندۂ مومن ز آیاتِ خداست ... ہر جہاں اندر بر او چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش ... می دہد قرآں جہانے دیگرش (جاوید نامہ)

"اے مسلمان تجھ کو اپنے آئین کا علم ہے؟ تجھ کو معلوم ہے کہ تو اس دنیا میں کس طرح باوقار زندگی بسر کر سکتا ہے؟

شہد کی مکھی

(محترم جی کے ملک صاحب)

تمہید | خلاق فطرت نے حیوانوں اور حشرات الارض کو بھی شعور سے حصہ دیا ہے۔ شہد کی مکھی کے حالات زندگی اور اس کے کاموں کا مطالعہ کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ اس ننھی سی مخلوق کو بظاہر بالکل ادنیٰ اور حقیر نظر آتی ہے، خداوند کریم نے کتنی سمجھ بخشی ہے کہ وہ اپنی زندگی دانائی اور دوراندیشی سے گزارتی ہے۔ سب اپنے فرائض کو پابندی سے سرانجام دیتی ہے جیسے رانی مکھی کی اطاعت، بچوں کی پرورش، خوراک کی فراہمی اور چھتے کی حفاظت اس کے فرائض میں۔ آپ کو اس کے ہر کام میں پھرتی اور ہوشیاری نظر آئے گی۔ اس کے بعض کاموں کو دیکھ کر اس کی محنت اور ریاضت کی داد دینی پڑتی ہے اور خالق حقیقی کی حکمت و قدرت کا کرشمہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے کہ کس طرح اس ننھی سی مخلوق کو بھی اتنی خوبیوں سے نوازا ہے کہ وہ اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرنے میں کسی کی محتاج نہیں۔

شہد کی مکھی میں ایثار و قربانی کا مادہ اس قدر ہے کہ اپنی قوم کی بہبود کے لئے اپنی جان پر بھی کھیل جاتی ہے۔ اسے تزک شاہی، آداب خسروانہ، تمدن اور رموز سیاست کے لحاظ سے انسان کی معلم کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ سکندر اعظم کو مکھیوں کے چھتے نے عالمگیری کا سبق دیا تھا۔ اجتماعی زندگی، ایثار، کفایت شعاری، محنت اور پابندی وقت کا سبق اگر سیکھنا ہو تو اس ننھی سی مخلوق سے سیکھو۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ بنی نوع انسان نے قدیم الایام سے شہد کی مکھی کو پالنا شروع کر دیا تھا۔ تاریخ اس عجیب و غریب مخلوق کی حیرت انگیز زندگی پر تحقیقات کے ساتھ دہرائی رہتی ہے۔ سب سے پہلے جس شخص نے اس کے حالات لکھے، وہ حکیم ارسطو تھا۔ اس نے اپنی کتاب "تاریخ حیوانات" میں اس کا بیان گہرے مشاہدات کے ساتھ کیا ہے۔ اس کے بعد ارسٹیا سے کو پیٹ ایک فلسفی نے اس مخلوق کے اطوار و عادات مدت دراز کے مطالعہ کے بعد لکھے۔ ایک اور فلسفی فلسلس تھا جو سوئٹزرلینڈ کا باشندہ تھا جنگل میں صرف اسی غرض سے جا بستا تھا کہ عجائبات عالم کا علم حاصل کر سکے۔ اس لئے اس کو شہد کی مکھی کی زندگی پر گہری نظر ڈالنے کا موقع ملا۔

ایک رومی سائنسدان پلاتمی کلاں نے بھی اس (مکھی) کے حالات بڑی شرح و بسط سے لکھے ہیں۔ اس کے بعد سترھویں صدی کے آخیر میں اس کو پھر گہری نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ اور تحقیقات کے بعد تاریخ طبعی لکھی گئی اور اس مضمون پر بہت سی کتابیں شائع ہوئیں۔ فرانس، انگلستان، امریکہ، جرمن وغیرہ میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ اور اس وقت ان تمام کوششوں کا نتیجہ ہے کہ یورپ اور امریکہ میں کوئی کسان اور زمیندار ایسا نہ ہوگا جس کے پاس شہد کی مکھیاں نہ ہوں اور اس گھریلو صنعت سے ہزاروں روپیہ کی تجارت ہوتی ہے۔ اٹلی، روس، آسٹریلیا، مصر میں بھی مکھیاں بکثرت پالی جاتی ہیں لیکن ہندوستان و پاکستان میں اس طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ اردو میں جو کتابیں نظر سے گذری ہیں۔ ان کو ادھوری اور ابتدائی کوشش کہنا چاہیئے۔

پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی لاہور کی طرف سے ایک چھوٹی سی کتاب شائع ہوئی تھی۔ ایک اور نامکمل اور مختصر سی کتاب "النحل" ۱۹۱۲ء کی شائع شدہ دستیاب ہوئی جو سید احمد حسین صاحب بی اے بی ایل کی تالیف ہے۔ انگریزی میں اس مضمون پر بڑی ضخیم کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن اردو میں کوئی مبسوط اور باتصویر کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی۔ ۱۹۴۲ء میں لاہور کے ماہر نحل سید مجید قریشی صاحب بی اے علیگ نے اس صنعت کی طرف قدم اٹھایا تھا۔ اب شاید وہ اس کو چھوڑ چکے ہیں

پاکستان کے تمام صوبوں میں اس گھریلو صنعت کو عام کرنے کے لئے اپنی بساط کے مطابق یہ مختصر کوشش ہدیۂ ناظرین ہے۔ اس کی ترتیب میں متعدد کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ میں اپنے مخلص دوست شیخ محمد سعید صاحب ساہنی کا ممنون ہوں کہ ان کے کتب خانہ سے مجھے قابل قدر مدد ملی۔ فجزاہ اللہ۔

(جی کے ملک)

واوحیٰ ربک الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتا و من الشجر و مما یعرشون الخ (۱۶/۶۸)

تمہارے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی کہ پہاڑوں اور درختوں میں اور ان جگہوں میں جو اس غرض کے لئے بلند کر دی جاتی ہیں، اپنے گھر بنا پھر ہر طرح کے پھولوں سے رس چوس پھر اپنے رب کے ٹھہرائے ہوئے طریقوں پر گامزن رہ۔ اس کے شکم سے مختلف رنگ کا رس نکلتا ہے جس میں لوگوں کے لئے شفا ہے۔ بلا شبہ اس بات میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے نشانی ہے۔ (القرآن)

شہد کی مکھی اور شہد کا ذکر الہامی کتابوں میں بھی پایا جاتا ہے جیسے حضرت ایوبؑ کی کتاب، حضرت سلیمانؑ کے مزامیر اور حضرت موسیٰ

کی پانچوں کتابوں میں شہد کا ذکر ملتا ہے حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت مسیحؑ سے کئی سو سال قبل اپنے بیٹوں سے کہا کہ

"تم شاہ مصر کے لئے کچھ شہد بھی بطور تحفہ لیتے جانا"۔ (پیدائش باب ۴۳ آیت ۱۱)

خدا نے موسیٰ علیہ السلام کو بتایا کہ ملک کنعان ایک ایسا ملک ہے جہاں دودھ اور شہد بہتے ہیں خروج ۳:۸ و ۳:۱۷ وغیرہ۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دودھ کی طرح شہد بھی پالتو مکھیوں سے حاصل کیا جاتا تھا۔ وید مقدس میں بھی لفظ مدھو ہے جس کے معنی شہد ہیں۔ قرآن حکیم میں تو اس کا بیان ایک عجیب انداز میں ہے۔ کئی جگہ خلق السموات والارض کی طرف توجہ دلائی ہے۔ آسمان، زمین، پہاڑ، درخت، سورج، چاند، ستاروں کو اپنی نشانیاں فرمایا ہے اور ان میں تفکر و تدبر کی دعوت دی ہے۔ ان کے ساتھ نباتات، حیوانات، طیور اور دیگر حشرات الارض کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ اگر ایک مقام پر اونٹ جیسے بڑے جانور کی خلقت کی طرف نظر کرنے کا حکم دیا ہے تو دوسری جگہ مکھی، مچھر، مکڑی وغیرہ کی بھی مثالیں دی ہیں قرآن حکیم میں بعض سورتیں حیوانوں پرندوں وغیرہ کے ناموں پر مشہور ہیں۔ مثلاً سورۂ بقر (گائے)، سورہ انعام (چوپائے)، سورۃ نمل (چیونٹی)، سورہ عنکبوت (مکڑی)، سورہ فیل (ہاتھی)، سورہ نحل (شہد کی مکھی)، وغیرہ۔ اسی سورہ نحل کے رکوع نہم میں ارشاد ہے:

دودھ | "اور دیکھو ان مویشیوں میں تمہارے لئے غور کرنے اور نتیجہ نکالنے کے لئے بڑی عبرت ہے ہم (خدا) ان کے جسم سے خون اور کثافت کے درمیان دودھ پیدا کر کے تم کو پلاتے ہیں۔ جو پینے والوں کے لئے آسانی سے حلق سے اترنے والا ہے۔ (۱۶/۶۶ و ۲۳/۲۱)

پھل | اور پھلوں میں کھجور اور انگور پیدا ہوتے ہیں جن سے تم نشہ آور عرق اور اچھی غذا دونوں طرح کی چیزیں حاصل کرتے ہو۔ بلاشبہ اس بات میں عقل والوں کے لئے بڑی نشانی ہے۔ (۱۶/۶۷)

شہد | وأوحى ربك إلى النحل أن اتخذي من الجبال بيوتا ومن الشجر ومما يعرشون۔ ثم كلي من كل الثمرات فاسلكي سبل ربك ذللا يخرج من بطونها شراب مختلف ألوانه فيه شفاء للناس إن في ذلك لآية لقوم يتفكرون

(سورۃ نحل آیت ۶۸، ۶۹)

تمہارے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی کہ پہاڑوں اور درختوں میں اور ان چھتوں میں جو اس غرض کے لئے بلند کی جاتی ہیں اپنے لئے گھر بنا پھر ہر طرح کے پھولوں سے رس چوس پھر اپنے رب کے ٹھہرائے ہوئے طریقوں پر کام کرتی رہ۔ اس کے شکم سے مختلف رنگ کا رس نکلتا ہے جس میں انسان کے لئے شفا ہے بلاشبہ اس بات میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے نشانی ہے۔

تشریح | ان آیات میں فرمایا ہے کہ شہد کی مکھی میں محنت اور انتظام سے کام کرنے کی طاقت پیدا کرنا خدا کی وحی سے ہے یعنی اس کی فطرت میں یہ بات "ڈال دی گئی ہے" کہ وہ چھتہ بنائے اور شہد جمع کرے جس طرح انسان کو فجور اور تقویٰ کا الہام کر دیا گیا ہے

——— چنانچہ شہد کی مکھی خوراک کی تلاش میں دور دور تک نکل جاتی ہے اور راستہ نہیں بھولتی مختلف مقامات کے شہد مختلف رنگ کے ہوتے ہیں سفید، زرد، سرخ، سبز، سیاہی مائل وغیرہ اس کی قسمیں بتائی جاتی ہیں۔ شہد مناسب بدرقے کے ساتھ بہت سے امراض میں کام آتا ہے۔ پھلوں کو اس کے ذریعہ دیر تک تازہ حالت میں رکھا جاتا ہے اور اس میں تیار کئے ہوئے معجون مدتوں تک خراب نہیں ہوتے۔

ڈاکٹر غلام جیلانی صاحب برق ایم اے پی ایچ ڈی اپنی کتاب "دو قرآن" میں "تماشائے حشرات" کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ "مغرب کے ایک حکیم مسٹر کیٹی ار لوول (KATIR LOVELL) نے جب قرآن کی یہ آیت دیکھی تو حیرت زدہ ہو گیا کہ عرب کا یہ اُمی (ناخواندہ) فطرت کا کتنا بڑا عالم تھا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"محمد (علیہ السلام) ایک زبردست فرماں روا، مہیب فاتح، بہت ہوشیار و باعلم انسان تھا۔ قرآن سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ وہ فطرت کا شیدائی، مکھیوں کے اعمال کا عالم اور شہد کے اندرونی پہلوؤں سے آگاہ تھا۔ وہ مکھیوں کے گھر بنانے اور مختلف اللون شہد تیار کرنے کا ذکر کرتا ہے۔ یہ علم تلاش و مشاہدہ کائنات کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔" (دو قرآن ص۱۵۱)

سورہ نحل کے اس رکوع کی پہلی آیت میں دودھ کی تعریف ہے، دوسری آیت میں پھلوں کو نعمت بتایا ہے۔ تیسری آیت میں شہد کو شفا فرمایا ہے اور اس طرح ان تینوں نعمتوں کا ذکر اکٹھا دیا گیا ہے۔

یوں تو خداوند تعالیٰ کی نعمتوں کا ہم احاطہ و شمار نہیں کر سکتے۔ وان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا ان الانسان لظلوم کفار۔

حق یہ ہے کہ ان دو آیتوں میں جو ربوبیت الٰہی کا نقشہ کھینچا ہے، ساتھ ہی خدا کی صنعت و حکمت کی کرشمہ سازیوں پر بھی توجہ دلائی ہے اور بہ حیثیت مجموعی یہ دعوت فکر و بصیرت پیدا کرتی ہے۔ فرماتے ہیں تمہاری غذا میں تین چیزیں سب سے زیادہ مفید اور لذیذ ہیں۔ دودھ، پھلوں کا عرق اور شہد۔ تم میں کوئی نہیں جو ان تینوں سے آشنا نہ ہو۔ یہ تمہاری غذا کا جوہر ہے۔ لذت شکم کا ذریعہ اور جسمانی شفا کا نسخہ ہے۔ پھر شہد کے چھتوں کو دیکھو، یہ کارخانے ہیں جو ہمیں تمہارے لئے شب و روز شہد تیار کرتے رہتے ہیں۔ تم دنیا کے سارے پھول اور پھل جمع کر کے چاہو کہ شہد کا ایک قطرہ بنا لو تو کبھی نہ بنا سکو گے لیکن ایک چھوٹی سی مکھی بناتی رہتی ہے اور اس نظم و انضباط، محنت و استقلال، تجسس، تدقیق، ترتیب، اجتماع و اشتراک اور یکسانیت و ہم آہنگی کے ساتھ بناتی رہتی ہے کہ اس کی ہر بات ہماری عقلوں کو درماندہ کر دینے والی اور ہماری فکروں کی ساری توجیہوں اور تعلیلوں پر دروازہ بند کر دینے والی ہے۔ قرآن کے الفاظ پر غور کرو کس طرح معاملہ کی تدقیق

واضح کر دیتے ہیں۔ چوں کہ شہد کی مکھی کی یہ صنعت گری، جدوجہد نظم و انضباط اور سرگرمی و باقاعدگی کا ایک پورا سلسلہ ہے۔ جو عرصہ تک جاری رہتا ہے اور یکے بعد دیگرے بہت سی منزلوں سے گزر کر مکمل ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے کاموں کو "سُبُل" یعنی عمل کی راہوں سے تعبیر فرمایا "فاسلکی سُبُل ربک" اور پھر حوالہ کہ اس بات پر توجہ دلانا مقصود تھا کہ شہد کی مکھی کے لئے جو راہ عمل ٹھہرا دی گئی ہے وہ اسی پر ٹھیک ٹھیک چلتی رہتی ہے کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ ذرا بھی ادھر ادھر ہو اس لئے فرمایا "ذُلُلاً" یعنی حکم الٰہی کے آگے جھکی ہوئی کام کئے جا۔ چنانچہ اس کا ہر فرد حکم الٰہی کے آگے اس طرح جھک گیا ہے کہ ممکن نہیں کسی کو راہ عمل سے منحرف ہوتا ہوا پاؤ۔ یاد رہے کہ جس وقت تک ہندوستان کا گنا دوسرے ملکوں میں نہیں پہنچا تھا۔ میٹھی غذاؤں کے بنانے کا تمام تر دار و مدار شہد ہی پر تھا۔ یا ایسے پھلوں پر جو بہت میٹھے ہوتے ہیں، جیسے کھجور۔ سکندر اعظم جب ہندوستان آیا اور یونانیوں نے یہاں کی قند کھائی۔ تو خیال کیا کہ یہ بلور کی طرح کوئی معدنی چیز ہے جس کا مزہ شہد کی طرح میٹھا ہے۔ غالباً سب سے پہلے عربوں نے ہندوستانی گنے کی کاشت مصر میں کی اور پھر مصر سے "مصری" یورپ پہنچی۔ پس شہد کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لئے کیا گیا ہے کہ دنیا کے اکثر حصوں میں مٹھاس کا مادہ اس کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ نیز یہ محض لذیذ غذا ہی نہیں۔ بلکہ کتنی ہی بیماریوں کے لئے نسخہ شفا بھی ہے۔ (تفسیر ترجمان القرآن ص۲۲۶)

انواع و اقسام

یوں تو شہد کی مکھی کی بہت سی انواع پائی جاتی ہیں۔ لیکن یورپ و امریکہ میں مکھی کی صرف ایک قسم پالنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے اور اس مکھی کا نام ایپس میلفکا (APIS MELLEFCA) ہے۔ ہومیوپیتھک والوں نے اس مکھی سے ایک دوا بھی تیار کی ہے۔

(۱) فلوریا مکھی

(۲) ڈارسٹا مکھی

(۳) انڈیکا مکھی

ان تین قسم کی مکھیوں میں فلوریا سب سے چھوٹی ہوتی ہے۔ یہ مکھی اپنا چھتہ دس سے اٹھارہ انچ گہرا اور آٹھ سے بارہ انچ چوڑا بناتی ہے۔ چھتہ عام طور پر کھلی ہوا میں درختوں کی شاخوں کے نیچے بناتی ہے۔ یہ مکھی خانہ بدوش ہے۔ اس لئے اس کا پالنا مشکل ہے۔ اس کا شہد بھی بہت کم ہوتا ہے۔ سال بھر میں صرف ایک پونڈ شہد چھتے سے نکلتا ہے۔ اور عموماً گرم علاقوں میں یہ مکھی پائی جاتی ہے۔ دوسری مکھی جس کو ڈومنا بھی کہتے ہیں۔ یہ سب سے بڑی مکھی ہے جنگلی اور وحشی ہوتی ہے۔ یہ اپنا چھتہ ایسی جگہ بناتی ہے۔ جہاں انسان بآسانی نہ پہنچ سکے۔ شہد بہت پیدا کرتی ہے۔ بعض اوقات ایک چھتہ میں سے پندرہ سیر

سیر شہد نکالا گیا ہے ۔ یہ مکھی بھی فلوریا کی طرح ایک جگہ قیام نہیں کرتی اور پھرتی رہتی ہے ۔ اور زیادہ زہریلی ہوتی ہے ۔ یہ مکھی پنجاب کے جنگلوں اور پہاڑی علاقوں میں چار ہزار فٹ کی بلندی تک پائی جاتی ہے ۔ اس کو پالنے کے لئے بہت تجربات کئے جا چکے ہیں لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی ۔

تیسری مکھی انڈیکا ہندوستان اور پاکستان کے بعض حصوں میں ہوتی ہے ۔ یہ مکھی اپنا چھتہ درختوں کے سوراخوں اور پتھر کے دراڑوں میں بناتی ہے ۔ اس کو پالنا بہت آسان ہے اور اس کو نقلی چھتوں میں رکھا جا سکتا ہے اور اس وقت بھی بعض مقامات میں پالی جاتی ہے ۔ اس سے آپ پر واضح ہو گیا ہوگا کہ مکھی کی ایک قسم وہ ہے جو پالی نہیں جا سکتی ۔ ان مکھیوں کی مثال جنگلی کبوتروں کی سی ہے ، جو پالے نہیں جا سکتے ۔ اور دوسرے وہ جو گھروں میں پالے جاتے ہیں ۔ بلکہ ان کو سدھا کر نامہ بری کے کام لئے جاتے ہیں ۔ آئندہ صفحات میں جو بیان آئے گا ۔ وہ اس پالتو مکھی کے متعلق ہی ہوگا ۔

مکھی کے اعضاء | شہد کی مکھی کی جسمانی بناوٹ اور اس کے جوڑ بند کو بہت کم لوگوں نے دیکھنے کی کوشش کی ہے ۔ اس لئے یہاں پر اس کا بیان ضروری ہے مکھی کا جسم تین حصوں میں منقسم ہے سر ، سینہ ، پیٹ ۔ یہ تو بڑے حصے ہیں ، جو اور کیڑوں میں بھی ہوتے ہیں لیکن اس کے اعضائے مفردہ کی بناوٹ جداگانہ ہے جو شہد کی مکھی کے لئے مخصوص ہے ۔

مکھی کے سر کے دائیں بائیں دو بڑی آنکھیں ہوتی ہیں اور دو سینگ ، نیچے اوپر دو جبڑے اور دو دانت ہوتے ہیں ۔ ان جفت اعضاء کے علاوہ طاق عضو بھی ہیں اور وہ زبان ، منہ و حلقوم ہیں ۔ سر حواس کا مرکز ہے ۔ سر کے دونوں طرف آنکھیں ہیں مکھی کی آنکھیں ادھر ادھر حرکت نہیں کر سکتیں ۔ ان آنکھوں میں تین ہزار پانچ سو ننھی ننھی پتلیاں ہوتی ہیں ۔ بلکہ زیادہ بھی ہوتی ہیں جس کی وجہ سے مکھی کی قوت باصرہ نہایت تیز اور دوربین ہوتی ہے ۔ یہ ننھی پتلیاں ایسی معلوم ہوتی ہیں کہ قدرت نے بلور کے ریزے جڑ دیئے ہیں ۔ نزدیک کی چیزوں کو مکھی اپنے سینگ سے ٹٹول کر جانتی ہے ۔ مکھی کی دونوں آنکھوں کے اوپر تین چھوٹی آنکھیں اور ہوتی ہیں ۔ اکثر ماہرین علم حیوانات کا خیال ہے کہ یہ آنکھیں خوردبین کا کام دیتی ہیں ۔ سر والی آنکھوں کا تعلق پرواز سے بھی ہوتا ہے ۔ اس مکھی کا قاعدہ ہے کہ پہلے آسمان کی طرف اڑتی ہے اور پھر ایک طرف کو خط مستقیم بناتی ہے ۔ ایک مرتبہ ایک عالم فطرت دان فرش (VON FROSH) جرمنی نے جس کی اسی (۸۰) سالہ زندگی اس مکھی کے حالات زندگی میں غور کرتے گذر گئی چند مکھیوں کے سر پر رنگ چھڑک دیا ۔ تاکہ سر والی آنکھیں بے کام ہو جائیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مکھیاں سیدھی آسمان کی طرف اڑتی گئیں اور ایک جانب خط مستقیم نہ بنا سکیں ۔

عقل حیوانی | قدرت نے ادنیٰ درجہ کے جانوروں کو جو حواس عطا کئے ہیں ، ان کا قیاس کرنا انسان کی سمجھ سے باہر ہے ۔ کیڑے مکوڑوں کی عقل اور ادراک کے اصول سے ہم بالکل بے خبر ہیں ۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ان کو احساس کیوں کر ہوتا ہے اور

وہ کس چیز کو کیا سمجھتے ہیں۔ لیکن جہاں تک دیکھا گیا ہے۔ قدرت نے کیڑوں کی بناوٹ کو سیدھا سادا رکھا ہے۔ اُن کا ایک عضو کئی حواس کا مرکز ہوتا ہے۔ اس کی ساخت علم آلات سازی کے اصول سے حیرت انگیز مطابقت رکھتی ہے۔ ایک ننھا سا عضو کیڑے کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ .. ..

.. .. اکثر سائنس دانوں کی یہ رائے ہے کہ شہد کی مکھی میں کسی طرح کی عقل یا سمجھ نہیں ہے۔ وہ اَور کیڑوں کی طرح کُل کاموں کو عقل حیوانی سے سرانجام دیتی ہے۔ اس کی انوکھی کاریگری جس کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ محض اس کی عقل حیوانی کا نتیجہ ہے۔ مکھی کے اعضا اور اس کے عجیب و غریب جوڑ، بند ہر ایک کام کو اسی طرح کرنے کے لئے موزوں پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن اس کے خلاف دوسرے سائنس دان یہ کہتے ہیں کہ شہد کی مکھی کو قدرت نے غیر معمولی عقل اور سمجھ عطا فرمائی ہے اور اس قول کی تائید میں وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ جس وقت مکھیوں کو کوئی نئی مشکل آ پڑتی ہے تو اس کے حل کرنے میں مکھیاں نہایت دانائی سے کام لیتی ہیں۔ ایک نقل مشہور ہے کہ کسی چھتے کا ایک کنگرہ ٹوٹ گیا۔ یہ دیکھ کر مکھیوں نے اپنا کام بند کر دیا اور چھتہ کی جڑ میں سریش لگانا شروع کر دی۔ اور جب تک چھتے کی جڑ خوب مضبوط نہیں ہو گئی۔ سارا کام بند رہا۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مکھیوں نے ایک حصّے کے ٹوٹ جانے سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ممکن ہے، اس طرح چھتے کی ساری عمارت ٹوٹ کر نہ گر جائے۔ اس لئے فوری مناسب تدبیر کی گئی۔

سینگ | سر کے اگلے حصّے میں سینگ ہوتے ہیں۔ جو سر کے بالکل درمیان سے نکلتے ہیں۔ اُن کے کنارے سریع الحس ہوتے ہیں۔ اور مکھی ان نازک سینگوں سے چھوٹی سے چھوٹی چیزوں کو ٹٹول کر معلوم کر لیتی ہے۔ جب اس کی نظر کام نہیں دیتی۔ اور وہ اُس جگہ نہیں پہنچ سکتی، جہاں جانا ہو تو سینگ اس کی رہنمائی کرتے ہیں۔ وہ ہوا کی نہایت ہلکی لہر یا جھونکے کو بھی محسوس کر لیتی ہے جنہیں ہم اس حواس سے محسوس نہیں کر سکتے۔ مکھی کے سینگ رُخ اور سمت معلوم کرنے کے لئے قطب نما کا بھی کام دیتے ہیں۔ یہ سینگ سر کے دونوں جانب باریک سُوت سے نکلے ہوتے ہیں اور ان میں ننھی ننھی پوریاں ہوتی ہیں۔ ان سینگوں ہی کے ذریعے سے مکھیاں چھتے کی کوٹھڑیوں کی شکل اور اپنے مختلف قسم کے بچوں کی سکونت کے لئے مناسب و غیر مناسب ہونے کو معلوم کرتی ہیں۔ ان ہی کے وسیلے سے نر اور مادہ اور ملکہ مکھی کو معلوم کرتی ہیں اور ایک مکھی دوسری مکھی کے ساتھ نامہ و پیام کر سکتی ہیں۔ غرض کہ مکھیاں اُن سے کام میں مدد لیتی ہیں۔

مسٹر ہیوبر لکھتے ہیں کہ انہوں نے ایک چھتہ کی مکھیوں کو نصف نصف کر کے دو جالیوں میں بند کر دیا۔ ایک میں ملکہ کو رکھا اور دوسرے کو ملکہ سے محروم کر دیا۔ اُن جالیوں میں صرف اس قدر بڑے سوراخ رکھے جن سے مکھیاں اپنے سینگ

داخل کرسکیں۔ جو جماعت ملکہ سے محروم کردی گئی تھی۔ اُس نے فی الفور ملکہ کے رہنے کے لئے مکان بنانے اور ملکہ پیدا کرنے کی تدابیر اختیار کیں مگر جب جالی کا ایک پردہ اٹھا دیا گیا تو ایک حصّہ کی مکھیوں نے دوسرے حصہ کی مکھیوں سے سینگوں کے ذریعہ باتیں کرکے معلوم کرلیا کہ اُن کی ملکہ زندہ ہے۔ اس پر انہوں نے بلا تامل اپنا نیا کام کرو یا اگر کام کرنے والی مکھی کے سینگ توڑ دیئے جائیں اور پھر اُسے اڑایا جائے تو وہ اپنے چھتے کو شناخت نہیں کرسکتی چاہے وہ اس کے پاس ہی پہنچ جائے۔

مُنہ | مکھی کے مُنہ میں بہت سے عضو ہیں اور ان کی بناوٹ نہایت پیچیدہ ہے اور اُن سب کے کام جدا جدا ہیں۔ مثلاً اُوپر کا ہونٹ، نچلا ہونٹ، حلق اور حلق کا ڈھکنا، حلق کے نیچے کا سوراخ۔ زبان، یہ طاق عضو کہلاتے ہیں۔ مکھی کے مُنہ میں دو دانت ہوتے ہیں جو نیچے اوپر، دائیں بائیں ایک دوسرے کے سامنے سیدھ میں برابر ہوتے ہیں۔ مکھی ان دانتوں سے اپنی غذا کو چبانے میں مدد نہیں لیتی۔ یہ دانت چھتے کی عمارت تیار کرنے میں کاٹنے والے اوزار کا کام دیتے ہیں۔ مکھی اپنے دانتوں سے موم کو کترتی ہے اور اپنے تیار کئے ہوئے پیشیش کو جو نہایت لیس دار ہوتا ہے، کاٹ کر چھتہ میں لگا دیتی ہے۔ یہ دانت دونوں جانب کے جبڑوں میں جڑے ہوتے ہیں۔ ان جبڑوں کو مکھی کا قدرتی دست پناہ کہنا چاہیئے جو سخت چیزوں کو ٹکڑے کرنے اور پھولوں کو کاٹ کر سوراخ بنانے میں کام آتا ہے۔ نر مکھی اور ملکہ مکھی کے جبڑوں میں دانت تو ہوتے ہیں لیکن وہ کام نہیں دیتے۔ یہ دانت صرف کارکن مکھی کے ہی ایسے ہوتے ہیں کہ ان ہی سے وہ کوٹھڑیوں کے بنانے میں کام لیتی ہے۔

مکھی کا نچلا ہونٹ لمبا ہوتا ہے۔ یُوں تو وہ سمٹا رہتا ہے لیکن پھول سے رس نکالتے وقت پھیل جاتا ہے۔ اور پھول کی اندرونی تہوں تک سے رس سمٹ لیتا ہے۔ مکھی اس رس کا کچھ حصہ تو پی جاتی ہے اور کچھ غذا کی نالی کے قریب ایک تھیلی میں بھر لیتی ہے۔ چھتے میں پہنچ کر اس رس کو جس پر کچھ کیمیائی عمل بھی ہو چکا ہوتا ہے، خانوں میں انڈیل دیتی ہے۔

زبان | مکھی کی زبان ہاتھی کی سونڈ کی طرح ہوتی ہے اور ہر طرف حرکت کرتی ہے اور سانپ کی زبان کی طرح اندر باہر آتی جاتی ہے۔ اُس کی حفاظت کے لئے اُس پر دوہرا غلاف ہوتا ہے۔ زبان اندر سے کھوکھلی نہیں ہوتی، اس کے دونوں جانب باریک بالوں کی قطاریں ہوتی ہیں جن کی مدد سے مکھی پھولوں کا رس مُنہ میں چڑھا لیتی ہے یعنی زبان کے اوپر کی سطح کے درمیانی حصہ کے ذریعہ اُسے مُنہ کے اندر کھینچ لیتی ہے اور زبان سے ہی موم کو نرم کرکے چھتہ کے قابل بنا لیتی ہے۔ مکھی کی زبان میں کوئی ایسا حصہ ہے جس میں حس ذائقہ پائی جاتی ہے۔ گو مکھی میں ہر چیز کے مزے کو تمیز کرلینے کی قوت موجود ہے لیکن وہ اس کو زیادہ کام میں نہیں لاتی۔ پھولوں کے رس کا ذائقہ خواہ کیسا ہو، لیکن مکھی اس کو شہد بنانے کے لئے ضرور لاتی ہے۔

مکھی جس ذائقہ کا رس لائے گی، اُسی طرح کا شہد تیار ہوگا۔ املی کے پھولوں کا شہد ترش ہوتا ہے مقصد یہ ہے کہ مکھی اپنی غذا کا ذخیرہ جمع کرنے میں کسی خاص ذائقہ کا خیال نہیں رکھتی لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس کو شیرینی زیادہ مرغوب ہے۔

حس شامہ اس میں شک نہیں کہ مکھی کی حس شامہ نہایت تیز ہوتی ہے لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کونسا عضو ہے جو ناک کا کام دیتا ہے۔ بڑے جانوروں کی حس شامہ کا ادراک ناک کے ذریعے سے ہوتا ہے جس سے وہ سانس لیتے ہیں۔ اگر اسی اصول کو لیا جائے تو مکھی کے ناک کا کام اس کے جسم کے سوراخ دیتے ہیں جن سے ہوا اندر داخل ہوتی ہے لیکن تجربہ اس کے خلاف ہے۔ اور یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مکھی کو جس عضو سے حس شامہ کا ادراک ہوتا ہے۔ وہ منہ کے قریب ہے اس لئے کہ اگر مکھی کے منہ کو لئی سے بند کر دیا جائے تو جن چیزوں کی مہک سے وہ نفرت کرتی ہے، ان کو سونگھ لیتی ہے اور یہ انگیختہ نہیں ہوتی۔ اس میں شک نہیں کہ مکھی کی قوت شامہ بلاکی ذکی الحس ہوتی ہے۔ اگر کوئی اجنبی مکھی چھتہ میں گھس آئے تو وہ فوراً پہچان لیتی ہے۔ اگر اس کی جھولی میں شہد بھرا ہو تو مکھیاں اپنے نئے مال دار مہمان کے ساتھ نہایت خلوص اور اخلاق سے ملتی ہیں۔ لیکن اگر اجنبی مکھی کے پاس شہد نہ ہو تو مکھیاں سمجھ جاتی ہیں کہ وہ بھوکی ہے اور شہد چرانے کی فکر میں آئی ہے۔ تو پھر اجنبی کی شامت آجاتی ہے۔

اکثر چیزوں کی مہک کو مکھیاں پسند نہیں کرتیں۔ دھواں تو اُن کے لئے ایک بلا ہے جس سے اُن کا دم گھٹتا ہے اور پریشانی کے عالم میں اپنا چھتہ چھوڑ کر الگ ہو جاتی ہیں۔ نوشادر، کافور، تمباکو اور پیپرمنٹ وغیرہ جیسی چیزوں کی تیز مہک سے مکھیاں حد درجہ نفرت کرتی ہیں۔ اسی حس یا قوت کی تیزی سے وہ یہ دریافت کر لیتی ہے کہ کس پھول میں رس زیادہ ہے۔ جس سے شہد بنتا ہے۔ اگرچہ وہ چھتے سے کتنے ہی فاصلے پر ہوتا ہم وہ اس کی تلاش میں جاتی ہیں۔

البیان —— یہ مضمون اپنے موضوع کے لحاظ سے کافی تشنہ ہے۔ صاحب مضمون مزید تفصیل فرمائیں تو بہتر ہوگا۔

دو قرآن

(جناب معین الملک صاحب)

"دو قرآن" کی اصطلاح علمی حلقوں میں معروف ہوتی ہے۔ اس کے معنی ہیں، اللہ کی قولی شہادت، جو حضرت رسول اکرم کے قلبِ صافی پر وحی کی صورت میں نازل ہوئی۔ قرآنی دفتین میں ہمیشہ ہمیش کے لئے محفوظ ہوگئی۔ اور یہی بنی نوع انسان کی ابدی رشد و ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ اس میں اکمالِ دین اور اتمامِ نعمت کا وعدہ ہے۔ گویا انسان کے روحانی ارتقاء اور ارتفاع کا منتہائے عروج ہے۔ جس طرح ڈاروِن کے قول کے مطابق انسان کا جسمی ارتقاء سامی انسان پر ختم ہوا۔ روحانی ارتقاء بھی سامی نسل کے خیر البشر کی نبوّت پر اپنے نقطۂ کمال کو پہنچا۔ یہ تو ارد مفاجاتی نہیں، بلکہ مشیتِ ایزدی کا مظہرِ اتم ہے۔ یہ "قرآن" کے پاکیزہ نام سے زبان زدِ خلائق ہے۔ دوسرا "قرآن" کی فعلی شہادت ہے۔ جو بیکراں کائنات کی صورت میں جلوہ گر ہے۔ اس میں بھی لاکھوں کروڑوں عبرتیں اور موعظتیں پنہاں ہیں۔ خدا کی "قولی شہادت" یعنی قرآن کریم میں بار بار انسان کی توجہ کو اختلافِ لیل و نہار، تصریفُ الرّیاح، کوہ و کوہسار کے مناظر کی طرف پھیری گئی ہے۔ برق و رعد کی کڑک، شمس و قمر کی گردش، سیارگان کی نقل و حرکت، آسمان کی پہنائیاں، زمین کی وسعتیں بھی خدا کی قدرت کی جلوہ نمائیاں ہیں۔ ان کا بھی کثرت سے کلامِ مجید میں ذکر آیا ہے۔ خدا کے قول و فعل میں عظیم الشان ربط دیکھنے اور اس سے موعظت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان ان "دو قرآنوں" کا بغور مطالعہ کرے۔

"دو قرآن" کی اس علمی اصطلاح کے علاوہ مذہبی رہنماؤں کی گم راہ کُن رہنمائی اور اپنی ذاتی بے عملی سے ایک دوسرے مفہوم کی "دو قرآن" کی اصطلاح پیدا ہوگئی ہے۔ اس بارے میں عوام میں بھی شعور پیدا ہو رہا ہے۔ عوام محسوس کر رہے ہیں کہ علماء اور مشائخ کی اپنی زندگی اُن سے بالکل مختلف ہے یعنی وہ خود ٹھاٹھ سے عالی شان محلوں میں رہتے ہیں۔ لباسِ فاخرہ پہنتے ہیں۔ نعائم اور لذائذ سے محظوظ ہوتے ہیں کاروں میں پھرتے ہیں۔ ہوٹلوں کو نوازتے ہیں۔ پُر شکوہ دعوتیں دیتے ہیں۔ حق آزادی کے تصوّر سے بھی گریزاں رہتے ہیں

ہر موسم کے لئے آرام و آسائش کے سامان بافراط مہیا رکھتے ہیں۔ اپنے اہل و عیال کی اعلیٰ پیمانے پر تربیت کرتے ہیں۔ اپنے سیم و زر کے انباروں سے بطور علامت کے "فی سبیل اللہ" کچھ خرچ کرتے ہیں۔ اس کو وہ اسلام کے عین مطابق سمجھتے ہیں۔ لیکن عوام کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے پیٹ کاٹ کر چندے دیں۔ اس مالی و جانی قربانی کے لئے حضرت رسول اکرمؐ کی ذاتی زندگی کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ ان کو کہا جاتا ہے کہ جب وہ اپنی قوت لایموت کمائیوں میں سے چندہ دیتے ہوئے گرانی محسوس کریں اور عسرت کے تصوّر سے گھبرائیں تو ان کو حضورؐ کی گھر کی زندگی پیش نظر رکھنی چاہیئے۔ اس میں معاشی عسرت نمایاں تھی پیٹ پر پتھر بندھے رہتے تھے۔ اس پر "الفقر فخری" کی حدیث دہراتے نہیں تھکتے۔ اسی پر بس نہیں حضرت شیخین رضی اللہ عنہما کی سادگی اور ایثار کی مثالیں بیان کی جاتی ہیں۔ تاکہ مرید ان باوفا بے توقف اپنے اموال اپنے پیروں کے سپرد کردیں۔ گویا لوگوں کا اپنے مال و منال سے دست بردار ہو کر غربت و افلاس کی زندگی بسر کرنا ہی اسلام کی منشاء کو پورا کرنا ہے۔ ایک "قرآن" وہ ہے جو ملّت اسلامیہ کے احبار و رہبان کو تعیش کی زندگی بسر کرنے کی کھلی چھٹی دیتا ہے۔ ان کے اللّے تللّوں سے خفیف سا تعرض بھی نہیں کرتا۔ ان کی اپنی جائداد میں سے بہت معمولی سا حصہ اسلام کے لئے کافی سمجھتا ہے۔ دوسرا "قرآن" وہ ہے جو عوام سے سب کچھ اسلام کے لئے وقف کرنے کا مقتضی ہے۔

ایک قرآن کی رو سے حضرت رسالت مآب اور خلافت راشدہ کی سادگی صرف عوام کے لئے اسوۂ کاملہ ہے۔ دوسرا قرآن وہ ہے جو مشائخ کی عشرت گاہوں کے جواز کے لئے سلاطین کی زندگی کو نمونہ کے طور پر پیش کرتا ہے۔ مشائخ کے پیدا کردہ ان "دو قرآنوں" سے اسلام میں دو گروہ پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک علماء امراء اور مشائخ کا، جو عمرانی اصطلاح میں زردار طبقہ کہلاتا ہے۔ دوسرے غرباء اور فقراء کا طبقہ جس کو اشتراکیت کی اصطلاح میں پرولتاری طبقہ کہا جاتا ہے۔

اگر یہ ٹھیک ہے اور جیسا کہ علماء اور مشائخ کے عملی رویّہ سے اظہر من الشمس ہے کہ اسلام میں رہتے ہوئے ملّت میں دو قسم کی زندگیاں بسر ہو رہی ہیں اور اس میں اسلام کی تعلیم پر حرف نہیں آتا۔ تو مساوات کس بلا کا نام ہے۔ یہ کیوں ہے کہ رسول اللہ اور خلفاء راشدین کی سادگی صرف عوام کے لئے اسوۂ حسنہ ہو۔ اور علماء اور پیر اس سے مستثنیٰ ہوں۔ پھر اس پر طرّہ یہ کہ جو رسول اللہ کے نقش قدم پر چلے وہ تو مرید ہی رہیں۔ جو سلاطین کے تزک و احتشام کو شعار بنائیں وہ مرشد و رہنما کہلائیں۔ اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ سلاطین کا

جاہ وجلال ہی اسوۂ حسنہ ہے۔ العیاذاً باللہ۔

اسلام کے لئے سب سے بڑا خطرہ ان "دو قرآن" میں مضمر ہے۔ قرآن ایک سیدھا سادہ ہی ہے، جو رسول اللہ پر نازل ہوا، جس کو انہوں نے اور ان کے بعد خلفاء راشدین نے اپنی پاکیزہ، سادہ، بے نفس، پُر ایثار [illegible] زندگیوں میں اپنا کر دکھایا۔ اب جب کہ اسلام معاشی فتنوں سے دوچار ہے۔ اور وہ فتنے پہلے خراب اور منظمین میں سے اٹھتے ہیں جس سے "دو قرآن" کا فتنہ ملی وحدت کے لئے ایٹم بم بن کر رہے گا۔ ایک کمیونسٹ بجا طور پر کہہ سکتا ہے کہ وہ دین ڈھونگ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا جو پیشواؤں اور رہنماؤں کے لئے استحصال اور استیلا کے باب کھولے۔ اس کی تعلیمات کی تعبیروں سے پیر و مرشد تو امیر کبیر بلکہ کروڑپتی اور بڑے بڑے جاگیردار بن جائیں اور ان کے مرید بھوکوں مریں اور بھوکوں مرکر ہی جنت کے حق دار بنیں۔ اس کے برعکس ان کو بھوک کے حوالے کرنے والے عیش وعشرت کی گود میں زندگی کے مزے اڑاتے ہوئے جنت الراضیہ کے وارث بھی ہو جائیں۔ دوسری اقوام میں مذہب کا اثر اسی طریق سے زائل ہوا۔ مسلمانوں میں اسلام کا غلبہ توڑنے والے اور ملت کو معاشی فساد کی آماجگاہ بنانے والے کمیونسٹ نہیں بلکہ وہ پیر و مرشد ہیں، جنہوں نے اپنے عمل سے اسلام کو ڈھکوسلہ بنا کر کمیونزم کا سیدلاغر بنادیا ہے۔

ہمارے احبار و رہبان کا شیوہ بن چکا ہے کہ وہ اپنے غیر دینی مشاغل اور دنیوی اسلوب زندگی کے لئے دینی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح تدریجاً ان اصطلاحات کے وقار کو بھی ختم کر رہے ہیں۔ اپنے مریدوں کی فریب خوردگی کو اپنی قیادت کا کمال سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ کامیاب قائد وہ ہوتا ہے جو متبعین کے ذہن وفکر جلا بخشے۔ جیسا کہ اسلام قرن اول میں رسول اکرمؐ اور ان کے خلفاء راشدین نے کیا۔ لیکن اب تو "دو قرآن" اور "دو اسلام" کا فتنہ ہر طرف پنپ رہا ہے۔ (چٹان)

صفحۂ خاص

اَے اولاد ......

اے اولادِ احمدالدینؒ و مولا بخشؒ! اے اخلافِ شہاب الدینؒ و طالبؒ علی! اپنے مقام و موقف کو سمجھو! تم وہ لوگ ہو کہ تمہارے بزرگوں نے "جاھدوا باموالہم وانفسہم" کی تعمیل کی۔ خدا کے دین کی حمایت میں اپنا وقتِ عزیز، اپنی مساعی جمیلہ اپنا اثر و رسوخ، اپنے دن اور اپنی راتیں اور اپنے اموال و اسباب صرف کئے ـــ اب تک وُہ آنکھیں موجود ہیں، جنھوں نے تمہارے آباء کو اپنے موت کے بستروں پر دین کے لئے تڑپتے ہوئے دیکھا ـــ اب تک وُہ لوگ زندہ ہیں جنھوں نے تمہارے اسلاف کے سروں پر طعن و ملامت اور نفرت و حقارت کے تیروں کی بارش ہوتی ہوئی دیکھی۔ تم خود گواہ ہو کہ انھوں نے دین کے لئے ہر دنیوی عزت اور آسائش کو ٹھکرایا، نام و نمود کو خیرباد کہی، رشتہ و علاقہ کی پروا نہ کی۔

اے اولادِ اتقیا و صالحین! اِس وقت اسلام اَور زیادہ خدمت کا طالب ہے۔ اِس وقت قرآن کی بے کسی پہلے سے زیادہ بلند آواز سے قرآن کے خادموں کو پکار رہی ہے ـــ قیامِ پاکستان سے پہلے اغیار کی رکاوٹیں تھیں، اجانب کے مظالم تھے ـــ اور آج یہ پاک کتاب یہ نُورانی جمال اپنوں کے ہاتھ سے نالاں ہے ـــ خالص اپنوں کے ہاتھ سے!

پاکستان بن گیا لیکن ابھی تک ع

ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہُوا

کیا تم پر سب سے بڑھ کر یہ فرض عائد نہیں ہوتا کہ اپنے بزرگوں کے شروع کئے ہوئے کام کو پورا کرو ـــ اے دوستو! تم ان سے زیادہ دنیا دار نہیں۔ اُن سے زیادہ مصروفِ کار نہیں۔ وہ مسجد کے فارغ البال مُلّا اور خانقاہ کے آرام طلب سجادہ نشین نہیں تھے۔ وہ سب کچھ کرتے تھے، تجارت،

ملازمت، طبابت وغیرہ مصروفیات اُن کے لئے بھی تھیں لیکن وہ ہر مصروفیت سے وقت نکال کر اپنے پیارے مالک اور اس کی عزیز کتاب کی خدمت کرتے تھے۔ بلکہ ان کے دل اسی میں محو رہتے تھے، اور باقی معاملات سے ان کے تعلقات محض سطحی تھے۔ دنیا اُن پر سوار نہ ہو سکی، وہ دنیا پر سوار رہے۔ اور دنیا کے مالک نے عزت و آبرو سے اُن کو انجام بخیر کی سرحد پر پہنچایا ——— اے عزیزو! تم تبلیغ کی اہمیت کو سمجھتے ہو۔ اے جاگنے والو، تمہیں کون جگائے، اے محرمانِ راز تمہیں کون سمجھائے ——— ہم سے وہ منزل دُور نہیں، جہاں ہمارے بزرگ پہنچ چکے ہیں۔ ان کا حقیقی ترکہ، رُپے پیسے نہیں ——— بلکہ یہی علم و تبلیغ کی دولت تھی جو وہ ہمارے لئے چھوڑ گئے۔ اس سے رُوگردانی کر کے ہم کس مُنہ سے انہیں ملیں گے ——— اس کے بعد مجھے اجازت دیجئے کہ مَیں اپنے قلم کا رُخ صاف صاف پشاور، راولپنڈی، گوجرانوالہ، لاہور، گجرات، کراچی کے دوستوں کی طرف کروں، جن کے کان اب تک خواجہ احمد الدین کی آواز کو نہیں بھولے، جن کی آنکھوں کو ابھی وہ نظارہ فراموش نہیں ہُوا جب یہ بزرگ اکٹھے ہوتے اور قرآن کے سوا ان کی مجالس میں کوئی بات نہ ہوتی تھی۔ وہ صرف قرآن کے لئے آپس میں ملتے تھے۔ قرآن کے لئے جیتے تھے، قرآن کو سوچتے، قرآن پر بولتے اور قرآن کی باتیں لکھتے تھے۔

اے اولادِ احمد الدین و مولا بخشؒ[1]!

اے اخلافِ شہاب الدینؒ و طالب علی!

اور اے وہ لوگو جن کے دل میں صرف قرآن کی خاطر ان بزرگوں کی عظمت و محبت موجود ہے ———

اپنے مقام و موقف کو سمجھو! ——— اپنا فرض پہچانو!

الدّاعی:

ایک ذلیل و حقیر تمہارا پرانا خادم

---

[1] یہ بزرگ اس تبلیغی تحریک کی بنیاد رکھنے والے ہیں، جو بلاغ، البیان اور اُمتِ مسلمہ کے نام سے معروف ہے۔ منہ

استفسار

اطمینان[1]

مکرم و محترم مدیر السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

میں لدھیانے کا باشندہ ہوں اور مجددی نقشبندی سلسلے کا ارادت مند ہوں تقسیم ملک سے پہلے میں باقاعدہ جمعہ سرہند شریف جاکر پڑھتا تھا کبھی اضطراراً ناغہ ہوجاتا تو بے اطمینان رخصت ہوجاتا۔ اب لدھیانہ چھوٹا تو سرہند بھی گیا۔ دو سال سے پاکستان میں ہوں۔ کئی شہر بدلے، کئی بزرگوں سے مل کر اپنی پریشانی بیان کی۔ مگر دل کو چین نہیں آتا۔ کچھ دنوں شیخ علی ہجویری (عرف گنج بخش لاہوری) کے مزار پر مقیم رہا۔ تو قدرے سکون ہوا۔ اب پھر وہی حالت ہے۔ اذکار و اوراد کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ کیا آپ اس بارے میں کوئی رہنمائی فرمائیں گے؟ (...... لدھیانوی)

جواب برادر محترم! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ اطمینان دو قسم کا ہوتا ہے۔ خارجی اور داخلی — یعنی اسباب خارجی سے حاصل ہونے والا اور اندر سے پیدا ہونے والا۔ اس کی مثال یوں سمجھیے، ایک تالاب یا حوض پانی سے بھرا ہے۔ یہ پانی کسی نہر یا دریا سے لایا گیا ہے۔ جب تک نہر یا دریا کا تعلق حوض و تالاب سے قائم ہے، پانی ملتا رہے گا، اگر اس تعلق میں کوئی روک پیدا ہوجائے تو حوض و تالاب خشک ہوجائیں گے ع

بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

دوسری طرف ایک چشمہ یا کنواں ہے جن کا پانی ذاتی ہے مستعار نہیں۔ ان میں سے کتنا ہی صرف کرتے جاؤ، نیچے سے اور نکلتا آئے گا۔ ایسے ہی وہ اطمینان جو خارجی اسباب مال، ملک، بیوی، اولاد، احباب وغیرہ سے وابستہ ہے بعض دفعہ ان کے ہوتے ہوئے بھی رخصت ہوجاتا ہے اور ان کی جدائی سے تو ضرور ہی ختم ہوجاتا ہے۔ اور جس اطمینان کا چشمہ اندر سے پھوٹتا ہے وہ امتحانوں سے گذرتے ہوئے بھی پہلی حالت کی نسبت یقیناً سود مند رہتا ہے۔

---

[1] یہ سوال وجواب "فیض الاسلام" راولپنڈی کے لئے لکھے گئے تھے۔ اس میں صاف نہیں چھپ سکے اور البیان کے معیار کے بھی مطابق ہیں۔ اس لئے مسودہ حاصل کر کے یہاں شائع کئے جا رہے ہیں۔ (ادارہ)

اور یہ حاصل ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخلصانہ تعلق پیدا کرنے سے۔ صفاتِ الٰہیہ پر غور کر کے دل میں ان کا یقین پیدا کرنے سے۔ اللہ تعالیٰ کو حکیم و علیم، قریب و مجیب اور سمیع و بصیر جاننے اور ماننے سے ـــ اس کے لئے مشق و مدت اور صبر و استقامت کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد بھی حاصل ہو جائے تو کرشمہ توفیق سمجھنا چاہیئے۔ بڑی چیز کو حاصل کرنے کے لئے بڑی محنت درکار ہے۔ اطمینان سے بڑی کوئی دولت نہیں۔ سب دولتیں اس کے آگے گرد ہیں۔ اگر سب کچھ ملا اور اطمینان نہ ملا تو کچھ نہ ملا۔

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا   یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

اب آئیے اس اطمینان کی طرف جو بزرگوں یا بزرگوں کے مزارات سے حاصل ہوتا ہے ہم مسلمانوں کے نزدیک مخلوقات میں سب سے بڑے بزرگ ہمارے پیغمبرؐ ہیں۔ اللہ پاک آپ کو خطاب فرماتے ہیں:

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ۔ (بقرہ)	جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق سوال کرتے ہیں تو میں (خدا) پاس ہی ہوتا ہوں پکارنے والے کی پکار کو قبول کرتا ہوں، جب بھی وہ پکارے، پس چاہیئے کہ میری بات مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں۔ تاکہ بھلائی پائیں۔

یہ واقعہ اس وقت کا ہے، جب آپؐ اس دنیوی زندگی میں موجود تھے۔ اس آیت سے صاف معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو براہِ راست اپنی ذات سے وابستہ کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے ہی اطمینان بخش قرب سے نوازنے کا ارادہ فرماتے ہیں۔ وہ (تعالیٰ) نہیں چاہتے کہ ان کا بندہ کسی ایسی ہستی سے اپنی امیدیں باندھیں جو ہر وقت اور ہر جگہ اور ہمیشہ اس کے ساتھ نہ رہ سکے۔ خواہ وہ ہستی جلیل القدر پیغمبر ہی کی کیوں نہ ہو ـــ اس نکتے کو قرآن میں اتنی مرتبہ واضح کیا گیا ہے کہ اس کا احاطہ کرنا مشکل ہے صرف ایک جگہ کا حوالہ ادر دیکھ لیجئے ـــ

جنگِ احد کا واقعہ ہے۔ بعض مسلمانوں کی غلطی سے فتح شکست سے بدل گئی ہے۔ حضور صلعم کفار کے نرغے میں گھر جاتے ہیں۔ مسلمانوں میں عجیب ابتری پھیل جاتی ہے اور ایک طرح کی بھگدڑ مچ جاتی ہے یہاں تک کہ حضور صلعم کی شہادت کی افواہ گرم ہو جاتی ہے۔ اس سے کئی مسلمانوں کے ایمان کے قدم لڑکھڑا جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہمارے مولا کریم اس واقعہ کا ذکر کر کے فرماتے ہیں:

ما محمد الا رسول، قد خلت من قبله الرسل ۔ ان قتل او مات انقلبتم علیٰ اعقابکم ۔	محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) رسول ہی تو ہیں۔ آپؐ سے پہلے بہت رسول ہو گزرے ہیں اگر وہ (محمدؐ) قتل کئے جائیں یا وفات پائیں تو کیا تم لوگ پھر کفر و شرک کی طرف لوٹ جاؤ گے۔

اس آیت نے کتنی باتیں سکھائیں۔

۱ ــــ محمد صلعم اللہ تم کا پیغام لانے والے ہیں یعنی اللہ نہیں ہیں۔

۲ ــــ اور پیغام لانے والے پہلے بھی بہت سے ہو گزرے ہیں۔ ان میں سے کوئی ہمیشہ زندہ نہیں رہا۔ لہذا آپ پر بھی آخر دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آکر رہے گا۔

۳ ــــ توکیا جب آپ دنیا میں نہ رہیں گے تو مسلمان اسلام کو خیرباد کہہ دیں گے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اسلام کا انحصار ایک قتل ہو سکنے والے یا مرنے والے انسان پر تھا جب وہ نہ رہا تو اسلام بھی ختم ہو گیا۔

میرے عزیز! ذرائع اور مقصود کا فرق سمجھو۔ انبیاء، اولیاء، کتابیں اور فرشتے ذریعے ہیں، اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل کرنے کے۔ اور یہ ذریعے کمال رحمت سے اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا کئے ہیں۔ پھر یہ ذریعے بدلتے رہتے ہیں اور مقصود اٹل ہے۔ کون نہیں جانتا کہ کتابیں اور نبی بدلتے رہے۔ ایک کے بعد دوسرا، پھر تیسرا، پھر چوتھا، یہاں تک کہ ان کی تعداد ہزاروں لاکھوں تک پہنچ گئی مگر ان سب کا مقصود ایک ہی رہا۔ اس میں کوئی تبدیلی نہ آئی ؎

لِكُلِّ شَيْءٍ إِذَا فَارَقْتَهُ عِوَضٌ   وَلَيْسَ لِلّٰهِ إِنْ فَارَقْتَ مِنْ عِوَضٍ

ہر چیز جس سے تم جدا ہو جاؤ اس کا کوئی نہ کوئی بدل موجود ہے اور اگر اللہ پاک سے جدا ہو جاؤ گے تو اس کا بدل کہیں نہیں پاؤ گے۔

اب تم سمجھ لوگے، بدلنے والی ہستیوں سے بندھا ہوا اطمینان بھی بدلتا رہے گا۔ اس میں ثبات و استقلال قائم نہیں رہ سکتا۔ اس نکتہ کو یوں بھی فرمایا ہے:۔

فتوکل علی الحی الذی لا یموت | اُس ذات بابرکات پر بھروسہ رکھ جو ہمیشہ زندہ اور موت و فنا سے بالاتر ہے۔

بھائی! یہ ہے مسلمان، موحّد کا اصلی مقام۔ اسلام میں برہمنیت اور پادریت کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ اقبالؒ نے کہا ہے:

؎ حائل رہیں کیوں خالق و مخلوق میں پردے   پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو!

افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دینِ روشن کی قدر نہ کی اور پھر وہی پیرانِ کلیسا اپنے میں سے تراش کر خالق و مخلوق کے درمیان حائل کر لئے ــــ ذرا سوچئے تو سہی آپ کو سرہند یا لاہور کے بھاٹی دروازے (مزار ہجویریؒ) سے اطمینان ملتا ہے۔ آپ اس وقت مری میں ہیں۔ اچانک کوئی سخت مصیبت یا مرض آپ پر حملہ کر دیتا ہے جس سے ابھی چھٹکارا نہ ہوا تو آپ کا خاتمہ یقینی ہے۔ لاہور جانے کے لئے دو دن اور دس روپے چاہئیں۔ اور آپ کے پاس وقت ہے نہ روپیہ ــــ اور سرہند کے لئے پرمٹ حاصل کرنا ضروری ہے۔ پھر مزید خرچ مصیبت سر پہ اور (آپ کے زعم میں)

مصیبت دُور کرنے والے سینکڑوں میل دُور ـــ اب بتنے تو کیا بنے ـــ یہ تو وہی "تریاق از عراق" والا قصہ ہُوا۔ کیا اس سے یہ بہتر نہیں تھا۔ کہ حاضر و موجود خدا سے تعلّق جوڑا جاتا، اُن ہی کی رحمتِ واسعہ پر ایمان لایا جاتا! کیا حضرت ہجویریؒ اور حضرت مجدّدؒ سے پہلے دنیا آباد نہیں تھی، اللہ کے بندوں کو اطمینان نہیں ملتا تھا، سورج نہیں چڑھتا تھا، بارشیں نہیں ہوتی تھیں، دعائیں قبول نہیں ہوتی تھیں؟ ـــ وہ پاک ذات جس کے فیوض و برکات ہمیشہ سے بے واسطہ وسفارش جاری تھے۔ کیا اب مجدّد و ہجویری (رحمہا اللہ) کے اندر محدود ہو کر رہ گئی ہے ـــ میرے بھائی کچھ تو خیال کرو، ہم اس قسم۔ کے ہندووانہ عقیدوں میں پھنس کر نورانی اسلام کی عالمگیری سے کتنے دُور ہوتے جا رہے ہیں۔ اسی قسم کا فرضی اور خیالی اطمینان ہے جو بُت پرستوں، درخت پرستوں، گاؤ پرستوں دریا پرستوں، کوہ پرستوں وغیرہ کو حاصل ہوتا ہے اور وہ اس کے حصول کے لئے بڑی بڑی بے معنی مشقتیں اٹھاتے ہیں۔ پُرصعوبت اور خطرناک پہاڑی اور صحرائی سفر کرتے ہیں۔ ہزارہا روپیہ برباد کرتے ہیں۔ یاد رکھو جو شخص دُکھ کے وقت کہتا ہے "کاش اس وقت ماں ہوتی! فلاں دوست ہوتا، کوئی بیٹا ہوتا، دولت ہوتی یا فلاں حضرت صاحب قریب ہوتے" ایسے شخص نے اپنے اللہ کو نہیں پہچانا۔ اللہ کی قدر نہیں کی (مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ) فرض کرو، اگر یہ سب عزیز و شفیق اکٹھے ہی ہمارے دُکھ کے وقت ہمارے پاس جمع ہو جائیں تو ہمارے تائی فائدہ یا کسی اَور مرض کو دُور کرنے کی قدرت۔ رکھتے ہیں؟ پھر بھی تو اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر نہ کوئی ہم دردی مفید ثابت ہو سکتی ہے اور نہ کوئی دوا اثر کر سکتی ہے۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ اُمرا و سلاطین، اطبا و حکما سب سہولتوں اور ساری دانائیوں کے ہوتے ہوئے بے چین بھی ہوتے ہیں۔ بیمار بھی پڑتے ہیں غیر طبعی موت مر بھی جاتے ہیں؟ پھر یہ بھی تو ہے کہ حضرت مجدّد و ہجویری (رحمہا اللہ) کی ساری تصانیف پڑھ جائیے۔ اُنہوں نے اطمینان حاصل کرنے کا یہ طریقہ کہیں نہیں لکھا، جو اُن کے غلط عقیدت مندوں نے ایجاد کر لیا ہے۔ وہ خود اللہ تعالیٰ کے نہ ختم ہونے والے خزانے سے اطمینان حاصل کرتے تھے اور اُسی کی طرف اپنے ارادت مندوں کو دعوت دیتے تھے۔ اُن کی کتابیں موجود ہیں، پڑھو اور میری بات کی تصدیق کرو ـــ پس بزرگوں کے طریقے پر چلو، اللہ تعالیٰ سے لَو لگاؤ۔ قرآن مجید کو بہت غور سے سمجھ سمجھ کر پڑھو اور اس پر ممکن حد تک عمل کرو۔ اللہ کا ذکر کثیر کرو اور یہ سمجھ کر کہ وہ میرے محب و محبوب (تعالیٰ) ہیں، مجھ سے کبھی جدا نہیں ہو سکتے۔ جب بھی مَیں انہیں یاد کرتا ہوں، وہ مجھے یاد کرتے ہیں۔ بالفرض اگر اللہ تعالیٰ نے صرف مجھ کو بنایا ہوتا میرے سوا اَور کوئی مخلوق نہ ہوتی۔ وہ مجھ اکیلے کے رب، رحمٰن، رحیم اور وَدُود (محبت کرنے والے) ہوتے۔ ان کی توجہ و عنایت کا مرکز تنہا مَیں ہی ہوتا ـــ تو اس وقت اُن (تعالیٰ) کا جو بھرپُور تعلق مجھ سے ہوتا، یقین کرو کہ اتنی بے شمار مخلوق بن جانے کے بعد بھی مجھے ان کا اتنا ہی پیار اور دھیان حاصل ہے۔ جتنا اس وقت ہوتا۔ اس میں قطعاً کوئی کمی نہیں آئی (مَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا) تیرے رب میں دھیان بٹ جانے اور بھُولنے کا عارضہ ہے ہی نہیں۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

(ادارہ)

ادبیات

دوست تیرا آستاں

میری امیدوں کا مرکز، آرزوؤں کا جہاں   میری اقلیم تمنا، میرا فردوس جناں
قلعۂ حفظ و اماں، دوست تیرا آستاں،

علم کھو دیتا ہے جس میدان میں تاب و تواں   عقل گر پڑتی ہے جس منزل میں ہو کر نیم جاں
عشق ہوتا ہے جواں، دوست تیرا آستاں

مکتب عشق و ارادت، درس گاہِ سوز و ساز   محفل ناز و تجلّی، مرجع عجز و نیاز
جنتِ روح و رواں، دوست تیرا آستاں

سو کے رہ جاتی ہیں آغوشِ فنا میں کلفتیں   جاگتے ہیں خفتہ ارماں اور مُردہ حسرتیں،
زندہ ہوتی ہیں جہاں، دوست تیرا آستاں

عالم انجم سے آگے، ماورا افلاک سے   دُور ہر اک فہم سے مستور ادراک سے
بے نشانی کا نشاں، دوست تیرا آستاں

تھا سرِ پُر شور ادھر سودائی لات و ہبل   اور پائے شوق اُدھر آوارۂ دشت و جبل
کنج دل میں تھا نہاں، دوست تیرا آستاں

کون سی آواز ہے جس میں نہیں تیرا پیام؟   کون سی درگاہ ہے جس میں نہیں تیرا مقام؟
یہ زمیں یہ آسماں، دوست تیرا آستاں

تو گلستاں در گلستاں، تو چمن اندر چمن   مہر و مہ میں جلوہ گر، ارض و سما میں ضوفگن،

ذرّے ذرّے سے عیاں، دوست تیرا آستاں

عالمِ غیب و شہادت، ساحتِ نزدیک و دُور جلوتِ عشق و تمنا، خلوتِ وصل و حضور

جس جگہ جائیں وہاں، دوست تیرا آستاں

سرمدی مے، دائمی گل بانگ، لافانی رباب لم یزل نشہ، دوامی کیفیت، باقی شراب

اک سرورِ جاوداں، دوست تیرا آستاں

ولولوں کی زندگی، افکار کی تابندگی عشق کی پائندگی، احساس کی زندگی

دوستی کی داستاں، دوست تیرا آستاں

کون سی آواز ہے، جس میں نہیں تیرا پیام؟ کون سی درگاہ ہے جس میں نہیں تیرا مقام؟

یہ زمیں، یہ آسماں، دوست تیرا آستاں

اشکِ معصومی کا یاور، ناتوانوں کی سپاہ آہِ مظلومی کا حامی، بے پناہوں کی پناہ

بے پروں کا آشیاں، دوست تیرا آستاں

عالمِ اسباب کی پہنائیوں کو چیر کر بزمِ جلوہ کی حجاب آرائیوں کو چیر کر

مَیں نے پایا ناگہاں، دوست تیرا آستاں

جب بھری محفل سے دنیا کی اٹھایا جاؤں مَیں اور حریمِ قدس میں تیرے بلایا جاؤں مَیں

ہو مرا وردِ زباں، دوست تیرا آستاں

دوست تیرا آستاں

آستاں نشیں

عرشی

اطلاع

خط و کتابت و ترسیل زر مندرجہ ذیل
پتوں پر کیجئے:

خط و کتابت

ادارہ البیان مع القرآن، نسبت روڈ، لاہور

ترسیل زر

ڈاکٹر قاسم حسن صاحب، ۴۴ نسبت روڈ، لاہور

قمر الدین قریشی، پرنٹر و پبلشر نے کپور آرٹ پرنٹنگ پریس لاہور
میں چھپوا کر دار القرآن ۲ گیتا بھون لیٹن روڈ
لاہور سے شائع کیا۔

الرحمٰن علّم القرآن خلق الانسان علّمه البیان

گر تو می خواہی مسلمان زیستن

نیست ممکن جز بقرآن زیستن

البیان

مرتب

قمر الدین قمر

(لاہور)

جلد ۱ | ربیع الاول ۱۳۶۹ھ مطابق جنوری ۱۹۵۰ء | نمبر ۵

فہرس

		صفحہ
شذرات	ادارہ	۳
حساب دوستاں	ادارہ	۴
مقالات		
[illegible]	مولانا سید جعفر شاہ صاحب	۵
مذاکرہ علمیہ	بزمی	۹
ظن کے اصطلاحی معنی اور اس کا افسوسناک مغالطہ	مولانا تمنا عمادی پھلواروی	۱۹
دعوۃ الرسل	پروفیسر مولوی عبدالرحیم صاحب پشاور	۵۱

سالانہ پانچ روپے — فی پرچہ آٹھ آنے

شذرات

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْن

فرشتہ کہ وکیل است بر خزانۂ باد — چہ غم خورد کہ بمیرد چراغ بیوہ زنے

پاک ائیرویز کے طیارے کا حادثہ اور علامہ شبیر احمدؒ صاحب عثمانی کی وفات پچھلے مہینے کے دو ایسے واقعات ہیں جن سے پاکستان کی قوت، و علم کو زبردست دھکا لگا ہے۔ میجر جنرل افتخار اور بریگیڈیر شیر خاں ایسے کار آزمودہ اور بہادر جرنیلوں کے اٹھ جانے سے پاکستان کی بنتی ہوئی فوجی طاقت میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اسے ملک کے ہر گوشے میں شدت کے ساتھ محسوس کیا جا رہا ہے۔ اہل پاکستان کا کوئی طبقہ ایسا نہیں جو اپنے غمگین جذبات کے ساتھ قوم کے ان بہادر جرنیلوں کو خراج تحسین ادا نہ کر رہا ہو۔ قوم کے یہ جذبات اس بات کا کامل ثبوت ہیں کہ میجر جنرل افتخار اور بریگیڈیر شیر خاں مرے نہیں بلکہ زندہ ہیں۔ انہوں نے اپنے عمل سے کشت ملت کو جو نمی بخشی ہے وہ اس زمین کو ہمیشہ زرخیز بناتی رہے گی اور جو بیج انہوں نے بویا ہے اس کا پھل اُن کی تمناؤں اور ہماری امیدوں کے مطابق ہوگا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کو پاکستان کے عوام کی نگاہوں میں جو مقام حاصل تھا محتاج بیان نہیں۔ کون نہیں جانتا کہ علامہ مرحوم کی ذات گرامی سارے ملک کے اندر ایک مخصوص زاویہ نگاہ کا مظہر تھی۔ اگرچہ پاکستان کے اقتدار اعلیٰ میں انہیں عملی طور پر وہ اثر و نفوذ حاصل نہ ہو سکا جو ان کے مقام کے شایاں تھا۔ تاہم انگریز زدہ فضا میں مجازی بیت المقدس (پاکستان) کی تعمیر کے وقت ان کا وجود غولان سیاست کے سر پر حضرت سلیمان کے روائتی ڈھانچے سے کم نہ تھا۔ اس وقت جب کہ ہماری اسلامی ریاست کا آئین زیر تدوین ہے اور مشاورت کے لئے استادان یورپ بلائے جا رہے ہیں اور اسلامی دنیا میں راسخون فی العلم کا پورا قحط ہے۔ صرف علامہ مرحوم کی ذات ہی آئین کی تشکیل میں اسلامی اقدار کی محافظ خیال کی جاتی تھی۔ قرار داد مقاصد کے سر سے علامہؒ کا سایہ اٹھ جانے کے بعد کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ہماری امیدیں کہاں تک پوری ہو سکیں گی۔ (قمر)

حساب دوستاں

آمد

تفصیل	رقم
سابقہ بقایا	۳۹۲-۲-۰
حکیم محمد حسین عرشی صاحب	۱۰-۰-۰
غلام محمد خانصاحب ٹینا کوٹ شکر گڑھ	۳-۰-۰
پروفیسر شبیر محمد صاحب لاہور	۵-۰-۰
عبدالرحمٰن صاحب بازاکیسری لاہور	۵-۰-۰
ڈاکٹر سعید اللہ صاحب لاہور	۵-۰-۰
چودھری عبدالرحمٰن بٹ گوجرانوالہ	۱۰-۰-۰
شیخ محمد ابراہیم صاحب سب جج مظفر گڑھ	۵-۰-۰
چودھری ولی محمد صاحب سرکاری وکیل	۵-۰-۰
خان عبدالحق خانصاحب وکیل	۵-۰-۰
ڈاکٹر ثواب علی صاحب سمندری	۵-۰-۰
حکیم اقبال حسن و مولوی عبدالعزیز صاحبان	۱-۰-۰
خواجہ غلام محمد صاحب نسبت روڈ لاہور	۵-۰-۰
معرفت کریم بخش صاحب سکھانی کراچی	۱۹-۱۴-۰
محمد حسین صاحب گجرات	۵-۵-۰
معین الدین احمد صاحب کراچی	۲-۸-۰
ڈاکٹر میر محمد شریف صاحب سانگلہ	۱۲۰-۰-۰
میاں حبیب اللہ صاحب ریاست خیرپور	۵-۰-۰
مالک تاج انجینئرنگ ورکس لاہور	۵-۰-۰
شیخ محمد سعید صاحب ساہنی پورٹ ہاؤس سرگودھا	۵-۰-۰
میزان	۶۲۹-۱۳-۰

خرچ

تفصیل	رقم
اجرت کتابت رسالہ البیان ماہ دسمبر ۱۹۴۹ء ۶½ کاپی	۶۴-۸-۰
خرید کاغذ برائے البیان ماہ دسمبر ۱۹۴۹ء	۲۷-۱۱-۰
مزدوری	۰-۵-۰
چھپائی رسالہ البیان ماہ دسمبر ۱۹۴۹ء	۴۲-۰-۰
اجرت بائنڈنگ	۳-۱۱-۰
میزان	۱۳۸-۳-۰
بقایا	۴۹۱-۱۰-۰

جن اصحاب کی رقوم حساب میں درج نہیں ہیں وہ ناظم اُمّت مسلمہ کو "دارالقرآن نسبت روڈ۔ لاہور" کے پتے پر مطلع فرمائیں۔ (۳۱ دسمبر ۱۹۴۹ء)

(ادارہ)

مقالات

درسِ قرآن

(از مولانا محمد جعفر شاہ صاحب)

والعصر ه ان الانسان لفی خسر ه الا الذین آمنوا و عملوا الصالحات و تواصوا بالحق و تواصوا بالصبر ه	زمانے کی قسم انسان گھاٹے میں ہے۔ بجز اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور صالح عمل کئے اور باہم سچائی اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔

ہم نے لفظی ترجمہ تو پیش کر دیا ہے۔ لیکن اس چھوٹی سی سورت میں کئی مقامات ایسے ہیں جن کی تشریح ضروری ہے۔ پہلی چیز ہے والعصر اس کے لفظی معنی ہیں زمانے کی قسم۔ قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ قسم یقیناً اس طرح کی نہیں جس طرح کی قسمیں انسان کھایا کرتے ہیں انسان اس وقت قسم کھاتا ہے جب وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ مخاطب کو میری بات کے سچ ہونے میں شک ہے لہذا اسے کسی طرح یقین دلانا چاہیئے کہ میری بات سچی ہے۔ پھر وہ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ میری بات اگر سچی نہ ثابت ہوئی تو میرا کچھ نقصان ہے اور اگر سچ ثابت ہو جائے تو کچھ فائدہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالےٰ ان باتوں سے بے نیاز ہے ہمیں اگر اس کی باتوں کا یقین ہو تو ہمارا اپنا فائدہ ہے۔ اور اگر شک ہو تو نقصان بھی اپنا ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بڑی سے بڑی چیزوں کی بھی قسم کھائی ہے اور چھوٹی سے چھوٹی چیزوں کی بھی۔ کہیں ہے "وربک" تیرے رب کی قسم۔ اور کسی جگہ ہے والتین والزیتون انجیر کی قسم۔ قسم عظمت و عزت والی شے کی کھائی جاتی ہے یا محبوب ترین چیز کی۔ اب سوچئے کہ انجیر یا زیتون اللہ کی نگاہ میں کون سی ایسی قابل احترام یا لائق محبت چیز ہے جس کی وہ قسم کھاتا ہے ؟۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ خدا کا قسم کھانا بندوں کے قسم کھانے سے بالکل مختلف چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی چیز کی قسم کھاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اس چیز کو بطور گواہ و ثبوت کے پیش فرما رہا ہے۔ اس چھوٹی سی سورت کو دیکھئے۔ دعویٰ یہ ہے کہ انسان سراسر گھاٹے میں اور نقصان میں ہے بجز ان کے جو ایمان و عمل صالح رکھتے ہوں اور حق پرستی کی، اور راہ حق میں ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہتے ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ایک ایسی سچی حقیقت ہے جس سے زیادہ سچی اور کوئی حقیقت نہیں ہو سکتی۔ اس سچی حقیقت پر اللہ نے جس چیز کی شہادت پیش کی ہے

وہ ہے العصر، یعنی زمانہ۔ مطلب یہ ہے کہ زمانہ گواہ ہے اور زمانے کی پوری تاریخ گواہ ہے۔ اور زمانے کے ہر دور میں اُمتوں کے عروج و زوال کی داستان اس حقیقت پر گواہ ہے کہ دنیائے انسانیت ہمیشہ نقصان ہی اٹھاتی رہی ہے۔ اگر اس نقصان سے کوئی بچ سکا ہے تو یہ صرف وہ لوگ ہیں جن کے دل میں یقین محکم، عمل میں صداقت، زبان پر تلقینِ حق اور آزمائش کے وقت صبر و استقامت رہی ہے۔ پھر دیکھئے بُرے انجام، خسران اور نامرادی سے محفوظ رہنے کے لئے کیا صفات درکار ہیں۔ چار چیزیں، چار شرطیں اور چار صفتیں مطلوب ہیں۔ پہلی صفت آمنوا وہ ایمان و یقین رکھتے ہوں۔ دوسری چیز وعملوا الصّٰلحٰت ان کا کردار اس یقین کے مطابق ہو۔ تیسری بات وتواصوا بالحق ایک دوسرے کو سچائی کی تلقین کرتے ہوں چوتھی شرط وتواصوا بالصبر اس سچائی پر ثابت قدم رہنے کی بھی ایک دوسرے کو تلقین کرتے ہوں۔ یہ چاروں صفتیں اگرچہ الگ الگ حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن ایک دوسرے سے ایسی جڑی ہوئی ہیں کہ ان کو جدا جدا کرنے کے بعد کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ یعنی نہ محض ایمان کوئی چیز ہے نہ محض عمل نہ فقط تلقینِ حق کوئی شے ہے نہ صرف تلقینِ صبر۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ چاروں اجزا ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں اور ایک دوسرے کا نتیجہ ہیں۔ کسی حد تک اس کی مثال دی جا سکتی ہے کہ جیسے ایک درخت کے مختلف اجزا ہوتے ہیں جڑ۔ تنہ۔ شاخیں اور برگ و بار۔ جڑ ٹھیک ہوگی تو تنہ اور شاخیں وغیرہ بھی نکلیں گی اور برگ و بار بھی پیدا ہوں اور اگر صرف جڑ ہی جڑ ہو تو بے نتیجہ اور بے فائدہ ہے۔ اس سے کوئی پھل نہیں مل سکتا۔ اور اگر محض شاخیں اور پتے جمع کر لئے جائیں تو ان سے پھل نہیں مل سکتے پھل کے لئے ضروری ہے کہ درخت کے جڑ سے لے کر پھنگ تک تمام اجزا موجود ہوں۔ باہم مربوط ہوں یعنی باہم ملے ہوئے اور ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوں اور تمام اجزا صالح ہوں۔ ٹھیک اسی طرح سمجھئے کہ ایمان و یقین جڑ ہے۔ عمل صالح اس کا مضبوط تنہ ہے۔ تلقینِ حق اور تلقینِ صبر اس کی ہری بھری شاخیں ہیں اور اس کا پھل ہے اس خسران و نقصان سے محفوظ رہنا جس میں دنیائے انسانیت ہر دور زمانہ میں گھری رہتی ہے۔ اگر صرف ایمان ہی ایمان ہو اور اس ایمان کے مطابق عمل نہ ہو تو وہ ایمان کوئی مفید چیز نہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے بہت صحیح فرمایا ہے کہ ایمان بغیر عمل کے مردہ ہوتا ہے۔ اگر ہم کسی طبیب پر پورا ایمان و یقین رکھیں کہ یہ نہایت ہی حاذق طبیب ہے۔ تشخیص کمال کا ہے۔ نسخے کی تجویز میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ تو کیا محض اس یقین اور اس خوش اعتقادی یا محض طبیب کی تعریفوں سے ہمارے مرض کا ازالہ ہو جائے گا؟ ہرگز نہیں۔ طبیب سے ہماری خوش اعتقادی اسی وقت مفید ہو سکتی ہے جب ہم اس کے بتائے ہوئے نسخے پر عمل کریں اور اس کے بتائے ہوئے پرہیز

پر قائم رہیں۔ اسی کو کہتے ہیں عمل صالح۔ عمل صالح سے مراد صرف وظائف کا پابند ہونا یا محض چند نیکیاں کر لینا نہیں،
بلکہ اس سے مقصد یہ ہے کہ مومن جس نظریے پر ایمان لایا ہے اس کی زندگی عین اسی کے مطابق ہو یعنی ایمان
ایک سانچہ ہے اور عمل ایک ڈھلا ہوا سکہ۔ جب اس سکے کو سانچے میں ڈالا جائے تو پوری طرح اس میں فٹ ہو جائے۔ نہ اتنا
بڑا ہو جو داخل ہی نہ ہو سکے اور نہ اتنا چھوٹا ہو کہ جگہ خالی رہ جائے۔ اس کی مزید وضاحت کے لئے یوں سمجھئے کہ ایک
شخص کمیونزم (اشتراکیت) پر ایمان رکھتا ہے یعنی اسے یہ یقین ہے کہ اشتراکیت صحیح نظریۂ زیست ہے اور اسی
سے سرمایہ داری فنا ہو کر انسانی مساوات قائم ہو سکتی ہے اس کا عقیدہ (ایمان) تو یہ ہو لیکن عمل یہ ہو کہ وہ خود سرمایہ
دار ہو اور مزید سرمائے کی دھن میں لگا رہتا ہو تو اشتراکی نقطہ نظر سے یہی کہا جائے گا کہ اس کا عمل صالح نہیں یعنی
جس اشتراکیت پر یہ ایمان لایا ہے۔ اس ایمان کے سانچے میں اس کا طرز عمل فٹ نہیں بیٹھتا۔ امنوا وعملوا الصلحت
میں بھی عمل صالح سے یہی مراد ہے کہ جب اس عمل کو ایمان کے قالب پر چسپاں کیا جائے تو پوری طرح فٹ آ جائے
غرض ایمان کے ساتھ عمل صالح نہیں خواہ بے عملی ہو یا غلط عمل۔ تو نہ ایمان محض ظاہری خوش عقیدگی ہے جو چنداں مفید
نہیں۔ اب رہا عمل تو جس طرح ایمان بغیر عمل کے مردہ ہے اسی طرح عمل بغیر ایمان کے بالکل بے معنی، بے نتیجہ
غیر مفید اور غیر صالح ہے۔ عمل کی ظاہری شکل خواہ کیسی ہی حسین اور فٹ نظر آتی ہو۔ لیکن وہ کریہہ اور ان فٹ ہے۔
اگر ایمان سے خالی ہو۔ ایسا عمل ایک ایسی سرسبز ٹہنی سی ہے جس کو ابھی توڑ کر لایا گیا ہو اور درخت سے اب اس کا کوئی
تعلق باقی نہ رہا ہو۔ ایسی ٹہنی دیکھنے میں تو بالکل ویسی ہی ہری بھری ہوگی۔ جیسے درخت سے لگی ہوئی دوسری
شاخیں۔ لیکن اس سے پھولوں کی امید لگانا، ثمر کی توقع رکھنا سب سے بڑی غلطی ہوگی۔ ایسے ہی اعمال کے متعلق خداوندی
ارشاد ہے کہ فلا نقیم لهم یوم القیامة وزنا۔ آخرت میں اس کا کوئی وزن نہ ہوگا۔ پس ایسے اعمال جن
کا تعلق ایمان سے نہ ہو کبھی صالح نہیں ہو سکتے خواہ ان کی ظاہری شکل کسی قدر اعمال صالح سے ملتی ہو۔ کسی عمل کے
صالح ہونے کی تین شرطیں تو ایسی ضروری ہیں کہ ان میں ایک کی عدم موجودگی بھی عمل کو غیر صالح بنانے کے لئے کافی ہے
پہلی شرط یہ ہے کہ حکم خداوندی کے مطابق ہو۔ دوسرے حکم الٰہی کے ماتحت ہو۔ تیسرے مقصد صرف رضائے الٰہی ہو۔ مثال
سے بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ فرض کیجئے۔ ایک شخص نے طلوع فجر سے آدھ گھنٹہ پہلے روزہ رکھ لیا۔ اور غروب
آفتاب سے آدھ گھنٹہ پہلے ہی افطار کر لیا۔ کیا اس کا روزہ ہو گیا؟ نہیں، کیوں؟ اس لئے کہ اگرچہ اس نے روزے
کا وقت پورا کر لیا۔ دوسری شرطیں بھی پوری کر لیں مگر اس کا روزہ حکم الٰہی کے مطابق نہ ہوا۔ لہذا یہ روزہ عمل صالح بھی نہ
ہو۔ دوسری شرط کی مثال دیکھئے۔ ایک مریض کو طبیب مشورہ دیتا ہے کہ آج صبح سے شام تک اسے کچھ نہ دیا جائے

مریض سارا دن بھوکا پیاسا رہتا ہے اور طلوعِ فجر سے غروبِ آفتاب تک وہ اپنا وقت پورا کر لیتا ہے۔ کیا آپ اسے روزہ کہیں گے؟ نہیں، بیفاقہ تو ہوا لیکن روزہ نہ ہوا۔ اس لئے کہ اس نے یہ عمل حکمِ الٰہی کے ماتحت ہو کر نہیں کیا بلکہ طبیب کی ہدایت کے ماتحت کیا۔ پس یہ عمل بھی عمل صالح نہ ہو گا خواہ جسمانی حیثیت سے کسی قدر مفید ہو۔ تیسری شرط کی مثال ملاحظہ فرمائیے ایک قیدی صبح سے شام تک روزے کا پورا وقت بھوک ہڑتال (HUNGER STRICKE) میں گزار دیتا ہے۔ کیا اسے روزہ قرار دیا جائے گا؟ کبھی نہیں! کیونکہ مقصد خدا کی خوشنودی نہیں۔ بلکہ صرف دھمکی یا اظہارِ رنج ہے۔ دیکھئے یہ ساری شکلیں بظاہر روزے کی سی ہیں لیکن ان میں روزہ ایک بھی نہیں۔ ایسے فاقوں سے اور ہزار طرح کے فائدے ہوں، ہمیں اس سے بحث نہیں۔ لیکن اس عمل کو بہر حال عمل صالح نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ایمان اور اس کے تقاضوں سے خالی ہے۔ عمل صالح کی جو تین اہم شرطیں بیان کی گئیں وہ ایمان سے کوئی الگ شے نہیں بلکہ ایمان ہی کے تقاضے ہیں۔ ایمان ہو گا تو جب ہی عمل خدائی حکم کے مطابق ہو گا۔ ایمان ہو گا تو جب ہی عمل خدائی حکم کے ماتحت ہو گا۔ ایمان ہو گا تو جب ہی عمل کا مقصد صرف رضائے الٰہی ہو گا۔ جن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ان میں سے کسی ایک چیز کا بھی انکار کر لینے کے بعد عمل کبھی صالح نہیں رہ سکتا۔ اللہ ہو یا کوئی رسول، فرشتے ہوں یا کوئی کتاب آسمانی۔ قیامت ہو یا سزا و جزا۔ ان میں سے کسی شے کا انکار ہر عمل کو غیر صالح بنا دیتا ہے خواہ اس کی ظاہری شکل و صورت عمل صالح سے کسی قدر بھی مشابہ ہو کھرے اور کھوٹے سونے کی ظاہری چمک دمک میں خواہ کتنی ہی مشابہت پائی جائے۔ لیکن کھرا کھرا رہے گا اور کھوٹا کھوٹا۔ یہ ضرور ہے کہ اگر منکر و ملحد کسی غریب کی مالی مدد کرے تو ہم اسے کنجوس ملحد سے بہتر سمجھیں گے جو ایک پائی سے بھی کسی غریب کی مدد نہیں کرتا۔ اس کو اس فیاضی کی وجہ سے دنیا میں خوش حالی کا اجر ملنا بھی ممکن ہے، لیکن عمل، بہر حال غیر صالح ہی رہے گا۔ اور آخرت میں اس کا قطعی کوئی وزن نہ ہو گا۔ باغی کتنا ہی نیک عمل رکھتا ہو وہ مقبول نہیں ہو سکتا۔

ہم مسلمانوں کو بھی خصوصاً اس پاکستان میں اپنے ایمان اور عمل دونوں کا جائزہ لینا چاہیئے۔ اگر ایمان بغیر عمل کے ہے تو مردہ اور بے سود ہے۔ اگر عمل بغیر ایمان کے ہے تو غیر صالح اور نامقبول ہے۔ پاکستان ایک مضبوط اسلامی سلطنت اسی وقت بن سکتا ہے جب ہمارے بڑے چھوٹے سب ایمان و عمل صالح سے آراستہ ہوں۔

مذاکرۂ علمیہ

قائداعظم فنڈ

ہمارے ایک محترم مشورہ دیتے ہیں کہ "قائداعظم فنڈ" کا صحیح مصرف یہ نہیں کہ اسے غربا و مہاجرین پر صرف کیا جائے۔ بلکہ اس کا بہترین مصرف یہ ہے کہ اس کی مدد سے پاکستان کو غیر ملکی افسروں سے پاک کیا جائے۔ اور تمام محکموں کی کلیدی اسامیوں کے لئے پاکستانی نوجوان تیار کئے جائیں۔ مسلمانوں میں بہت سے نوجوان ایسے نکلیں گے جو مخصوص علوم و فنون میں اعلےٰ درجے پر پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ لیکن حالات کی ناموافقت کے سبب پنپ نہیں سکتے۔ حکومت کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ ان کے لئے آگے بڑھنے کے سامان مہیا کرے جو نصف خرچ خود برداشت کر سکتے ہیں۔ ان کو نصف مہیا کیا جائے۔ اور جو بالکل تہی دست ہیں، ان کا پورا بوجھ قائداعظم فنڈ پر ڈالا جائے"

ہم اس مشورے کو وقت کی ضرورت کے عین مطابق سمجھتے ہیں۔ ہمارے علم میں روئے زمین پر کوئی ملک ایسا نہیں، جہاں حکومت کی اصلی زمام کار غیر ملکیوں کے ہاتھوں میں ہو اور غیر ملکی بھی وہ جن کو گزشتہ سو سال سے آزمایا جا رہا ہے۔ کسی ایک موقعہ پر بھی انہوں نے ملت اسلامیہ سے مخلصانہ تعاون کا ثبوت نہیں دیا، روئے زمین کے تمام اسلامی ممالک کی چھاتی ایک دفعہ نہیں بار بار ان کے فریب کارانہ تیروں سے چھلنی ہو چکی ہے۔۔۔ قائداعظم فنڈ کا اس مبارک مقصد کے لئے استعمال ہونا پاکستان کی عظیم خوش بختی ہوگی۔

سچائی کی بے قدری

صاحب مذکور مزید فرماتے ہیں کہ البیان میں سچائی کا جواہر ریزہ صرف زینت قرطاس کے لئے ہے۔ اسے کون سنگے گا۔ موجودہ زمانے کا سیاست دان تو ہرگز اسے قبول نہیں کرے گا"

ہم اپنے محترم کی خدمت میں عرض کریں گے کہ مریض کسی حالت کو بھی پہنچ چکا ہو، دوا دارو کرنا ہی پڑتا ہے۔ لیکن بفضل خدا یہاں ایسی مایوسی کی حالت نہیں ہے۔

نہیں اقبال ابھی مایوس اپنی کشت ویراں سے ٭ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی،
جو قوم اقبال و جناح جیسے بچے جن سکتی ہے۔ آپ اس سے مایوس کیوں ہوتے ہیں۔ عوام پر نہ
جائیے۔ چھپے سنگ ریزوں میں گوہر بھی ہیں کچھ،
مسلمان کی سیاست ابھی ایک اور کروٹ لے گی (انشاء اللہ) یہ ابلیسی دور جو شاطران مغرب کا پیدا کردہ
ہے ہمیشہ نہیں رہے گا۔ دنیا اس سے بیزار ہو چکی ہے۔ اس سیاست کی ناکامیوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ
ہو رہا ہے۔ لاتقنطوا من رحمۃ اللہ۔

قرون اول کے قانونی ضابطے کے متعلق استفسار ارشاد فرماتے ہیں کہ کہا جاتا ہے کہ
"اُس وقت جو لوگ دین کی سمجھ رکھنے والے تھے انہوں نے جمع ہو کر وقت کی ضرورت کے مطابق
قانون کے ضابطے مرتب کئے۔"

اس فقرے پر ناقدانہ سوالات یہ ہیں۔
۱۔ دین کی سمجھ رکھنے والے حضرات کون تھے؟
۲۔ قانون کے کون سے ضابطے انہوں نے مرتب کئے اور کس صورت میں وہ پیش کئے گئے؟
۳۔ قانون جامع کی یہ مرتب صورت اب کہاں سے دستیاب ہو سکتی ہے؟
ان نمبروار فقروں کے بعد لکھتے ہیں
وقت کی ضرورت ایک وسیع مضمون ہے کہ قانون اسلام وقت کی ضرورت کے مطابق تبدیل ہونا چاہئیے
اگر قانون اسلام کا منبع قرآن کریم ہے تو پھر ضرورت کے مطابق قانون کو مرتب کرنا خود قرآن میں ردوبدل کرنا
ہے یا نہیں۔ وقت کی ضرورت تو پھر اس امر کی متقاضی ہے کہ مرزا غلام احمد صاحب کے دعوی نبوت پر نظر
ثانی کی جائے۔"

ان سوالات کے متعلق جواب دینے کا حق ہر صاحب فہم ناظر کو ہے۔ ہماری سمجھ میں جو بات آتی ہے۔ ہم
اختصاراً عرض کرتے ہیں (اگرچہ یہ سوالات طوالت طلب ہیں)
۱۔۔۔ دین کی سمجھ رکھنے والے حضرات اولاً صاحب رسالت صلعم پھر خلفاء راشدین اور ان کے
مشیران کرام (رضوان اللہ علیہم) تھے۔
۲۔۔۔ قانون کے ضابطے حدیث و سیر کی کتابوں میں بہ تفصیل ملتے ہیں۔ ان کو عملی رنگ میں ان خلفاء

سنے پیش کیا۔ وہ قلب مبارک جس پر وحی الٰہی غیر متبدل قانون نازل ہوتا تھا، اُسے حکماً فرمایا گیا ،

"شاورھم فی الامر" (۳ : ۸) امر حکومت میں ان لوگوں سے مشورہ کر لیا کر

آپ کے بعد ظاہر ہے کہ غیر اہل وحی بدرجہ اولیٰ محتاج مشورہ ہوں گے، چناں چہ ان کی مدح الفاظ ذیل میں فرمائی۔

"وامرھم شوریٰ بینھم" (۲۵ : ۵) اور وہ باہمی مشوروں سے امور حکومت سرانجام دیتے ہیں۔

قرآن پاک نے اپنی ابدی وحی کی روشنی میں مشورے کا دروازہ کھلا رکھ کر نبوت کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا ـــــ اب نہ نئے نبی آئیں اور نہ نئے نئے مذہب اور فرقے پیدا ہوں۔ بلکہ قدیم مذاہب والوں کو بھی دعوت دی کہ

"تعالوا الیٰ کلمۃ سواءٍ بیننا و بینکم الا نعبد الا اللہ" (۳ : ۵)	اے اہل کتاب آؤ ایک بنیادی بات پر متحد ہو جائیں جو تمہارے اور ہمارے درمیان مسلّم ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔

ظاہر ہے کہ کسی انسانی شخصیت پر تمام بنی آدم قطعاً جمع نہیں ہو سکتے۔ اس لئے اس جگہ رسولوں کو بھی درمیان سے اٹھا دیا۔ جاؤ اپنے اپنے رسولوں کو مانتے رہو۔ لیکن سب رسولوں کے متفقہ پیغام پر ایک ہو جاؤ۔ ـــــ اگر یہ جامع دعوت توریت میں ہوتی تو موسیٰ خاتم ہوتے۔ انجیل میں ہوتی تو عیسےٰ پر نبوت ختم ہو جاتی۔ لیکن حکمت ایزدی نے نوع انسان کے ارتقا کے ایک خاص بلوغ کو اس پیغام عالی مقام کا اہل سمجھا اور آئندہ اس پر سے نئی نئی نبوتوں کا بوجھ اٹھا دیا۔ اب وہ اس رسالت سابقہ کی جامع رسالت کو بنیاد بنائیں اور نئی نئی ضرورتوں کے متعلق عقل و تجربہ کی برکات سے مستفید ہوتے رہیں۔

۳ ـــــ میرے خیال میں اس سوال کا جواب قدرے اوپر آچکا ہے۔ مزید ایک آدھ بات اور سن لیجئے۔

لا اینڈ بائی لاز (LAW AND BY LAWS) یعنی اصول و فروع۔ یا کلیات اور جزئیات۔ لا (LAW) اصولی قانون یا کلیات جو غیر متبدل ہیں قرآن میں آچکے، بس وہ ہے قانون کی جامع اور مرتب صورت اور وہ آپ کے گھر سے، میرے گھر سے، ہر مسلمان کے گھر سے، بلکہ اہل کتاب، کفار و مشرکین تک کے کتب خانوں سے دست یاب ہو سکتا ہے۔ باقی رہے جزئیات قرآن میں ابدیت نہیں ـــــ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ قرآن مجید آج نازل ہوا ہے۔ اور اس کے ساتھ کوئی دوسری کتاب نہیں، جیسا کہ عہد رسالت میں تجربہ ہو چکا ہے، تو اسی کو اساس بنا کر اجتماعی و انفرادی معاملات طے کئے جا سکتے ہیں ـــــ اگر آپ اصرار ہی کریں کہ جزئی امور کی بھی ضرور کوئی

کتاب ہونی چاہیئے تو معاف فرمائیے

"عنقا شکارکس نشود دام" "چنیں"

صفحہ عالم پر کوئی ایسی کتاب نہیں ہو سکتی۔ جو قیامت تک پیش آنے والے جزئیات کا احاطہ کر سکے۔

اب رہے عہد رسالت و خلفاء راشدین کے مقدمے اور فیصلے، تو اس کا جواب آپ کے پیش کردہ زیر سوال فقرے ہی میں موجود ہے۔ پھر دیکھ لیجئے

"انہوں نے...... وقت کی ضرورت کے مطابق قانونی ضابطے مرتب کئے"

یعنی وہ ضابطے اس وقت کی ضرورت کے مطابق تھے۔ ابدی ضابطے نہ تھے۔ ہاں وہ ہمارے بزرگوں کا متبرک ترکہ ہیں۔ ہم قانون سازی کے وقت ان کو اپنے سامنے رکھیں گے۔ ان کی مساعی سے مستفید ہوں گے۔ جو بات ہمارے زمانے پر منطبق ہو سکے گی ہم اس سے کام لیں گے۔ وہ ایک بنی بنائی عمارت ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں، اس کا جو گوشہ اس وقت ہم کو کام دے سکے ہم اس سے کیوں فائدہ نہ اٹھائیں؟ لیکن یہ نکتہ ذہن میں رکھتے ہوئے کہ وہ خدائے لایزال کے لایزال اصولی احکام کی طرح لایزال نہیں ہیں بہترین انسانوں کے بہترین دماغوں کا نچوڑ ہیں جو انہوں نے وحی کی روشنی میں اپنے وقت اور ماحول کے لئے تیار کیا ہاں یہ نہ کہئے کہ قانون اسلام وقت کی ضرورتوں کے مطابق تبدیل ہوتا رہتا ہے" اس فقرے کی اس ترمیم کر لیجئے کہ مسلمان حکومتوں کے قانون کو بحکم قرآن اپنے ظروف و احوال کے مطابق ڈھلنے اور آگے آگے بڑھنے کی صلاحیت و اجازت حاصل ہے

اور حق تو یہ ہے کہ جس چیز میں ایسی زندگی بخش اور زندگی کا ساتھ دینے والی لچک موجود نہ ہو وہ فنا کے گھاٹ اتار دی جاتی ہے، چنانچہ آپ وید، پران اور شاستر کا حشر دیکھ رہے ہیں۔

مذکورہ تنقید یا استفہام کے بعد محترم موصوف چند اور سوالات کرتے ہیں۔ ذیل میں ہم ان کو نمبروار درج کرتے ہیں اور اسی ترتیب سے ان کے متعلق اپنے معروضات پیش کریں گے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ سے صحیح تعلق کس طرح قائم کیا جا سکتا ہے؟

۲۔ آیات قرآن تشریح طلب ہیں یا ان کا مفہوم ایک عام آدمی سمجھ سکتا ہے؟

الم۔ حم۔ طہ وغیرہ کے معانی اب تک کیوں نہیں ہو سکے، اور ان کا کیا مفہوم سمجھا جائے؟

۳۔ وضو کا طریقہ قرآن مجید میں کیا بیان کیا گیا ہے۔ ہاتھ دھونا، ناک میں پانی ڈالنا قرآن پر اضافہ ہے

یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کی پیروی کیوں کی جاتی ہے؟

۴۔ نماز کا مجوزہ طریقہ کس طرح وجود پذیر ہوا، اور اس کی قرآن میں کیا تشریح ہے؟

۵۔ "حسبنا کتاب اللہ" کا کیا مطلب ہے، اس کے بعد جو کچھ وجود میں آیا ہے اس کی کیا حیثیت ہے

ان عقدوں کو ایک عام فہم مسلمان کس طرح حل کر سکتا ہے۔

غور فرمائیے۔ خاتم النبیین کے معنی نے اسلام میں عظیم انقلاب پیدا کیا۔ کیا اس گتھی کو ایک عام فہم آدمی سلجھا سکتا ہے، جس کو بڑے بڑے عالم حل نہیں کر سکے؟"

محترم! آپ کا ہر سوال اپنے جواب میں ایک کتاب چاہتا ہے، لیکن یہاں فرصت و گنجائش کا یہ حال ہے کہ بس ایک ایک سطر میں جواب ہو جائے تو اچھا ہے ——— خیر جس طرح سوالات کی دنیا وسیع ہے اسی طرح جوابات کا عالم بھی محدود نہیں۔

"لکھی جائیں گی کتاب دل کی تفسیریں بہت"

چند اشارات سن لیجئے۔ اور اسی پر تفصیلات کا قیاس کر لیجئے۔

۱۔ فرض کیجئے آپ آقا ہیں اور میں آپ کی غلامی یا ماتحتی میں آنے والا ہوں، اب مناسب ہے کہ میں پہلے آپ کے مزاج و میلان اور آپ کے ان مطالبوں کو معلوم کروں جن کی آپ مجھ سے توقع رکھتے ہیں۔

اس کی دو صورتیں ہیں۔

ا۔ آپ کے اہالی موالی سے مل کر دریافت حالات کروں

ب۔ براہ راست آپ سے پوچھ لوں ——— یا آپ ہی براہ کرم سب کچھ صاف صاف مجھے بتا دیں ——— آپ تسلیم کریں گے کہ آخری صورت بالکل قطعی اور احسن ہے جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں اور اسی کو ملحوظ رکھ کر میرے آپ کے تعلقات استوار ہو سکتے ہیں ——— اللہ تعالیٰ آقائے حقیقی ہیں اور ہم بندے ——— انہوں نے اول "فطرت سلیمہ" میں اور پھر اسی کے مطابق ایسی مخصوص و محفوظ وحی میں اپنا منشا بیان کر کے ہم پر احسان عظیم فرما دیا۔ اب ہمیں زید، عمر وغیرہ کے پیچھے پیچھے پھر کر یہ دریافت کرنے کی ضرورت نہیں کہ ہمارا آقا ہم سے کیا چاہتا ہے۔ اور زید، عمر و جو کچھ بتائیں وہ ظن اور باہم مختلف ہوگا۔ اور وحی اس سے پاک ہے۔ الحمد للہ

۲۔ آیات تشریح طلب بھی ہیں۔ اور عام فہم بھی ——— بالکل اس کائنات کی طرح ——— ہر

شخص اپنی سیدھی سادی سمجھ کے مطابق قدرت کی نعمتوں آگ، پانی، مٹی، ہوا، روشنی، لباس طعام وغیرہ سے حصہ لیتا اور زندگی کے مطالبات پورا کرتا ہے اور عالی دماغ محققین و موجدین اس کی گہرائیوں میں ڈوب کر تحقیق و ایجاد کے موتی نکالتے ہیں اور جتنے گہرے جاتے ہیں اس سے آگے اور زیادہ گہرائی محسوس کرتے ہیں۔

اے برادر بے نہایت درگہیست

اور اسی ناتمامی میں لذت ہے، ابدی ارتقا ہے — اگر کسی ایک مقام پر پہنچ کر علم و تحقیق کی سرحدیں ختم ہو جائیں تو زندگی اجیرن ہو جائے — بالکل یہی حال قدرتی کتاب قرآن کا ہے۔

"لقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر" (پ ۲۷) قرآن نصیحت کے لئے تو آسان ہے، ہے کوئی نصیحت لینے والا؟

باقی رہیں علمی باریکیاں اور روحانی کمالات تو

لا یعلمہ الا اللہ والراسخون فی العلم الخ (پ ۳)	تو ان کی حقیقت اللہ کو معلوم ہے اور حسب استعداد ان لوگوں کو جو علم میں پختہ ہیں الخ

الم۔ حم۔ طٰہٰ وغیرہ مفرد حروف ہیں — تمام علوم انہی سے نکلے ہیں، جس طرح بیج سے درخت، اور نطفے سے انسان و حیوان — بیج میں درخت کی تمام تفصیلات رنگ، بو، ذائقہ، خواص، طبیعت، پتے، شاخ، پھول، پھل، تنہ وغیرہ مندرج ہیں۔ نطفے میں شکل صورت جسم، اعصاب، استخوان، اعضائے رئیسہ، اعضائے خادمہ، فکر و شعور، حافظہ، باصرہ، ذائقہ وغیرہ بے انتہا صلاحیتیں پنہاں ہیں لیکن ان کو ظہور میں لانا اور خلعت وجود سے سرفراز فرمانا بے انتہا قدرتوں کے مالک اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے اسی طرح مفرد حروف میں تمام علوم پنہاں ہیں — اللہ تعالیٰ ان کو جانتے اور ہماری استعداد و ضرورت کے مطابق ہم پر واضح فرماتے ہیں:

لا یحیطون بشیء من علمہ الا بما شاء (پ ۳) انسان علم الٰہی کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر جتنا اللہ تعالیٰ چاہیں۔

جن سورتوں کے اول میں یہ حروف ہیں، وہ سورتیں انہی حروف کی تفصیل ہیں جو ہم از خود نہیں جان سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے خود بتا دی۔ چنانچہ غور کرنے سے ان حروف کا خاص تعلق ان سورتوں سے واضح ہوتا ہے، جب کہ ان کی تکرار و تعداد دوسرے حروف کی نسبت ان میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

نیز جس شخص کی ۹۹ باتیں ہمارے تجربہ میں مفید و صحیح ثابت ہوئی ہیں۔ اگر ایک بات بالفرض ہم نہیں سمجھ سکے تو ہمیں حسن ظن سے کام لے کر اپنے قصور فہم کا اعتراف کر لینا چاہیئے۔ کائنات کو کیا ہم نے سارا

سمجھ لیا ہے ـــــ اسے چھوڑیئے ۔ اپنے آپ کو سمجھ لیا ہے ؟ ـــــ اسے بھی چھوڑیئے اپنے کسی ایک عضو کی پوری اناٹمی (تشریح) پر اس کے بیشتر احاطہ کر سکے ہیں ؟ یقیناً نہیں کر سکے اور کبھی نہیں کر سکیں گے ـــــ کیا پھر اپنا یا موجودات کا انکار کر دیں صرف اس بنا پر کہ ہم نہیں سمجھ سکے ـــــ پورا نہ سمجھ سکنے کے باوجود انسان بہت کچھ سمجھتا جا رہا ہے ـــــ وقس علی ہذا

۳ ـــ قرآنی وضو یا طہارت جسم و لباس کا پس منظر دیکھئے ـــــ یہودی ہندوستان کے وہمی برہمنوں سے بھی زیادہ صفائی کا خبط رکھتے تھے اور عیسائی ناپاک رہنے میں نجات سمجھتے تھے ۔ قرآن نے اعتدال کی راہ پیش اور اس کا فلسفہ بتا دیا :

یرید اللہ لیطھرکم و ما جعل اللہ علیکم فی الدین من حرج ۔	اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ تم صاف ستھرے رہو اور دین کو اللہ نے تمہارے لئے خواہ مخواہ کی مصیبت نہیں بنایا ۔

فقیہوں کی موشگافیوں سے نکلئے اور قرآن کے سیدھے مفہوم کو اپنائیے ۔

۴ ـــــ نماز کا فلسفہ اور غایت بھی قرآن میں صاف ہے :

اقم الصلوٰۃ لذکری (۲۰:۱۴)	نماز کی غرض و غایت ذکر الٰہی ہے ۔
ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر (۲۹:۴۵)	اور ذکر یا صلوٰۃ کا فائدہ یہ ہے کہ انسان بے حیائی اور برائی سے بچ جاتا ہے ۔

اگر ہم بڑے بھائی ، باپ اور استاد کے سامنے بے حیائی اور برائی کا ارتکاب نہیں کر سکتے ـ تو سچا نمازی جو اپنے مالک کو ہر وقت سامنے موجود پاتا ہے ۔ کس طرح منہیات کی جرأت کرے گا ـــــ بس یہ مقصد جس وضع کی نماز سے حاصل ہو جائے وہ نماز صحیح ہے ۔ اس میں ہاتھ چھاتی پر ہوں یا زیر ناف یا کھلے ۔ رفع یدین ہو یا نہ ہو ـ ہماری مروجہ یا مجوزہ نماز کے بڑے اور بلا اختلاف ارکان قیام ، رکوع اور سجدہ ہیں ، قرآن میں ان تینوں کا ذکر بار بار آ چکا ہے ۔ ان میں ادب و احترام ، عجز و خشوع ، نیاز مندی و یکسوئی کی ساری شکلیں آ جاتی ہیں ۔ لہٰذا تمام مذاہب کے عبادت کے طریقوں پر اس کو ترجیح حاصل ہے ۔ جو چیز صراحتہً منافی قرآن نہیں اُسے اختیار کئے رکھنے میں خواہ مخواہ کا جھگڑا پیدا نہیں کرنا چاہیئے ۔

۵ ـــــ حسبنا کتاب اللہ کا وہی مطلب ہے جو قرآن مجید کی ان آیات کا جن میں بار بار کہا گیا ہے کہ ـ

اولم یکفھم انا انزلنا علیک الکتٰب یتلیٰ علیھم (۲۹:۵۱)	کیا یہ ان کے لئے کافی نہیں کہ ہم نے تجھ پر کتاب اتاری جو ان پر پڑھی جاتی ہے ۔
کتاب فصلت آیاتہ قرآناً عربیاً لقوم یعلمون ۔ (۴۱:۳)	یہ قرآن کتاب ہے جس کی آیتیں عربی زبان میں سمجھ دار لوگوں کیلئے بیان کر دی گئی ہیں ۔

ضربنا للناس فی ھذا القرآن من کل مثل۔ (۳۰:۵۸) | ہم نے لوگوں کے لئے اس قرآن میں سبھی طرح کی مثالیں بیان کیں۔

الیوم اکملت لکم دینکم (۵:۳) | آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے۔

بای حدیث بعد اللہ وآیاتہ یومنون (۴۵:۶) | اللہ اور اس کی آیتوں کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے۔

ایسی بیسیوں آیتیں ہیں جن کا یہاں احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔

اور یہ جو "عام فہم" کا لفظ آپ بار بار استعمال فرماتے ہیں، اس کا کیا مطلب ہے۔ کیا قرآن کے اول مخاطب عرب کے گلہ بان عام فہم نہیں تھے۔ کیا وہ سب کے سب کیمبرج، اکسفورڈ، جامعہ ازہر یا دارالعلوم دیوبند کے سند یافتہ تھے۔ کیا ان کے سامنے قرآن کے ساتھ دوسرے بزرگان دین کے بے شمار اختلاف پرور ذخیرے بھی تسہیل فہم (دراصل تخریب فہم) کے لئے پیش کئے گئے تھے۔

میرے محترم! جب ایک قرآنی سوسائٹی تشکیل پاجائے۔ راعی و رعیت، عوام و خواص قرآن کی راہ پر چل پڑیں تو سب کچھ آپ سے آپ عام فہم ہو جاتا ہے۔ ایسی تائیدات حاصل ہوتی ہیں۔ مشکلات آسان ہوتی ہیں۔ ملائکہ امداد کے لئے نازل ہوتے رہتے ہیں ——— یہ وہ باتیں ہیں جو قرآن تجربہ سے ثابت ہو چکی ہیں ———

"خاتم النبیین کے معنی ہیں عظیم انقلاب"

"خدا لٹھواؤ قلم میرا نہ کھلواؤ زباں میری"

اس کے متعلق "البیان" کے قبل پاکستانی دور میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ یہاں صرف اتنا ہی کہوں گا۔ کہ خدا کے لئے اسے "عظیم انقلاب" نہ کہئے۔ عظیم فتنہ کہہ لیجئے۔ ضلال مبین کہہ لیجئے۔ دو اور دو تین یا پانچ کی قسم کا کوئی حساب تصور کر لیجئے ——— اس کی تہہ میں انگریز کی کچھ مصلحتیں تھیں جو ختم ہو چکیں۔ اب تو بس

گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

جو لوگ اس لکیر کو پیٹ رہے ہیں انہیں پیٹنے دیجئے۔ اور بھی تو کئی لکیریں بیٹھی ہی جا رہی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی سہی ——— آپ یہاں بھی عام فہم آدمی کو لے آئے ہیں۔ تو اس کا آخری جواب یہ ہے کہ لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا اور لیبلوکم فیما آتکم۔ عام فہم سے خاص فہم کا سوال نہیں ہوگا جتنی جس کو سمجھ دی، اس کے مطابق اس کو باز پرس ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب

کلمۂ توحید و رسالت | آپ نے ایک الگ پرزہ کاغذ پر ایک سوال لکھا ہے۔ جو میری نظر سے اوجھل ہو گیا تھا اور بعد میں سامنے آ گیا۔ سوال یہ ہے:

"تمام قرآن میں" لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ "کہیں نہیں ہے" لا الٰہ الا اللہ "دو جگہ ملتا ہے ـــــ
" محمد رسول اللہ" تمام قرآن میں دو جگہ آیا ہے ـــــ پھر موجودہ کلمے کو جو ہمارے مسلمان ہونے کی کسوٹی
ہے کیسے جمع کیا گیا؟"

جواباً عرض ہے کہ کلمہ توحید اتنا ہی ہے "لا الٰہ الا اللہ" ۔ اسی اسلام کی بنیاد ہی ہے: فطرت اللہ التی فطر الناس
علیہا " کے مطابق انسانی فطرت میں صرف اللہ تعالیٰ کی الوہیت کا اعتراف داخل ہے ـــــ الگ الگ نبیوں اور رسولوں
کے اسماء و شخصیات کا اعتراف تمام نوع انسان یا کسی ایک فرد بشر کی فطرت میں داخل نہیں ہےـــــ انبیاء و ملائکہ
اور کتب سماوی "لا الٰہ الا اللہ" کی منزل تک پہنچنے کے وسائل ہیں اور بس، وسائل ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں لیکن
منزل و مقصود میں کبھی تبدیلی نہیں ہوئی:

"ما ارسلنا من رسول الا نوحی الیہ انہ لا الٰہ الا انا"

رسول اور ان کی رسالتیں یعنی کتابیں بدلتی رہی ہیں لیکن ان کا پیغام ایک ہی رہا ہے، جو تمام رسولوں سے پہلے
اور سب کے بعد بھی اٹل ہی رہے گا اور وہ ہے:

"لا الٰہ الا اللہ"

اب رہا ابراہیم خلیل اللہ، موسیٰ کلیم اللہ، عیسیٰ روح اللہ اور محمد رسول اللہ کا اعتراف ۔ تو یہ اس برادری میں شمول
کی شرط ہے جو ان نبیوں نے قائم کی ـــــ ورنہ دین تو عند اللہ ہمیشہ اسلام ہی رہا ہے اور ہر نبی مسلمان ہی تھا اور
ان کے پیچھے پیرو اپنے اصلی مفہوم میں مسلم ہی تھے ۔ اس پر قرآن مجید کی بہت سی آیات شاہد ہیں مثلاً نوحؑ فرماتے ہیں:
امرت ان اکون من المسلمین ۔

ابراہیم و اسماعیل کی مشترکہ دعا ہے: واجعلنا مسلمین لک ۔

حواریان مسیح کا قول ہے: واشہد بانا مسلمون ۔

ابنائے یعقوب کہتے ہیں: نحن لہ مسلمون ۔

ان آیات سے سورج کی طرح ظاہر ہے کہ مسلم بننے کے لئے کسی غیر اللہ ہستی کا اقرار کوئی بنیادی شرط نہیں ہے۔
اور نہ ہی کوئی غیر اللہ وجود "فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا" کا مقصود و منتہا اور مرجع و مآب ہو سکتا ہے ۔ یہ سب
ہمارے چاقو ہیں جو ہم نے اپنے اپنے بزرگوں کو اللہ تعالیٰ کے برابر بلکہ اس سے بھی زیادہ اہم بنا رکھا ہے ۔ اس آیت کو بھی ذہن
میں رکھئے:

ما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل ان قتل او مات انقلبتم علی اعقابکم

اسی قسم کی آیت نصاریٰ کے مزعومہ "الٰہ" حضرت مسیح کے متعلق بھی وارد ہوئی ہے:

ما المسیح عیسی ابن مریم الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل

یعنی محمد الٰہ ہیں تو مسیح بھی الٰہ ہیں۔ محمد ابدی نہیں تو مسیح بھی ابدی نہیں۔ دونوں کو بشری سطح سے اوپر سمجھنا یکساں ضلالت ہے۔

انما انا بشر مثلکم

انک میت و انھم میتون

(عرشی)

کتاب موسومہ بہ

"نجوم الفرقان"

مطبوعہ فیض بخش ایجنسی اگر کسی صاحب کے پاس برائے فروخت موجود ہو

یا

ملنے کا پتہ بتا سکیں

تو

"ادارہ البیان دارالقرآن نسبت روڈ، لاھور"

کے پتے پر اطلاع دیں!

ظن کے اصطلاحی معنی

اور

اُس کا افسوسناک مغالطہ

از مولانا تمنا عمادی مجیبی پھلواروی مہاجر ڈھاکہ

"ظن کے اصطلاحی معنی" کے عنوان سے ماہنامہ "اسلامی زندگی" (لاہور) بابت ماہ مئی ۱۹۴۹ء میں ایک مضمون علامہ اجل مولانا محمد اسمٰعیل صاحب خطیب گوجرانوالہ کا میری نظر سے گذرا جس پر فاضل مکرم مرتب رسالہ نے ایک طویل مقدمہ بھی سپردِ قلم فرمایا ہے۔ مقدمہ و مضمون کے دیکھنے کے بعد خموشی ایک دینی جرم کی حیثیت رکھتی ہے، اس لئے میں نے قلم اٹھایا اور چاہا کہ ماہنامہ "اسلامی زندگی" ہی کے مرتب صاحب کی خدمت میں بھیج دوں مگر یہ معلوم کر کے کہ وہ رسالہ بقضائے الٰہی بند ہو گیا بے اختیار انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر سوچنے لگا کہ اب کہاں بھیجوں؟ آخر رائے یہی ٹھہری کہ رسالہ موقرہ "البیان" کے ذریعے محترم مرتب "اسلامی دنیا" اور محترم خطیب گوجرانوالہ دونوں کی خدمت میں پہنچا دوں۔ اور پھر اس طرح ناظرینِ "البیان" کو بھی اس سے متمتع ہونے کا موقع مل جائے گا۔ اور سب نہیں تو بعض ناظرینِ اسلامی زندگی کی نظروں سے بھی شاید گذر جائے۔ اِنْ شاء اللہ۔

میری غرض کسی مناظرے کا سلسلہ جاری کرنا نہیں۔ صرف احقاقِ حق مراد ہے اور بس۔ ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ وھو علٰی کل شیٔ شہید۔ (تمنا غفرلہ)

محترم مرتبِ رسالہ نے اپنے مقدمہ کے آغاز ہی میں "نبوت" کی تعریف مشہور فرقہ باطنیہ کے شہرۂ آفاق مبلغ "علی وجودی" کے لب و لہجہ میں کی ہے۔ فرماتے ہیں:

"نبوت سے متعلق ہمارا تصور یہ ہے کہ وہ "ربوبیتِ کبریٰ" کا ایک التفاتِ خاص ہے جو پیغمبر کے اسوہ و عمل میں منعکس ہے۔"

اس کے بعد پھر مقابل والے صفحے میں جو صلا ہے، ارشاد فرمایا گیا ہے :

"اور ہر دور میں جب انسان چاہے گا کہ آفتابِ نبوت کو براہِ راست دیکھ سکے اور زندگی کی مشکلات میں رہنمائی کے لئے اسوۂ رسول کی جھلک پا سکے، تو "ربوبیت کبریٰ" اس کو اس کے مواقع بہم پہنچاتی رہے گی اور اس کو مایوس نہیں کرے گی"

"ربوبیت کبریٰ" کے لفظ سے "ربوبیت صغریٰ" کا تصور بھی ضرور منتزع ہو کر ذہنوں میں آئے گا۔ اور دونوں کے متعلق یہ سوال بھی ضرور پیدا ہو گا کہ وہ کیا ہے اور یہ کیا ہے ؟ "کبریٰ" کا "التفاتِ خاص" تو پیغمبر کے اسوہ وعمل میں منعکس ہوتا تھا، اور مشتاقوں کو اس کی جھلک آج بھی وہ دکھلانے کے لئے تیار ہے۔ مگر "صغریٰ" معلوم نہیں، کہاں اور کس کنجِ خمول میں مراقب بیٹھی ہے ؟

یہاں تک تو "ربوبیت کبریٰ" کا تعلق "نفسِ نبوت" سے بتایا گیا۔ اب "حدیث" سے اس کا لگاؤ یوں بیان کیا گیا ہے:

"حدیث کے معنی صرف ایک تاریخ اور داستانِ حیات کے نہیں، بلکہ ربوبیت کبریٰ" کے منشائے فیض کی تکمیل کے ہیں"۔

یعنی اگر احادیث کی یہ موٹی موٹی جلدیں دنیا میں شائع نہ ہوتیں۔ تو "ربوبیتِ کبریٰ" کا منشائے فیض ناقص رہ جاتا، یا جمع احادیث سے پہلے سنہ تک ناقص تھا۔ خدا بھلا کرے ابن شہاب زہری کا جنہوں نے جمع احادیث کا کام شروع کر کے ربوبیت کبریٰ کے منشائے فیض کی تکمیل کی داغ بیل ڈال دی، جو صدیوں میں رفتہ رفتہ پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

حدیث میں وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تَاللّٰهِ لَتَرْكَبُنَّ سَنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ۔ یعنی قسم ہے اللہ کی تم لوگ بھی ضرور اپنے اگلوں کی روش پر آجاؤ گے۔ (او کما قال) اگلی اُمتوں نے اپنے انبیاء کے ساتھ غلو پیدا کر کے ان کو عام انسانی سطح سے رفتہ رفتہ اونچا کرتے کرتے "ربوبیت کبریٰ" کی منزل تک پہنچا دیا تھا۔ یہاں تک کہ کوئی خدا کا بیٹا کہنے لگا، کوئی خدا ہی کہنے لگا۔ نبی کریم صلعم کی پیش گوئی غلط نہیں ہو سکتی مسلمانوں میں بھی کہنے والے کہتے ہیں ؎

محمدؐ مظہرِ وحدت ہے کوئی رمز اس کی کیا جانے ۔۔۔ شریعت میں تو بندہ ہے حقیقت میں خدا جانے

دوسرے صاحب کچھ اور کھل کھیلے اور غایت غلو میں آکر فرما گئے ؎

وہی جو مستویِ عرش ہے خدا ہو کر ۔۔۔ اتر پڑا تھا مدینے میں مصطفیٰ ہو کر

اور ان لوگوں سے بھی بہت پہلے ایک حضرت فرما گئے تھے ؎

محمدؐ بصورت عرب آمدہ ... بمعنی مگر، عین رب آمدہ

وغیرہ ذٰلک من الهفوات ۔ غرض مرتب صاحب کی یہ اصطلاح جدید بھی کچھ اسی قسم کے پوشیدہ جذبات کی غمازی کر رہی ہے۔ خدا کرے اُن کا دل اس قسم کے ناپاک جذبوں سے پاک ہو۔ بہرحال ایسے الفاظ جو گمراہ کن مفہوم کی طرف ایہام کر رہے ہوں ہر مسلم کا فرض ہے کہ اپنی زبان و قلم کو ان سے آلودہ نہ کرے جیسا کہ قرآن مبین میں ارشاد ہے:

یا ایھا الذین آمنوا لا تقولوا راعنا بل قولوا انظرنا | اے ایمان والو تم راعنا نہ کہو تم انظرنا کہا کرو۔

انظرنا کے ایک ہی معنی ہیں، ہمیں دیکھو، ہماری طرف نظر کرو، ہم پر نظر رکھو۔ اور راعنا کو اگر رعایۃ سے مشتق سمجھئے تو اس کے معنی صحیح ہوں گے کہ ہماری رعایت کرو، ہماری نگہداشت کرو۔ مگر رعونۃ سے اگر مشتق قرار دیجئے تو راعن کے معنی محاورۂ عرب میں بددماغ اور احمق کے ہیں۔ یہود بدنیتی سے یہ دومعنی لفظ استعمال کرتے تھے مسلمان ان کی بدنیتی کو نہ سمجھ سکے اور ایک ہی معنی کے اعتبار سے "رعایۃ" سے مشتق سمجھتے ہوئے یہ بھی راعنا ہی کہنے لگے، تو یہ آیت آئی کہ مسلمانو تم یہ دومعنی لفظ جس کا ایک دوسرا پہلو خراب بھی ہے۔ استعمال نہ کرو۔ تم ایسا لفظ بولو جس کے ایک ہی معنی ہیں اور اچھے۔ بُرے پہلو کا گمان بھی نہ ہو، اس لئے اس قسم کے غلط الفاظ کا استعمال ہرگز جائز نہیں۔

حدیث کا ذکر فرماتے ہوئے مرتب صاحب اپنے مقدمے میں فرماتے ہیں:

"حدیث صرف آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی ترجمانی ہی نہیں کرتی بلکہ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ دین کا وہ کیا تصور تھا، جو اُن کی عملی زندگی میں رہنما تھا۔ وہ کیا اصول اور کون ممیز خدوخال تھے جو اُن کو دوسری قوموں سے جدا کرتے تھے۔ اُن کی ثقافت کیا تھی، ان کے اخلاق کیسے تھے؟ اُن کی اجتماعی زندگی کن خصوصیات کی حامل تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُن کی ساری چیزوں میں وہ سے کیا تھی جس کو وہ بطور معیار کے سمجھتے تھے اور جس پر اپنی اصلاح و تعدیل کی بنیاد رکھتے تھے۔"

واقعہ یہ ہے کہ حدیثِ رسول اور سنتِ نبوی کے مجموعوں کو ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ اگر واقعی یہ باتیں جو جناب مرتب صاحب فرماگئے، "ان دفاتر حدیث میں ہوتیں تو پھر کون ایسا بدنصیب تھا جو اپنے کو مسلم کہنے اور سمجھنے کے باوجود ان دفاتر احادیث سے ذرا سی بھی بے اعتنائی برتتا۔ مگر یہاں تو واقعہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین و اجلہ صحابہؓ کے اخلاق و سیر اور ان کا معیارِ زندگی ان ذخائر احادیث سے معلوم کیا ہوگا کہ جتنا بھر قرآن مبین سے یا تعامل سلف سے معلوم ہوتا ہے، وہ بھی مشتبہ ہوکر رہ جاتا ہے۔ ان کے اخلاق ان کی ثقافت اور ان کے اصولِ زندگی کو صحت و قطعیت کے ساتھ اگر کوئی معلوم کرنا چاہے تو قرآن مبین ان کی ہدایت کے لئے کافی ہے۔

اولم یکفھم انا انزلنا علیک الکتٰب یتلیٰ علیھم (عنکبوت ع ۵) | کیا ان کیلئے کافی نہیں کہ ہم نے تم پر (اے رسولؐ!) اس کتاب کو نازل کردیا جو ان کے سامنے پڑھی جایا کرتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر واقعی اللہ تعالیٰ کا یہ منشا ہوتا کہ ان کتب احادیث سے ہدایت اُمت کا یہ کام لیا جائے تو جس طرح قرآن مجید کو عہد نبوی ہی میں خود اپنی ذمہ داری کے ساتھ جمع کرو دیا لوگوں کے سینوں میں محفوظ اور کتابی صورت میں مدون کرا دیا۔ اور ہر عورت مرد بوڑھے جوان اور بچے سے پڑھوا دیا ان علینا جمعہ و قرانہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو کتاب دیکھ پڑھنے کی ترغیب دیا کرتے تھے جس سے صاف ظاہر ہے کہ عہد نبوی میں تقریباً ہر صحابی کے پاس قرآن مجید کتابی صورت میں تھا جبھی تو آں حضرت صلعم صحابہؓ کو منع فرماتے تھے کہ جہاد وغیرہ میں سفر اختیار کریں تو قرآن مجید اپنے ساتھ نہ لے جایا کریں۔ ہر شخص کو آپ لکھنے پڑھنے کی تاکید فرماتے تھے۔ کتابت کی تعلیم اس قدر عام تھی کہ عورتوں کو بھی کتابت کی تعلیم دلواتے تھے۔ قرآن کی تعلیم و تعلم کا زبردست سلسلہ جاری تھا بغیر قرآن کی عام کتابت کے قرآن کی عام تعلیم ناممکن تھی ازواج مطہرات بھی لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ حضرت حفصہ نے حضرت شفا بنت عبداللہ سے کتابت سیکھی تھی۔ (ابوداؤد ج ۲ صفحہ ۱۸۶ کی حدیث سے اس کا پتا ملتا ہے) اور کیوں نہ ہو، طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ خود آپ فرماتے تھے اور قرآن مبین میں علّم بالقلم کا لفظ بتا رہا ہے کہ علم قلم ہی کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے، اس لئے پڑھنے کی تعلیم کے ساتھ ساتھ لکھنے کی تعلیم بھی ضروری ہے۔ ہر اُم المومنین کے پاس ایک قرآن مرتّب و مدوّن موجود تھا یہاں تک کہ بعض کے کاتبوں کے نام بھی حدیث و رجال کی کتابوں میں مذکور ہیں، جیسے عمرو بن رافع جو حضرت حفصہ کے مصحف کے کاتب تھے (تہذیب التہذیب ج ۸ صفحہ ۲۳) ابو یونس حضرت عائشہ صدیقہ کے مصحف کے کاتب تھے (کتاب المصاحف ابن ابی داؤد صفحہ ۲۲) اور بعض صحابہ کتابت مصاحف کا مشغلہ رکھتے تھے مثلاً حضرت ناجیۃ الطفاوی وغیرہ (استیعاب ج ۲ صفحہ ۳۰۶) باقی رہی جمع قرآن بعہد صدیقی[۵] کی روایت جو بخاری وغیرہ میں ہے جس پر تمام محدثین و مورخین کا ایمان ہے اس کی

---

[۵] اسی طرح یہ جو مشہور کیا گیا ہے کہ اس وقت عرب بالکل جاہل تھے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے نہ لکھنے پڑھنے کا سامان تھا۔ کاغذ کا وجود ہی نہ تھا بعض لوگ جو لکھتے تھے وہ ہڈی، ٹھیکری، کھال، پتے اور ٹھیکری وغیرہ پر یہ سب محض غلط پروپیگنڈا ہے۔ اس وقت اہل کتاب تھے ان کی کتابیں کاغذ ہی پر لکھی ہوئی تھیں۔ وہ خود کاغذ پر لکھتے تھے۔ فویل للذین یکتبون الکتٰب بایدیھم ثم یقولون ھٰذا من عند اللہ الآیۃ آخر کس چیز پر وہ لکھا کرتے تھے۔ سبعہ معلقہ کے مشہور شعراء کے قصائد کس چیز پر لکھ کر خانہ کعبہ پر لگائے جاتے تھے؟ اور جب پوری قوم ان پڑھ تھی تو کس کے پڑھنے کے لئے یہ قصائد لگائے جاتے تھے؟ اُمّیین کے معنی قرآن میں ان پڑھ کے نہیں ہیں بلکہ وہ قوم جس کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہ تھی۔ ومنھم اُمّیون لا یعلمون الکتٰب الا امانی۔ ایک اہل کتاب تھے جن کے پاس آسمانی کتاب تھی۔ دوسرے امی تھے۔ قل للذین اوتوا الکتٰب والاُمّیین ءاسلمتم الآیۃ قرآن میں امی مواقع میں ان پڑھ کے معنی میں نہیں ہے بلکہ مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے دینی معتقدات کی سند میں کوئی کتاب نہیں پیش کرتے تھے۔ وہ اپنے مادی دین پر تھے جس کی بنیاد فقط خاندانی روایات اور آبائی اوہام پر تھی۔ اسی کو فرمایا گیا کہ ان ھم الا یظنون ۔ منہ غفرلہ

صحت و عدم صحت اسی سے ظاہر ہے کہ جمع قرآن بعہد صدیقی کی روایت صرف حضرت زید بن ثابت سے، صرف عبید بن سباق اور ان سے صرف ابن شہاب زہری بیان کرتے ہیں یعنی آحاد اور آحاد در آحاد یہ روایت ہے اور اس پر طرّہ یہ ہے کہ حضرت زید بن ثابت کی وفات کے بعد یا وفات ہی کے سال عبید بن سباق کی پیدائش ہے۔ اور بروایتِ ضعیف زید بن ثابت کی وفات کے وقت عبید بن سباق صرف دو برس کے ٹھہرتے ہیں۔ اس کی پوری بحث میری کتاب "جمع قرآن" میں ہے جو بالکل مرتب ہے مگر افسوس کہ اب تک شائع نہ ہو سکی۔ مجھے یقین ہے کہ امام بخاری کی کتاب میں باب جمع القرآن والا پورا باب ہی داخل کر دیا گیا ہے۔ اور مختلف جگہ اس باب کی بعض حدیثیں بڑھا بڑھا دی گئی ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حدیثیں بھی اگر دین کے لئے ضروری ہوتیں تو ضرور قرآن کی طرح لکھوائی جاتیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اہتمام لکھوانے، جمع کرانے اور لوگوں کو حفظ کرانے کا قرآن کے متعلق کیا وہی اہتمام حدیثوں کے متعلق بھی فرماتے۔ ورنہ کم از کم خلفائے راشدین ہی اپنے وقت میں حدیثوں کو جمع کرا دیتے۔ حضرت صدیق اکبرؓ پانچ سو حدیثیں جمع کر کے ان کو خود ہی جلا نہ دیتے۔ (تذکرۃ الحفاظ جلد اول ترجمہ صدیق اکبرؓ ص۵) حضرت فاروق اعظمؓ جمع حدیث پر کافی غور کرنے کے بعد پھر آخر اس کے خلاف فیصلہ نہ صادر فرماتے۔ اور لوگوں کے جمع کردہ اجزاء کو منگوا کر جلا نہ دیتے اور حسبنا کتاب اللہ نہ فرماتے۔ حضرت علی مرتضیٰؓ سے جب کسی نے پوچھا تھا تو آپ نے فرمایا۔ ہمارے پاس بجز کتاب اللہ اور اس صحیفے کے اور کچھ نہیں۔ جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھوا دیا تھا۔ صحیفہ آپ نے اس دو ایک ورق کاغذ کو فرمایا جس کو رسول اللہ صلعم نے بطور ہدایت نامے کے لکھوا دیا تھا۔ جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے جو جو باتیں تھیں نمبروار درج ہیں اختصار کے ساتھ۔

۱۔ مختلف عمر کے اونٹوں کے صدقے کی تفصیل۔

۲۔ مدینے کے حرم ہونے کا ذکر

۳۔ ایک مسلمان کسی غیر مسلم کو اگر امان دے یا اس سے کوئی معاہدہ کرے تو وہ سارے تمام مسلمانوں پر اس کا لحاظ واجب ہے۔

۴۔ جس شخص نے بغیر اپنے سرداروں اور اہلِ حل وعقد کے مشورہ و اجازت کے کسی قوم سے موالات کر لی، وہ مستحق لعنت ہے۔

---

۵ تنویر الحوالک شرح مؤطا امام مالک للسیوطی۔

میں نے طوالت کے خوف سے بہت مختصر ترجمہ کیا ہے مگر باتیں یہی چار ان اوراق میں تھیں۔ بخاری میں یہ روایت موجود ہے اور متعدد جگہ طولاً و اختصاراً مذکور ہے۔

مگر نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے ان باتوں کو وحی کہہ کر لکھوایا تھا اور نہ حضرت علیؓ نے ان کو وحی فرمایا۔ نہ اس کی تلاوت و قرأت ہوتی تھی نہ اس کی عام تبلیغ ہوئی۔ یہ چیز چونکہ رسول اللہ صلعم کی تحریر کرائی ہوئی تھی، اس لئے قرآن کے بعد اس کا ذکر کر دیا۔ ورنہ جتنی حدیثوں کی روایت اُن سے ہے: اُن کا بھی وہ ذکر ضرور فرماتے۔ تعجب تو یہ ہے کہ حدیثیں لکھی نہیں گئی تھیں۔ ان کی تلاوت و قرأت نہیں کی جاتی تھی تو کبھی صحابہؓ نے آپس میں بیٹھ کر ایک سے دوسرے کی حدیثیں سنیں تک نہیں، نہ باہم حدیثوں کا کبھی مذاکرہ کیا۔

مگر ایک صدی کے بعد جو جمع احادیث کا کام شروع ہوا، تو ملاحدۂ عجم و منافقین نے ان روایتوں کے ذریعے وہ دو چیزیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کے لئے چھوڑا تھا یعنی کتاب اللہ و سنتی اللہ کی کتاب اور وہ تعامل جو ایک دستور دینی کے طور سے آپ کا قائم فرمودہ اُمت میں مروّج تھا، دونوں کو برباد کر دینے کا تہیّہ کر لیا۔ قرآن مجید کی حفاظت کا اللہ تعالےٰ نے خود ذمہ لے لیا تھا۔ اس لئے وہ قرآن مجید کو تو برباد نہ کر سکے باوجود انتھک کوششوں کے۔ مگر سُنّت کو تو تقریباً ایسا مٹا دیا کہ آج دنیا میں ایک فرقہ بھی مسلمانوں کا ایسا نہیں جو سنت پر عامل کیا ہو گا، صحیح سنّت کا اس کو علم بھی ہو۔

اور چیزوں کو چھوڑیئے، نماز جیسی اہم چیز جس کی پابندی کی تاکید سے قرآن، حدیث، فقہ اور ہر دینی کتاب بھری پڑی ہے۔ ساڑھے تیرہ سو برس سے بھی زیادہ مدّت سے ہر مسلم عورت مرد، بوڑھا جوان جو واقعی مسلم ہے اور اگلے زمانہ کے تو منافق بھی ہر شبانہ یوم میں پانچ مرتبہ پڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ کیا اس سے بھی بڑھ کر کوئی متواتر قطعی چیز ہوگی؟ ایسی چیز جس کے ہر رکن اور ہر جزء کے متعلق ہر مُسلم کو صحیح علم یکساں طریقے سے ہونا چاہیئے تھا کسی دو مسلمان میں کسی جزء کے متعلق بھی اختلاف کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ کیا ایسی متواتر چیز کو بھی یہ حدیثوں کے دفاتر بتا سکتے ہیں کہ کس طرح نماز پڑھنا سنّتِ نبوی و سنّتِ خلفائے راشدین ہے؟ کیوں کہ یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ آں حضرت صلعم نے پہلے پہل ہاتھ چھوڑ کے نماز پڑھنا شروع کی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد ہاتھ باندھ کر پڑھنے لگے۔ تو ہاتھ سینے پر باندھتے رہے۔ پھر ناف پر باندھنے لگے۔ پہلے ہر رکن کے شروع میں رفع یدین کرتے تھے، پھر صرف ابتدائے تحریمہ ہی کے وقت کرنے لگے۔ اور وقتوں میں ترک کر دیا۔ وغیرہ۔ آں حضرت صلعم نے جس کو ترک کیا، اس کا ترک ہی سنت ہو گا۔ اور جس کو اختیار کیا۔ اس کا اختیار کرنا ہی سنّت ہو گا۔ نہ کہ فعل متروک ترک کے بعد بھی سنّت باقی ہی رہے گا۔ نہ کہ فعل متروک ترک کے بعد بھی

سنت باقی ہی رہے گا۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری نماز جماعت کے ساتھ جس طرح پڑھی۔ اگر اس میں ہاتھ چھوڑ کر پڑھی تھی تو پھر ہاتھ چھوڑنا ہی سنت ہے۔ اگر ہاتھ سینے پر باندھا تھا تو سینے ہی پر ہاتھ باندھنا سنت ہے، اور اگر ناف پر ہاتھ باندھا تھا تو ناف ہی پر ہاتھ باندھنا سنّت ہوگا۔ اسی طرح ہر رکن پر رفع یدین یا بعض رکن پر یا صرف شروع صلوٰۃ میں جو بھی آخری نماز میں آں حضرت صلعم نے اختیار کیا تھا وہی سنت ہوگا۔ دوسرے پچھلے طریقے یقیناً متروک ہونے کی وجہ سے ان کا ترک سنت ہوگا۔ اور ان کا ارتکاب مخالفتِ سنت ہوگا۔

پھر جب غلبۂ مرض کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جماعت میں شرکت نہ فرما سکے اور اپنی وفات سے پانچ دن قبل ہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین اُمت کی امامت کے لئے بنا دیا، تو یقیناً حضرت صدیق اکبرؓ نے بھی بالکل اُسی طرح پانچ اس دن پانچوں وقت کی نمازیں بالکل اسی طرح پڑھی ہوں گی جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری نماز پڑھی تھی۔ اور تمام صحابہ نے بھی جو حاضرِ جماعت تھے، بالکل اُسی طرح سبھوں نے نمازیں پڑھی ہوں گی۔ کیوں کہ آپ کا حکم تھا کہ صَلُّوْا کَمَا رَأَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ، تم لوگ اُسی طرح نماز پڑھو جس طرح مجھ کو نماز پڑھتے دیکھا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اپنے زمانۂ خلافت میں بھی برابر حضرت صدیق اکبرؓ ضرور ہر وقت کی نماز میں جماعت کی امامت بالکل اُسی ایک طرح سے اپنی آخری نماز تک کرتے رہے ہوں گے۔ کوئی وجہ نہیں کہ کسی رکن میں ذرا سا بھی اختلاف کیا ہو۔ ورنہ صحابہ ضرور ٹوکتے۔ بلکہ کبھی اُن کے پیچھے نماز ہی نہ پڑھتے۔

حضرت صدیق اکبرؓ کے بعد حضرت فاروق اعظمؓ بھی ضرور اسی طرح امامت کرتے رہے ہوں گے، جس طرح انہوں نے رسول اللہ صلعم کے پیچھے آں حضرتؐ کی آخری نماز اور پھر حضرت صدیق اکبرؓ کے پیچھے اُن کی زندگی بھر پڑھتے رہے ہوں گے۔ اگر کسی بات میں ذرا سا بھی اختلاف کرتے تو ایک صحابی بھی اس کو گوارا نہ کرتا۔

اسی طرح حضرت عثمان غنی ذوالنورین، حضرت علی مرتضےٰ رضی اللہ عنہما بھی اپنی ساری نمازیں عمر بھر بالکل اسی طرح پڑھتے رہے ہوں گے۔ جس طرح رسول اللہ صلعم کی آخری نماز اور حضرت صدیق اکبر حضرت فاروق اعظمؓ کی نمازیں آں حضرت صلعم کی وفات کے بعد رہیں۔ کوئی وجہ ہی نہیں ہے کہ کسی خلیفے نے بھی خلفائے راشدین میں سے کسی ایک رکن، کسی ایک چیز میں بھی کوئی فرق اپنے پیش رو سے کیا ہو۔ اور نہ مدینے کے کسی باشندے مسلم سے چاہے وہ صحابی ہو یا تابعی، عورت ہو یا مرد، بوڑھا ہو یا جوان۔ یہ امکانی توقع ہو سکتی ہے کہ کسی نے بھی کسی اور طریقے سے کسی وقت کی بھی نماز کبھی پڑھی ہو۔

مگر افسوس کہ ان حدیثوں کی بدولت آج دنیا میں کوئی قطعی طور سے نہیں بتا سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی آخری نماز کس طرح تھی؟ اور خلفائے راشدین کس طرح نمازیں پڑھتے اور پڑھاتے رہے؟

ع حقیقت روایات میں کھو گئی

اب نماز کی تحریمہ سے لے کر سلام پھیرنے تک کے ہر ہر رکن اس کے ہر ہر ٹکڑے کو لیجئے اور حدیثوں سے ملائیے۔ تحریمہ سے لے کر سلام پھیرنے تک کیا کوئی ایسی چیز بھی ہے جس کے متعلق مختلف اور متضاد حدیثیں نہ ہوں؟ تو جب آپ ان حدیثوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی نماز صحیح طور سے معلوم نہیں کر سکتے۔ تو پھر ان بزرگواروں کی صحیح سیرت اور صحیح معاشرت کا پتا ان حدیثوں سے کیا لگا سکتے ہیں؟ آپ جس مسئلے کی بھی تحقیق کرنے بیٹھیں گے اور حدیثوں کے بحرِ ذخار میں غوطہ لگائیں گے تو صدفِ دُرّی کی ہمشکل بن کر کافی کوڑیاں اس قدر ہاتھ آئیں گی کہ آپ بالکل پتا نہ لگا سکیں گے کہ ان میں صدفِ دُرّی کون ہے خصوصاً جب آپ نے صدفِ دُرّی دیکھی ہی نہیں۔

تو کیا حدیثوں سے بالکل مایوس ہو جانا چاہیئے؟

نہیں نہیں، جب صحیح سنت کو انہیں حدیثوں نے کھو ڈالا، تو پھر وصول کیا دوسرے سے کی جائے گی؟ چوروں ہی کے گھر سے مال برآمد ہوگا۔ یہ راویانِ روایات ہی تو ہیں، جنھوں نے سنت کے خزانے پر چھاپہ مارا اور سب کچھ لوٹ لیا۔ اس لئے انہیں راویوں کے گھر سے یعنی انہیں کے مجلدات سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پہچان پہچان کر قرآنی تاریخ کی روشنی ڈال ڈال کر کونے کونے سے آپ نکال لے سکتے ہیں اگر نکالنا چاہیں۔ قرآن مبین کا نام فرقان بھی ہے۔ حق و باطل کا فرق اس سے بڑھ کر اور کس چیز سے معلوم ہو سکتا ہے؟ مگر تعلیم نبوی سے مستغنی ہو کر صرف قرآن مبین سے اگر آپ کام نکالنا چاہیں گے تو آپ قرآن کا اتباع تو نہ کر سکیں گے، البتہ اپنی خواہشِ نفس کا تابع قرآن مجید ہی کو کرتے رہیں گے۔ اس لئے کہ قرآن مجید سے ہمیں ہدایتیں ملیں گی، اوامر و نواہی ملیں گے، مگر وہ تعامل، وہ دستور جو عہد نبوی و عہد خلفائے راشدین میں مروّج تھا، اس کے تمام جزئیات کہاں سے مل سکتے ہیں؟ اگر ہم ان حدیثوں کے ذخیروں میں سنت کی جستجو نہیں کرتے ہیں تو پھر ہمیں صرف قرآن مجید سے بطورِ خود اپنے لئے ایک سنت اختراع کرنا پڑے گا۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ آپ میرے اختراع کو قبول کریں اور میں آپ کے اختراع کو۔ پھر ہر شخص کا مذہب، ہر شخص کا دین دوسرے سے بالکل جداگانہ ہوگا۔ یہاں تک کہ ایک گھر میں باپ بیٹے، بیٹی داماد، بیوی بیٹی اور بہو سب کا دین الگ الگ ایک دوسرے سے مختلف ہوگا۔ اور پھر ہر شخص اپنی خواہشِ نفس ہی کے مطابق معنی و مطلب نکالے گا خصوصاً اس زمانے میں کہ قرآنی زبان سے پوری طرح واقف اہلِ عجم کیا ہوں گے کہ اہلِ عرب، یہاں تک کہ خاص مکے اور مدینے

کے لوگ بھی نہیں۔ الا ماشاء اللہ۔ عرب میں بھی اب قرآنی عربی نہیں بولی جاتی جس طرح اہل عجم صرف و نحو اور لغت و معانی و بیان کی کتابیں پڑھ کر قرآنی عربی حاصل کرتے ہیں، اسی طرح اہل عرب بھی۔ البتہ ان کو اہل عجم سے زیادہ سہولت حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ان کی مادری زبان پھر بھی عربی ہی ہے، بگڑی ہی ہوئی عربی سہی۔

غرض اگر احادیث کے ذخیروں کو بالکل چھوڑ دیا گیا تو پھر احادیث سے زیادہ غیر معتبر ذرائع کو قرآن فہمی کے لئے استعمال کرنا پڑے گا۔ اور تواریخ و فلسفہ حتیٰ کہ انسائیکلو پیڈیا وغیرہ کی دریوزہ گری کرنا پڑے گی۔

فَرَّ مِنَ الْمَطَرِ وَ قَرَّ تَحْتَ الْمِيزَابِ۔

کیا تمام حدیثیں غیر معتبر ہیں؟ ہرگز نہیں، اس لئے کہ جھوٹے سے جھوٹا راوی بھی اگر ہر شخص کے سامنے، ہر جگہ ہر حدیث جھوٹی ہی بیان کیا کرتا، تو اس کا نشا کبھی پورا نہ ہو سکتا۔ یقیناً باخبر لوگوں کے سامنے وہ سچی ہی حدیثیں روایت کرتا تھا۔ تاکہ اس کی صداقت کی شہادت سچے لوگوں کی زبانوں سے عام لوگوں تک پہنچتی رہی۔ اس کے بعد ناواقفوں میں وہ جھوٹی اور من گھڑت حدیثیں بیان کیا کرتا تھا۔ بلکہ بعض چالاک راوی تو یہ کرتے تھے کہ اپنے چند خاص ایجنٹ رکھتے تھے اور جھوٹی جھوٹی ایسی ایسی حدیثیں جن کو وہ اپنے باخبر شاگردوں سے روایت نہیں کر سکتے تھے۔ جن میں اُن کا جھوٹ چھپ نہیں سکتا تھا، ان کو وہ اپنے ان ایجنٹوں کے ذریعے ایسے ایسے مقامات پر بھیج کر روایت کراتے اور شائع کراتے تھے، جہاں باخبروں اور ناقدوں کا فقدان ہوتا تھا۔ چنانچہ کوفے کے دو سب سے بڑے محدث ابو اسحٰق السبیعی اور سلیمان بن مہران الاعمش جو شیعی تھے مگر شیعوں سے زیادہ سنیوں میں معتبر سمجھے جاتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ حضرت عبداللہ بن المبارک، حضرت معن بن عیسےٰ اور جوزجانی وغیرہ ان دونوں سے بہت خفا تھے۔ اور لوگوں سے کہتے تھے کہ افسد حدیث اهل الكوفة ابو اسحٰق السبيعي و اعمشكم هذا۔ یعنی اہل کوفہ کی حدیثوں کو ابو اسحٰق السبیعی اور تمہارے اس اعمش نے برباد کر ڈالا (میزان الاعتدال ج ۱ ص ۴۲۳ و ص ۴۲۴) مگر کوفے کی حدیثوں کے یہی دو مرکز بھی تھے۔ جتنی حدیثیں کوفے سے شائع ہوئیں، ۹۵ فی صدی انہیں دونوں سے۔ اس لئے حدیثوں کا ہر مجموعہ ان دونوں کی حدیثوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہ دونوں ہمعصر تھے اور ایک دوسرے سے روایت کرتے تھے۔ دونوں نے مل کر باہمی مشورے سے (غالباً) کچھ ایسے ایجنٹ پیدا کر لئے تھے جو صرف انہیں دونوں سے حدیثیں لے لے کر خراسان، نیساپور، طبرستان اور شام و عراق و مصر کے دیہاتوں میں جا جا کر پھیلایا کرتے تھے۔ بعض ایجنٹ ان کے تھے اور بعض اُن کے۔ اور بعض دونوں کے مشترک۔ انشاء اللہ میں اہل کوفہ کی حدیثوں

پر ایک مستقل تبصرہ لکھ کر جلد ہی ہدیۂ ناظرین البیان کروں گا۔ اس میں یہ بحث بھی آجائے گی۔

غرض یہ ہے کہ حدیثوں کی صحت و عدم صحت کا دراصل یہی معیار واحد نہیں ہے کہ جس کے سلسلۂ روات میں کچھ وضاع و کذاب ہوں، وہ حدیث موضوع یا مکذوب ہے۔ یہ بھی ایک معیار ہے مگر ہو سکتا ہے کہ وہ حدیث صحیح ہو، اس لئے کہ جھوٹے لوگ بھی کبھی سچی بات بول جاتے ہیں۔ اسی طرح جو حدیث عالی نہیں بلکہ اعلیٰ اسناد سے مروی اور بخاری و مسلم دونوں ہی میں کیوں نہ موجود ہو، یہ ضروری نہیں کہ وہ صحیح ہی ہو۔ مقامات بدیع ہمدانی میں کیا خوب قطعہ ہے:

اِسْمَعْ نَصِيحَةَ نَاصِحٍ ‏ ‏ جَمَعَ النَّصِيحَةَ وَالْمِقَةَ[1]

اِيَّاكَ وَاحْذَرْ اَنْ تَكُو ‏ ‏ نَ مِنَ الثِّقَاتِ عَلَى الثِّقَةِ

اس ناصح کی نصیحت سنو جس نے نصیحت اور محبت دونوں کو جمع کر لیا ہے۔ خبردار اس سے بچتے رہو کہ ثقہ لوگوں پر ہمیشہ وثوق کیا کرو۔

صحت حدیث کا اصلی معیار مطابقت قرآن مجید سے ہے اور بس اگرچہ یہ معیار بھی ظنی ہی ہے۔ اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ ایک جھوٹا شخص پہلے چند ایسی من گھڑت بیان کرے جو قرآن کے خلاف نہ ہوں، بلکہ قرآنی منشاء کے بالکل مطابق ہوں۔ صرف اس لئے کہ لوگ مطابقت قرآن کی وجہ سے اس کے قبول کر لینے میں تامل نہ کریں۔ اور رفتہ رفتہ وہ لوگوں میں اپنا اعتبار پیدا کر لے۔ پھر کچھ مخالف قرآن حدیث بھی گھڑ کر روایت کرنے لگے۔ اگر کوئی معترض ہو تو کوئی تاویل پہلے سے سوچ رکھے۔ اور معترض کو الٹی سیدھی تاویل کر کے سمجھا دے۔ مگر وہ ایسے شخص کے سامنے جو معترض ہو ایسی حدیث بیان ہی کب کرے گا۔ عبید بن السباق[2] سے روایت کرنے والے بہت سے تھے مگر عبید نے جمع قرآن کی روایت صرف زہری سے بیان کی، اس لئے کہ یہ ہر رطب و یابس روایت کو لکھ لیتے اور کوئی چون و چرا نہیں کرتے۔ زہری کے ہزاروں شاگرد تھے۔ امام مالک، عمر بن عبدالعزیز، عمرو بن دینار، صالح بن کیسان، اوزاعی، ابن ابی ذئب، ابن عیینہ وغیرہم مگر زہری نے جمع قرآن کی حدیث کے لئے صرف چار شخصوں کو منتخب کیا۔ ایک تو اپنے کاتب کو جو ان کے ہم وطن[3] اور کاتب گویا پرائیویٹ سکرٹری تھے یعنی شعیب بن ابی حمزہ۔ مگر ان سے بھی صرف ایک ہی

---

[1] بعض نسخ میں [illegible] [2] عبید بن السباق سے بخاری میں اس جمع قرآن والی حدیث کے سوا اور کوئی حدیث مروی نہیں ہے۔ منہ

[3] زہری مدنی کہے جاتے ہیں اور یہی مشہور ہے، مگر یہ غلط ہے۔ یہ درحقیقت "ایلی" تھے۔ ان کا وطن آبائی "ایلہ" تھا۔ یہ خود بھی ایلہ ہی میں رہتے تھے۔ یہ بنی زہرہ بھی نہ تھے بلکہ یہ موالی بنی زہرہ سے تھے۔ مفصل بحث مع دلائل قاطعہ میری کتاب "جمع قرآن" میں ہے۔ منہ

شخص ابو الیمان روایت کرتے ہیں، جن کا ان سے سماع حدیث مشتبہ ہے۔ (تہذیب التہذیب ترجمہ ابو الیمان) دوسرے ابراہیم بن سعد ہیں جن کے متعلق تہذیب التہذیب ترجمہ زہری میں ہے کہ ان کی حدیثیں زہری سے کچھ یوں ہی سی ہیں کیوں کہ یہ زہری کی وفات کے وقت کم سن تھے۔ زہری سے سماع حدیث کا وقت نہیں پایا۔ تیسرے یونس بن یزید تھے جو زہری کے ہم وطن تھے۔ اور حضرت معاویہؓ کے غلام آزاد کردہ تھے۔ امام احمد بن حنبل نے ان کو زہری ہی کی حدیثوں میں خصوصیت کے ساتھ منکر حدیثیں روایت کرنے والا لکھا ہے۔
(دیکھو تہذیب التہذیب آخر جلد ۱۱ ترجمہ یونس بن یزید)

اب صرف ایک رہ گئے عبد الرحمٰن بن خالد یہ شیعوں کے یہاں ثقہ ہیں اور سنیوں کے یہاں منکر الحدیث
(دیکھو تہذیب التہذیب)

بس یہی چار ہیں جو اس حدیث جمع قرآن کو صرف زہری سے روایت کرتے ہیں شعیب سے صرف ابو الیمان اپنی سماعت بیان کرتے ہیں اور عبد الرحمٰن بن خالد سے صرف لیث بن سعد روایت کرتے ہیں اور یونس سے بھی ۔۔۔ اور عثمان بن عمرو اور ابراہیم بن سعد سے ان کے بیٹے یعقوب اور دو شخص اور موسیٰ بن اسمٰعیل اور ابو ثابت۔ اور یہ چھ راوی امام بخاری سے کہتے ہیں۔ بس یہی سلسلہ روایت ہے جمع قرآن بعہد صدیقی کی داستان کا۔ امام بخاریؒ سے اوپر چھ راوی اور ان چھ سے اوپر چار۔ چاہے وہ چار کیسے ہی ہوں، اس چھ اور چار کو سب دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اتنے لوگ روایت کر رہے ہیں مگر اس کو نہیں دیکھتے کہ اُن چار کے اوپر تو صرف اور تنہا ابن شہاب زہری ہیں اور زہری سے اوپر تنہا عبید بن السباق، اور عبید سے اوپر تنہا زید بن ثابت اور عبید بن سباق نے زید بن ثابت کو کبھی دیکھا بھی نہ ہوگا۔ مگر اس حدیث پر ایسا ایمان ہے کہ اگر کوئی انکار کرے تو عجب کیا کہ فوراً کفر کا فتوٰے دے دیا جائے۔ اور یہی حال ہے نقل مصحف بعہدِ عثمانی والی حدیث کا۔ کہ تنہا زہری ہی اس کو بھی روایت کرتے ہیں صرف حضرت انس سے۔ میں نے مفصل تنقید ان دونوں حدیثوں کی کتاب "جمع قرآن" میں کی ہے۔ یہاں ناظرین کی واقفیت کے لئے اتنی بحث لکھ دی۔

مطلب یہ ہے | کہ ان تمام باتوں کے باوجود جب آپ کے سامنے کوئی حدیث آ جائے۔ قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ (رسول کی آواز پر اپنی آواز بلند نہ کرو) کو نہ بھولئے۔ یہ کہیئے کہ حدیث ہے تو ہوا کرے، ہمارے نزدیک اس مسئلے میں قرآن مجید کا یہ حکم ہے۔ یا فلاں نے یہ کہا ہے۔ جب معلم کتاب اللہ کی تعلیم کے نام سے ایک چیز آپ کے سامنے تعلیم کتاب ہی کی حیثیت سے

پیش کی جاتی ہے تو اس کو نہایت دیانت داری کے ساتھ سُن لیجئے۔ اور قرآن مبین کے سامنے پیش کرکے دیکھئے۔ اگر واقعی یہ حدیث قرآن کی کسی آیت کی تعلیم و تبیین ہے تو پھر سرِتسلیم خم کردینے کے سوا کسی مسلم کو اور کوئی چارہ نہیں۔ اور اگر قرآن مبین کے خلاف ہے تو چاہے بخاری میں ہو یا مسلم میں یا مؤطا یا کسی تفسیر میں، کیسے ہی عالی نہیں بلکہ اعلیٰ ترین اسناد کے ساتھ کیوں نہ مروی ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق فَرُدُّوْهُ۔ اس کو رَدّ کردو، ٹھکرادو۔ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ۔ یہی ٹھیک دین ہے۔

واجب الاتباع سُنّت ہے، نہ کہ ہر حدیث "حدیث" ہر اُس قول کو کہتے ہیں جو رسول صلعم یا صحابہ سے منسوب ہو، یا کسی راوی اول نے کسی فعل یا تقریر کو اپنے لفظوں میں بیان کیا ہو اور رسول صلعم یا صحابہ کی طرف اس کی نسبت کی ہو۔ صحابہؓ کے بعد تابعین اور بعض نے اتباع تابعین کی طرف بھی قول یا فعل یا تقریر کی نسبت کو حدیث میں داخل کیا ہے۔

مگر "سنت" اُس دینی دستور اور مذہبی رواج کا نام ہے، جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وقت میں قائم فرمایا تھا اور پھر آپ کے بعد تک وہ دستور و رواج دینی ہی حیثیت سے اُسی طرح قائم رہا۔ کم سے کم عہدِ فاروقی تک۔ کیوں کہ خیر القرون کی مدت حضرت فاروق اعظمؓ کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔

خیر القرون حدیث میں خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم۔ سب سے بہتر زمانہ میرا ہے، پھر وہ جو ان سے متصل ہیں پھر وہ جو ان سے متصل ہیں۔ اس حدیث کو ربڑ کی طرح کھینچا گیا اور تابعین بلکہ اتباع تابعین تک پہنچا دیا گیا۔ سمجھا گیا کہ جب تک ایک صحابی بھی زندہ ہے۔ عہدِ اول باقی ہے اور جب تک ایک تابعی بھی زندہ ہے عہدِ دوم باقی ہے اور جب تک ایک تبع تابعی بھی زندہ ہے عہدِ سوم باقی ہے۔ جو خلافِ عقل اور خلافِ واقعہ ہے۔ خلافِ واقعہ اس طرح کہ جتنے فسادات اسلام میں پیدا ہوئے وہ سب حضرت فاروقِ اعظمؓ کی وفات کے بعد ہوئے۔ "ظہورِ کذب" مسلمانوں میں حضرت فاروقِ اعظمؓ کی وفات کے بعد ہی سے شروع ہو گیا اور منافقین عجم و ملاحدہ کی خفیہ ریشہ دوانیاں خاص دینی مرکز یعنی مدینہ منورہ میں بڑی رازداری کے ساتھ شروع ہو گئیں۔ اگرچہ اس ریشہ دوانی کا اصل مرکز خراسان اور پھر اس کے ماتحت کوفہ بصرہ، مصر وغیرہ مختلف مراکز میں کام کرنے والے کام کر رہے تھے اور اپنا ایک مرکز خاص دینی مرکز یعنی مدینہ منورہ میں بھی اور مکہ میں بھی بنا رکھا تھا۔ ان منافقین ہی کی ریشہ دوانی تھی جس نے حضرت ذوالنورینؓ کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے کرکے اُن کو شہادت تک پہنچایا، اور پھر کیا کیا ہوا۔ استیصال دولت بنی امیہ تک

کی تاریخ پڑھ جائیے اور یہ سب اتباع تابعین بلکہ تابعین تک کے سامنے ہوا۔ اور جنگ جمل و صفین و حادثہ کربلا و سانحہ حرۃ وغیرہ تو صحابہ ہی کے زمانے میں ہوا۔ اور انہیں کے ہاتھوں سے انجام دلوایا گیا۔ تو فرمائیے کیا یہ سب خیر القرون کے برکات تھے؟

اور عقل کے خلاف ہے اس لئے کہ ہر قرن میں ہر چند لاکھوں اور کروڑوں آدمی ہوتے ہیں، مگر اُس قرن کا صاحبِ قرن ایک ہی شخص از روئے محاورہ و عقل قرار دیا جاتا ہے۔ کوئی آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ موجودہ عہد ملکہ وکٹوریہ کا ہے۔ حالانکہ ہزاروں آدمی اس وقت لندن اور ممالک محروسہ برطانیہ میں ملکہ وکٹوریہ کے دیکھنے والے موجود ہوں گے۔ ہر صاحبِ قرن کے مرنے کے بعد اس کا قرن ختم ہو جاتا ہے اور اب جو صاحبِ قرن ہو جاتا ہے، اس کے نام سے۔ وہ قرن منتسب و منسوب ہو کر زبان زد ہوتا ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آں حضرت صلعم کا قرن ختم ہو گیا۔ اور اب چوں کہ صاحبِ قرن حضرت صدیق اکبر ہوئے، اس لئے حضرت صدیق اکبر کی خلافت دوسرا قرن شروع ہو گیا، جو حضرت صدیق اکبر کا قرن ہوا۔

اسی طرح حضرت صدیق اکبر کی وفات کے بعد دوسرا قرن، جو قرنِ صدیقی تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ اور جب حضرت فاروق اعظم رض خلیفہ ہوئے تو تیسرا قرن فاروقی شروع ہو گیا۔ حضرت فاروق اعظم رض کی شہادت کے بعد یہ تیسرا قرن بھی ختم ہو گیا۔ حضرت ذو النورین رض کی خلافت سے چوتھا قرن جو قرنِ عثمانی ہوا شروع ہو گیا۔ بعض روایتوں میں ثم الذین یلونهم کا لفظ تین بار ہے۔ اس لئے اس روایت کے رو سے اس قرنِ عثمانی کو بھی خیر القرون میں داخل کر سکتے ہیں۔ اور کہا بھی جا سکتا ہے کہ مسلمانوں میں اصل فتنہ تو حضرت ذو النورین رض کی شہادت کے بعد سے شروع ہوا۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ وہی پہلی روایت قوی بھی ہے اور واقعے کے مطابق بھی ہے۔ اس لئے کہ ریشہ دوانی کا آغاز قرنِ عثمانی ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ اور اسی ریشہ دوانی کا نتیجہ حضرت ذو النورین رض کی شہادت ہوئی۔ اس لئے ثم یفشو الکذب[1] کی پیشین گوئی حسبِ روایت صحیحہ چوتھے قرن میں پوری اُتری۔ کون نہیں جانتا کہ اس ریشہ دوانی میں وہی لوگ تھے جو اپنے کو تابعی کہتے تھے۔ اور حضرت ذو النورین

---

[1] ثم یفشو الکذب سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ تین دور خیر القرون کے ختم ہونے کے بعد جو کذب ہوا تو اس کے ذمہ دار چوتھے قرن کے صاحب قرن ہوئے۔ اس پیشگوئی کے کسی لفظ یا اشارے سے بھی یہ نہیں نکلتا۔ پیشین گوئی اسی قدر ہے کہ چوتھے قرن میں کذب کا ظہور ہو جائے گا۔ چنانچہ ہوا۔ اس لئے حضرت ذو النورین رض یا حضرت علی مرتضے رض پر کسی طرح کا بھی اس حدیث کی وجہ سے الزام نہیں عائد ہو سکتا۔ نہ ان دونوں کی کوئی تنقیص اس حدیث سے نکلتی ہے۔ منہ عفی

کو شہید کرنے والے تابعین ہی تھے۔ پھر حضرت علی مرتضےٰ رضؓ کی خلافت کے بعد جب پانچواں قرن شروع ہوا اور مسلمانوں میں باہمی خوں ریزی کا بازار گرم ہوگیا تو کیا اس فتنے میں صحابہ تک مبتلا نہ ہوتے؟ اگرچہ پیش پیش تابعین ہی رہے۔ اور اصل ہنگامہ آرائی تابعین ہی کی تھی۔ صحابہ تو صرف آلہ کار بنائے گئے۔

صحابہ کا دور ختم ہوتے ہوتے دوسری ہی صدی میں فرقہ بندی پیدا ہوگئی اور مسلمان فرقوں میں بٹ گئے۔ کیا یہی تابعین و اتباع تابعین ہی نہ تھے جو اس فرقہ بندی کی بنیادیں قائم کر رہے تھے؟ جھوٹی حدیثوں، جھوٹی قراٗتوں اور جھوٹی تفسیروں کا انبار انہیں تابعین و اتباع تابعین کے سوا اور کس نے لگایا؟ ان تمام واقعات وحالات کو جانتے بوجھتے خیر القرون کی ڈوری کو ربڑ کی طرح کھینچ کر ان وضاعین وکذابین کی گردنوں میں لپیٹ دینا جو تابعین و اتباع تابعین کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھے، خیر القرون کی کتنی بڑی توہین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کی کیسی کھلی تنقیص ہے۔ اسی کھینچ تان کا نتیجہ ہے کہ کتنے وضاعین وکذابین کو ائمہ رجال کوفیٌ تابعیٌ ثقۃٌ۔ بصریٌ تابعیٌ ثقۃٌ لکھ کر چھوڑ دیتے ہیں، وہاں تو مجبور ہوجاتے ہیں جہاں کافی جرح اگلے ناقدین حدیث نے کردی ہے، مگر جہاں کم جرحیں منقول ہیں وہاں یا تو ان کا ذکر ہی نہیں کرتے۔ یا ذکر کرکے اس کی تردید کردیتے ہیں، مگر یہ نہیں دیکھتے کہ یہ حدیثیں کیسی کیسی روایت کررہے ہیں۔

تفسیری حدیثیں | بہتر ہے کہ ان کے متعلق حافظ ابن حجر کی وساطت سے سرخسی کا قول نقل کردوں۔ تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۱۲۳ میں ہے:

قال ابو قدامۃ السرخسی قال یحیی القطان تساھلوا فی اخذ التفسیر عن قوم لا یوثقونھم فی الحدیث ثم ذکر الضحاک و جویبراً و محمد بن السائب الکلبی قال ھؤلاء لا یحمد حدیثھم و یکتب التفسیر عنھم۔	ابو قدامہ سرخسی نے کہا کہ یحییٰ بن سعید القطان نے فرمایا کہ لوگوں نے تساہل برتا تفسیری روایتوں کے لینے میں ایسی جماعت سے جن کو حدیث میں قابل وثوق نہیں سمجھتے۔ پھر ذکر کیا ضحاک بن مزاحم جویبر بن سعید اور محمد بن السائب الکلبی کا۔ اور کہا کہ یہ لوگ ایسے ہیں کہ ان کی حدیث کا قبول کرنا جائز نہیں ہے مگر ان کی بیان کردہ تفسیر لکھی جاتی ہے۔

ضحاک تو خراسانی ہیں جو منافقین ایران کا اصل مرکز تھا۔ اور باقی دونوں کوفی ہیں جو ان کا دوسرا مرکز تھا۔ یحییٰ بن سعید القطان نے اسمٰعیل السدی الکوفی کا ذکر نہ کیا تعجب ہے کلبی اور سدی دونوں کا پلہ کذب وافترا میں بھی برابر ہے اور پھر تفسیری روایتوں میں دونوں کی مقبولیت بھی یکساں ہے۔ حالاں کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم پر افترا و بہتان باندھ سکتا ہے۔ کیا وہ قرآن مجید میں تحریف معنوی و تصحیف لفظی نہیں کر سکتا؟ احکامی حدیثوں کے موقع پر جس کو وضاع و کذاب کہہ رہے ہیں، وہی شخص تفسیری روایتوں میں ثقہ و معتبر کس طرح ہو جا سکتا ہے؟ کوئی مجھے سمجھا دے!

اختلاف قرآت یہی حال اختلاف قرآت کا ہے۔ ایک حدیث کہی جاتی ہے اُنزِل القرآن علےٰ سبعۃ احرف یعنی قرآن سات حرفوں پر نازل ہؤا۔ "سات حرفوں" کے کیا معنی ہیں؟ آج تک قطعی طور سے معلوم نہ ہو سکا۔ بعض روایتوں سے یہاں تک اجازت صاف طور سے نکلتی ہے کہ جس طرح جی چاہے پڑھیے۔ بس اتنا خیال رکھیے کہ حلال حرام نہ ہو جائے اور حرام حلال نہ ہو جائے۔ رحمت کا مفہوم عذاب سے اور عذاب کا مفہوم رحمت سے نہ بدل جائے جس کے معنی تو یہ ہوئے کہ الفاظ فقرے سب کچھ بدل جائیں۔ صرف اعراب ہی نہیں، مفہوم میں بھی تبدیل و تغییر ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ البتہ بالکل ضد نہ ہو جائے۔ جیسا کہ احمد بن منصور سے ابن جریر نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضہ سے فرمایا کہ یا عمر القرآن کلہ صواب مالم یجعل رحمۃ عذابا او عذابا رحمۃ۔ اے عمر رضہ قرآن سب ٹھیک ہے جب تک پڑھنے والا اس قدر تبدیلی الفاظ میں نہ پیدا کر دے کہ رحمت کو عذاب اور عذاب کو رحمت کر دے۔ (تفسیر ابن جریر ج ۱ ص ۱)

بیسیوں حدیثیں مختلف طُرق سے طرح طرح کے اختلاف و اضطراب و تضاد کے ساتھ سبعہ احرف والی ان لوگوں نے روایت کر دی ہیں اور اسی بنا پر اس حدیث کو متواتر کہتے ہیں۔ مگر ایک حدیث بھی ایسی نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بتا دیا ہو کہ وہ سات حروف کون کون ہیں۔ یا کسی صحابی نے آپ سے ان سات حرفوں کی تعیین کی درخواست کی ہو۔ یہاں تک کہ بعض روایتوں میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض صحابہ نے اپنے باہمی اختلاف کو بیان کیا تو آپ چپ ہو رہے حضرت علی رضہ نے ان لوگوں سے کہا کہ جاؤ جس کو جس طرح بتایا گیا ہے وہ اسی طرح پڑھا کیے۔ راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد سے ہم لوگ اسی طرح قرآن پڑھتے ہیں کہ ایک قرأت دوسرے سے مختلف ہوتی ہے (تفسیر ابن جریر) غرض اس گتھی کو نعوذ باللہ من ذلک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے الجھا ہی ہؤا چھوڑ دیا۔

محدثین اس سے بھی سخت انکار کرتے ہیں کہ یہ جو قرار سبعہ کی سات قرأتیں مشہور ہیں، وہ اس حدیث میں مراد نہیں ہیں۔ جو شخص ان قراء سبعہ کی قراءتوں کو اس حدیث سے مقصود سمجھتا ہے، اس کو محدثین سخت جاہل کہتے ہیں (فتح الباری جلد ۲ ص ۴۳۱ مطبوعہ مطبع انصاری دہلی)۔ یہ اس لئے کہ سات ہی قرأتیں تو ان قاریوں کے

یہاں ہیں نہیں. سات سے دس اور پھر دس سے چودہ اور پھر اس پر بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ تو اگر اس حدیث کی پابندی کی جائے، تو پھر سات سے فاضل قرأتوں کو کیا کریں گے؛ اس لئے ان قرأتوں کا تعلق اس حدیث ہی سے تسلیم نہیں کیا مگر بعض لوگوں نے یہ کہا کہ سات کی تعداد محض کثرت ظاہر کرنے کے لئے ہے، نہ کہ تعیین و انحصار مقصود ہے۔ (فتح الباری ص۲۲ ج۹) میرے زیر تصنیف پوری ایک کتاب ہی ہے جس کا نام "المنزل علی سبعۃ احرف" ہوگا۔ ان شاء اللہ المستعان میں جلد ہی اس کو مکمل کر دوں گا۔ اس میں اس حدیث اور اختلاف قرأت پر مفصل بحث ان شاء اللہ تعالیٰ آئے گی۔ اس مضمون میں اس کی گنجائش نہیں کہ میں اس پر بحث کروں۔

قراء الامۃ اس نام کی ایک مکمل کتاب عربی زبان میں میری تالیف موجود ہے۔ جس میں تقریباً تین سو قاریوں کے حالات مذکور ہیں۔ مثلاً طاؤس القراء آبان بن ابی عباش ابو اسمٰعیل البصری۔ یہ تو الی میں سے تھے۔ محدثین نے ان کو منکر الحدیث، غیر ثقہ لکھا ہے۔ اور شعبہ تو قسم کھا کر ان کو جھوٹا کہتے تھے اور کہتے تھے کہ ان کی حدیث روایت کرنے سے زنا کرنا بہتر ہے۔

احمد بن محمد بن عبداللہ ابو الحسن البزی۔ یہ مکی کہے جاتے ہیں، امام القراء ہیں عقیلی، ابوحاتم، ابن ابی حاتم وغیرہم ائمہ رجال ان کو منکر الحدیث کہتے ہیں۔ ختم قرآن کے وقت سورۃ والضحیٰ سے آخر تک ہر سورہ کے خاتمہ پر تکبیر کہنے کی بدعت انہیں کی نکالی ہوئی ہے اور اس کی حدیث انہیں نے گھڑی ہے۔ محدثین اس حدیث کو "منکر" کہتے ہیں اور سبھوں نے اس کے قبول کرنے سے انکار کیا۔ مگر قاریوں میں یہ بدعت جاری ہے اور سنت سمجھی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ابوعمرو الدانی نے اپنی کتاب تیسیر میں بھی اس کو نقل کیا ہے۔

حسن بن عبدالرحمٰن القراء الاحتیاطی۔ مشہور امام القرأت ہیں بسلسلۂ اساتذہ قرأت میں ان کا نام نامی بڑے زوروں سے لیا جاتا ہے مگر ائمہ حدیث ان کو غیر ثقہ، منکر الحدیث اور کذاب کہتے ہیں۔

ابو علی الاہوازی۔ شام کے امام القراء صاحب تصانیف تھے مگر موضوع حدیثیں ہی نہیں بلکہ قرأتیں بھی روایت کیا کرتے تھے۔ ابن حجر لسان المیزان میں لکھتے ہیں: کان من اکذب الناس فیما یدعی من الروایات فی القرات۔ یعنی قرأتوں کی روایتوں کا جو دعوے کرتے ہیں، ان میں یہ تمام آدمیوں سے زیادہ جھوٹے ہیں۔ مگر کون قاری ہے جو ان قرأتوں پر ایمان نہ رکھتا ہو۔

حفص بن سلیمان الکوفی۔ یہ وہ بزرگوار ہیں، جن کی طرف قرآن مجید کی قرأت متواترہ منسوب کی جاتی ہے حالاں کہ حفص کے والد ماجد کی پیدائش کے قبل سے یہی ایک قرأت متواترہ عہد نبوی سے چلی آ رہی ہے۔

مگر اسی قراتِ متواترہ کو مشتبہ کرنے کے لئے اس کی نسبت ایک ایسے شخص کی طرف کر رکھی ہے جس کو ہر محدث نے تقریباً برا کہا ہے۔ کوئی منکر الحدیث کوئی وضاع کوئی کذاب وغیرہ کہہ رہا ہے۔ غالباً سخت سے سخت جرح کا کوئی ایسا لفظ نہیں جو اُن کے لئے اٹھا رکھا گیا ہے۔

حمزہ بن حبیب الزیات۔ یہ سات قاریوں میں سے ایک اور قاری ہیں۔ ان کا حال بھی قریب قریب حفص بن سلیمان ہی کے ہے۔ عبدالرحمٰن بن مہدی مشہور محدث کہا کرتے تھے کہ اگر مجھ کو اختیار ہوتا تو جو شخص حمزہ کی قرات سے قرآن پڑھتا تو میں اس کی پیٹھ لال کر دیتا۔ بعض محدثین نے فتوے دیا تھا کہ جو شخص حمزہ کی قرات سے نماز میں قرآن پڑھے گا اس کی نماز نہ ہوگی۔ امام احمد بن حنبل اُن کی قرات نماز میں مکروہ تحریمی سمجھتے تھے۔ ابوبکر بن عیاش مشہور قاری ان کی قرات کو بدعت کہتے تھے۔ وغیرہ ذالک۔ مگر پھر بھی قاریوں میں ان کی قرات مقبول ہی رہی۔

شہر بن حوشب۔ مشہور قاری تھے۔ بیت المال کے نگران مقرر کئے گئے تو روپے کی ایک تھیلی پار لی جس پر ایک شاعر نے کہا ہے

لقد باع شهر دينه بخريطة   فمن يأمن القراء بعدك يا شهر

شہر نے اپنا دین ایک تھیلی پر بیچ ڈالا   تو اب اے شہر تیرے بعد قاریوں پر کون بھروسا کرے گا

[illegible] محدثین مغفرت [illegible] قیاس کو نہ گلستان میں بھاری ہوا۔

یہ عالم [illegible] سے راویاں [illegible] تفاسیر قرآنیہ کا [illegible] نہ کرو [illegible] کے قول پہ

اعتبار [illegible] کہتے [illegible] ہم کو [illegible]

ظن کے اصطلاحی معنی | محترم مرتب [illegible] اسلامی دنیا [illegible] خطیب کو جو [illegible] ظن کا بہت دور ہے۔ کہ محدثین نے حدیثوں کو جو ظنی کہا ہے وہ عرف عام کی اصطلاح بھی نہیں، بلکہ "ظنی" کا لفظ تو محدثین کی ایک فنی اصطلاح ہے۔ اس معنی میں کہا ہے مگر دونوں میں سے کسی صاحب نے اصول حدیث کی کسی کتاب کی کوئی عبارت ثبوت میں پیش نہیں کی۔ اور نہ واضح طور سے یہ بتایا کہ اصطلاح عرفی و اصطلاح فنی میں کیا فرق ہے۔ میرا یہ دعویٰ ہے کہ محدثین نے جو ان حدیثوں کو ظنی کہا ہے، وہ اسی معنی میں کہا ہے جس معنی میں عام لوگ ظن کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ دنیا کا کوئی محدث یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ محدثین کی اصطلاح والا ظن عرفِ عام کے ظن سے کوئی جداگانہ معنی رکھتا ہے۔ ورنہ هاتوا برهانكم ان كنتم صادقين مگر بالبينات والزبر۔ اصول حدیث

سوچ سمجھ کر قائم کئے ہیں ان شرائط کے یہ حدیث مطابق ہے۔ اسی طرح حدیث حسن کے معنی یہ ہیں کہ جو شرائط حسن محدثین نے قائم کئے ہیں اُن شرائط کے مطابق ہے حسن صحیح کے معنی یہ ہیں کہ حُسن اور صحت دونوں کے شرائط اسی حدیث میں موجود ہیں۔ مگر وہ شرائط ایسے ہرگز نہیں ہیں کہ کسی حدیث کو بھی قطعی الصحت ثابت کر سکیں۔ اسی لئے محدثین لکھتے ہیں کہ کسی حدیث کا "صحیح الاسناد" ہونا اس کی صحت کی دلیل نہیں۔

متواتر حدیثیں | یہ تو دنیا بھی نہیں کہہ سکتا کہ متواتر کوئی حدیث ہی نہیں۔ البتہ قولی حدیثیں متواتر نہیں ملتیں۔ جیسا کہ خود محدثین محققین کا اعتراف ہے۔ اسی طرح تقریری بھی کوئی حدیث متواتر نہیں۔ صرف فعلی حدیثیں متواتر ملتی ہیں۔ مگر یہ متواتر عمل کے اجزاء کو پھر انہیں مختلف و متضاد حدیثوں ہی نے غیر متواتر کر کے رکھ دیا جیسا کہ میں نے نماز کی مثال پہلے ہی پیش کی ہے کہ نماز سے بڑھ کر تواتر غالباً اسلام کے کسی رکن دین میں نہ ہوگا۔ اور نہ اس سے بڑھ کر اہم کوئی فریضہ اسلامیہ ہے۔ مگر اذان و اقامت و تحریمہ سے لے کر نماز بلکہ نماز کے بعد دعا یا تسبیح تک کے متعلق یہ متضاد حدیثوں کا اتنا انبار ہے کہ صرف لفظ الصلوٰۃ کا تواتر باقی رہا۔ کہ صلوٰۃ ہے کیا؟ اس کا جواب متواتر استناد کے ساتھ نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح صوم و زکوٰۃ و حج کو بھی صرف ان کے ناموں کو تواتر کہہ لیجئے مگر مسمی ان کے ہرگز متواتر الاجزاء نہیں۔

متواتر حدیث کی تعریف | متواتر حدیث کی یہ تعریف کہ صحابہ، تابعین اور اتباع تابعین تینوں عہدوں میں جس حدیث کی روایت ایک جماعت اتنی بڑی کر رہی ہو جن کے متعلق یہ محال سمجھا جائے کہ اتنی بڑی جماعت تین تین دور میں کذب پر متفق ہو گئی ہو۔ میں نے یہ تعریف محتاط محدثین کی لکھی ہے۔ ورنہ سہولت پسند طبائع نے تو اس کو بہت ہلکا کر دیا ہے اور جماعت سے صرف تین فرد کا ہر دور میں روایت کر دینا تواتر ثابت کرنے کے لئے کافی قرار دیا ہے۔ بعض صرف دو ہی دور کی قید لگاتے ہیں۔

میں محتاط محدثین ہی کی تعریف پر بحث کرتا ہوں کہ اس تعریف کو سُن کر وضاعین و کذابین خراسان و کوفہ و بصرہ و مصر وغیرہ کی روحیں ہنس رہی ہوں گی۔ اگر وہ بہشتی ہوں گی یا اُن تک کسی فرشتے نے خبر پہنچائی ہوگی۔ وہ کہتی ہوں گی کہ تم اس کو محال کیا کہتے ہو۔ بارہا کردیم و شد۔ وہ اس طرح کہ سو پچاس وضاعین و کذابین بیٹھ گئے اور ایک حدیث باہمی مشورے سے وضع کی اور اس کو سو پچاس صحابہ کی طرف منسوب کر کے (خود تابعی اگر تھے تو) پھر مختلف مقامات میں پھیل کر ہر شخص ایک یا دو صحابی سے روایت کرنے لگا۔ وہ اگر یہ لوگ اتباع تابعین تھے تو سو پچاس تابعین کے بھی نام جوڑ دیتے۔ اس میں کیا استحالہ عقلی ہے؟ جہاں ایک بہت بڑی جماعت جس میں ہزار دو ہزار آدمی کام

باپ دادا کی طرح رافضی تھے۔ مگر ان کے دادا کم سے کم اپنی جماعت میں ثقہ تھے۔ ان کے باپ کا حال مطلقاً معلوم نہ ہو سکا۔ مگر ان کا حال اہل سنت کی کتابوں میں تو نہیں ملتا اور ملنے کی کوئی وجہ بھی نہیں۔ مگر اکابر شیعہ نے بھی مختصرات میں ان کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ البتہ مصطفےٰ بن الحسین التفریسی نے اپنی کتاب نقد الرجال کے ورق (۱۰۷) میں ان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کان کذابا یضع الحدیث - لا یحل ان یروی عنہ - یعنی یہ شخص بڑا جھوٹا تھا۔ حدیث گھڑتا تھا۔ اس سے روایت کرنا جائز نہیں ہے۔ اس کا سن ولادت تو نہیں لکھا ہے مگر سال وفات لکھا ہے سنہ۔ عمر کا بھی پتا نہیں معلوم۔

ابوالعباس محمد بن یعقوب الاصم کا ترجمہ بڑی شرح و بسط کے ساتھ عبدالکریم بن سمعانی نے کتاب الانساب ورق ۴۴ میں لکھا ہے۔ ابن السمعانی ابوالعباس الاصم کی ولادت ۲۴۷ھ میں اور وفات ۳۴۶ھ میں بعمر ۹۹ سال لکھتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ابوالعباس الاصم کی وفات کے وقت تک یہ جناب محمد بن موسیٰ ابن فضل بن شاذان صاحب پیدا بھی نہیں ہوئے ہوں گے کیونکہ ابوالعباس الاصم کی وفات اور محمد بن موسےٰ کی وفات دونوں کے درمیان ۹۹ یعنی ایک کم سو برس کا بعد ہے۔ آخر محمد بن موسیٰ صاحب نے کتنی عمر پائی ہوگی؟ اگر سو برس کی بھی عمر پائی ہو تو یہ اس وقت آغوش مادر میں دودھ پیتے ہوئے آغوں آغوں کر رہے ہوں گے۔ حدیث کی روایت کا کمال مرتبہ تھا اس لئے یہ روایت جیسی ہے اپنی زبان حال سے اپنے صدق و کذب کی خود شہادت دے رہی ہے۔

اسی قدر نہیں بلکہ اس سلسلہ اسناد کی ایک کڑی اور ٹوٹی ہوئی ہے یعنی محمد بن اسحٰق الصاغانی کی وفات ۲۷۰ھ میں ہے یعنی ۷۰ سال اور روح بن عبادہ کی وفات ۲۰۵ھ یا ۲۰۷ھ میں ہے۔ دونوں کی وفات کے درمیان ۶۵ یا ۶۰ برس کا فاصلہ ہے۔ ۷۰ سال کی عمر پانے پر بھی صاغانی صاحب کی عمر روح بن عبادہ کی روح نکلنے کے وقت چار یا چھ برس کی ٹھہرتی ہے اس لئے صاغانی صاحب جو خراسانی ہیں درمیان کا ایک واسطہ چھوڑ کر مرسل روایت کرنے کے کیسے خوگر تو نہیں ہیں؟ مگر ایسا نہیں ہے صاغانی کچی گولی کھیلنے والے نہیں ہیں۔ اگرچہ خراسانی ہیں اور ان کے متعلق بھی بعضوں کو کچھ کلام ہے۔ اس لئے یہ حدیث ضرور محمد بن موسیٰ بن الفضل بن شاذان ہی کی شکم زادہ ہے

اس روایت میں ایک تیسری بات اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ حسان بن عطیہ کی وفات ابن حجر تہذیب التہذیب میں ۱۲۰ھ سے ۱۳۰ھ کے درمیان لکھتے ہیں۔ یہ صحابی نہیں ہیں کہ خود رسول اللہ صلعم سے سنتے۔ پھر یہ بھی نہیں کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا۔ کیا حضرت جبرئیل خود آکر حسان بن عطیہ سے ایسا فرما گئے تھے؟

اسی حدیث کی بنیاد پر علامہ خطیب گوجرانوالہ فرماتے ہیں کہ

" ائمہ سنت اور اہل حدیث کے نزدیک حدیث بھی آں حضرت پر بذریعہ وحی نازل فرمائی گئی " (سواد اللہ مؤلفہ)

ثمن اطاعہ و من اذقوی … اللہ کی …

اسی کفایہ میں اور اس کی اسی فصل میں انہیں محمد بن موسیٰ بن الفضل کے چچا سے بھی ایک روایت صفحہ ۱۲ میں اس روایت سے پہلے گذر چکی اور مثلہ معہ والی حدیث ہے اس کو بھی حافظ ابوبکر خطیب بغدادی نے نیشاپور ہی میں سنا تھا۔ یعنی خطیب نے وہ مثلہ معہ والی حدیث نیشاپور میں ابو علی الحسن بن ابی بکر بن شاذان سے سنی فضل بن شاذان کی کنیت ابوبکر تھی۔ اگرچہ وہ شدید بلکہ رافضی تھے۔ پہلے شیعوں کے نام ابوبکر، عمر، عثمان، معاویہ، یزید سب ہوتے تھے۔ اس وقت یہ تعصب نہ تھا کہ ناموں سے بھی نفرت ہو چنانچہ ان کے یہاں حدیثوں کے بڑے بڑے راوی ان ناموں سے ملیں گے۔ مگر ان کے متاخرین علماء نے اس بات کی بہت کوشش کی ہے کہ جہاں جہاں موقع ملے کچھ تغیر و تبدیل کر دیں۔ چنانچہ ان کے بہت ہی بڑے امام الحدیث یزید بن معاویہ تھے۔ ان کے ائمہ رجال جو ان سے بہت متاخر ہیں انہوں نے ان کو برید بن معاویہ بنا دیا۔ اسی طرح آپ شیعوں کی کتاب رجال میں فضل بن شاذان کی کنیت اگر دیکھیں گے تو بجز تفرشی کے علامہ حلی و علامہ مجلسی وغیرہ سب نے ان کی کنیت بدل کر "ابو محمد" لکھدی ہے اگرچہ بیٹے کا نام "محمد" نہ تھا۔ مگر پوتے کا نام ضرور تھا۔ اور یہی پوتے جو ابوبکر خطیب بغدادی کے نیشاپوری شیخ تھے بہر حال چونکہ میرے دوست علامہ خطیب گوجرانوالہ نے اس مثلہ معہ والی روایت کو نہیں چھیڑا ہے اس لئے میں بھی آج اس کے متعلق چپ ہی رہتا ہوں۔ انشاء اللہ المستعان اپنے پورے رسالے (حدیث مثلہ معہ عن ابن الخلف ...) سے جلد ناظرین البیان کو محظوظ ہونے کا موقع دیتا ہوں۔ وما توفیقی الا باللہ۔

خطیب بغدادی نے ایسی حدیث کیوں قبول کی؟ یہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی حدیث جس کو ہم سا جاہل شخص اس چودھویں صدی کے اواخر میں کذب و افتراء اتنی وضاحت کے ساتھ ثابت کر دے خطیب بغدادی جیسا حافظ حدیث اور نقاد جس کو علم حدیث و نقد حدیث کا امام کہنا چاہیئے۔ صحیح سمجھے اور قبول کرے۔ اور اس سے سند پکڑے؟ حقیقتاً یہ سخت تعجب کی بات ہے۔ مگر نہیں اگر آپ محدثین کے قضیات سے باخبر ہیں تو کبھی اس پر تعجب نہ کریں گے۔ اس لئے کہ محدثین کا غالباً بلا استثناء یہ معمول رہا ہے کہ وہ اپنے مسلک یا اپنے کسی مقصد کے موافق ہر ضعیف سے ضعیف بلکہ موضوع سے موضوع حدیث کو بھی قبول کر لیتے۔ اپنی کتابوں میں درج کر لینے میں کوئی تامل نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ ایسے مواقع میں تدلیس تک کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔

تدلیس کہتے ہیں متنِ حدیث یا اسنادِ حدیث میں قصداً کچھ ردّ و بدل کر دینے کو تاکہ اصل حدیث کا مفہوم کچھ بدل جائے۔ اگر متن میں تدلیس کی ہے۔ یا وہ راوی جو اصل راوی ہے وہ پہچانا نہ جائے، اس کے عوض کوئی دوسرا اس سے زیادہ ثقہ و معتبر شخص سمجھا جائے یا کم سے کم کوئی غیر معروف یا مبہم نام کی وجہ سے خواہ مخواہ کسی کو بدگمان کرنے کا موقع نہ رہے یا کم رہے۔ یہ تدلیس محدثین کی وہ عام صفت ہے کہ اکابر و ائمہ فن میں بھی تقریباً نوے فیصدی اس میں مبتلا ہیں۔ عفا اللہ عنا و عنہم اجمعین۔

اس لئے یہ کوئی نہ سمجھے کہ خطیب بغدادی جیسے ماہر فن ان راویوں کے سنین وفات سے بے خبر یا غافل تھے۔ مگر دیکھیے کام کی حدیث، حدیثوں کی زبردست تائید جو اس سے نکل رہی ہے اس لئے لکھ دی۔

یا یہ کہیئے کہ حافظ خطیب بغدادی کی ولادت ۳۹۲ھ میں ہے اور یہ ۴۱۴ھ میں ۲۲ برس کی عمر میں نیشاپور گئے تھے۔ کم سنی کی وجہ سے اور پھر نئی جگہ نووارد ہونے کے باعث وہاں کے ثقہ و غیر ثقہ راویوں کی تمیز نہ کر سکے فضل بن شاذان کے علم و فضل کا وہاں غلغلہ سنا۔ ان کے پوتے سے ملاقات ہوئی۔ سمجھے کہ یہ بھی اتنا نہیں تو کچھ تو ہوں گے۔ اور پھر اسی ۲۲ سال کی عمر میں تو وہ ایسے ماہر و ناقد ہو نہیں گئے تھے۔ جتنے کہ کفایہ کی تصنیف کے وقت تھے اور اب جب کہ لکھی ہوئی حدیثیں تھیں محنت کر کے حاصل کی گئی تھیں تو نقد و نظر کے بعد بھی مطلب کی حدیثوں کو خلاف نفسیات کے ماتحت وہ اپنے ذخیرے سے نکال نہ دے سکے۔ ایسی مثالیں ان سے بھی بڑے بڑے ائمہ حدیث کے یہاں موجود ہیں۔

حدیث کا ایک معجزہ | محترم خطیب گوجرانوالہ لکھتے ہیں (عربی عبارت لکھی ہے میں ترجمہ لکھ دیتا ہوں) کہ "عبداللہ بن المبارک نے فرمایا کہ اگر کسی شخص نے حدیث میں جھوٹ بولنے کی ہمت کی تو جیسے ہی اس نے صبح کی کہ لوگ کہنے لگے کہ فلاں شخص کذاب ہے"

رسول صلعم یا حدیث رسول صلعم کے معجزے سے انکار نہیں۔ مگر نہ رسول اس کے محتاج نہ حدیث رسول کہ ان کے لئے معجزے تصنیف کئے جائیں۔ ہمارے رسول کا زندہ معجزہ قرآن مجید سے بڑھ کر کون سی چیز ہو سکتی ہے۔ میرے زیر تصنیف ایک ضخیم کتاب ہے جس کا نام اعجاز القرآن ہے جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے بدیہی دلائل سے کہ کوئی صاحب عقل و دیانت قرآن مجید کے معجزہ ہونے سے انکار نہیں کر سکتا چاہے وہ ایک حرف بھی عربی نہ جانتا ہو۔

مگر یہ قول جو حضرت عبداللہ بن المبارک کی طرف منسوب ہے۔ اگر واقعی انہوں نے فرمایا ہے تو نہایت

مبالغہ اور نہایت غلو سے کام لیا ہے۔ کتب رجال کے دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ کتنے وضاع اور کذاب ایسے گذرے ہیں جنہوں نے برسوں بڑے بڑے ائمہ حدیث کو دھوکے میں رکھا۔ ایک اہم مثال عثمان بن ابی شیبہ کی ہی لے لیجئے کہ اس شخص پر تصحیف فی القرآن کا الزام ابن حجرؒ تہذیب التہذیب جلد ۷ صفحہ ۱۵۲ میں امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ صفحہ ۲۳ میں اور احمد بن عبداللہ الخزرجی نے خلاصۃ التہذیب صفحہ ۲۶۱ میں اس کے متعلق تصحیف فی القرآن کا اعتراف کیا ہے مگر پھر بھی اس کو کسی نے کذاب نہیں کہا۔ اور نہ کسی نے اس کی حدیثیں لینا ترک کیں۔ بخاری میں اس کی ۳۱ حدیثیں اور مسلم میں ۱۳۵ حدیثیں موجود ہیں۔ تو جو شخص قرآن میں جھوٹ بولے وہ کذاب مشہور نہ ہو تو صرف حدیث میں جھوٹ بولنے سے کیا فوراً کذاب مشہور ہو جائے گا؟ یا شاید حضرت عبداللہ بن المبارک کو یہ مصرعہ یاد ہو کہ

باخدا بازی کن و با مصطفےٰ ہشیار باش۔

اس لئے اللہ نے اس مصرعہ کے مطابق حدیث میں تو یہ معجزہ دیا مگر قرآن جو خود سراپا اعجاز ہے اس میں یہ معجزہ نہ دیا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ شہیر ہونے وہ جھوٹا مشہور ہو جانے کا سے مراد یہ ہے کہ اس کا جھوٹ کبھی نہ کبھی ظاہر ہو کر رہے گا۔ تو میں اس کو مان لیتا ہوں۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ آج میری تنقیدوں سے اتنی مدت کے بعد کتنے راویان حدیث کا کذب و افترا شایع عام ہو رہا ہے اور کتنی ایسی حدیثیں جن پہ مدت سے لوگوں کا ایمان تھا آج بہ ثبوت جھوٹی ثابت ہو رہی ہیں۔ ویحق اللہ الحق (الخ)

چارہ کار و کوشش صلح | میرے دوست خطیب کو نجر نوالہ نے یہ جو فرمایا ہے کہ

"اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ بعض ظنون کو قبول کر لیا جائے۔ اس قبول کے لئے اصول وضع ہوں میں یقین کرتا ہوں کہ اگر عصبیت سے الگ ہو کر کوئی قانون بنایا گیا تو اصول حدیث کا مقام سب سے بلند ہوگا۔"

اس سے قطع نظر کرتے کہ اصول تفسیر کا مقام بلند ہوگا یا اصول حدیث کا یا اصول فقہ کا بھی جو کچھ میرے محترم بھائی نے بیان فرمایا ہے اس کو پڑھ کر بخدا مجھے لایزال بے حد خوشی ہوا۔ باوجود پیرانہ سالی و ضعف بصر و ضعف قوی وغیرہ کے میں اس کے لئے اپنا پورا وقت دینے کے لئے تیار ہوں۔ اگر کوئی صاحب میرا ہاتھ بٹائیں۔ اسی مضمون کے بعض حصوں سے یہ پوری طرح ظاہر ہو گیا ہوگا کہ ایک سچا مسلم کبھی حدیث رسول اور سنت نبوی سے انکار نہیں کر سکتا۔ ایک سچے مسلم کے انکار کے معنی یہی ہیں کہ وہ کسی قول کے حدیث نبوی ہونے سے یا کسی حدیث کے سنت ہونے سے انکار کر رہا ہے۔ اور اس کا انکار قرآن مبین کی روشنی میں ہے نہ کہ ملحدانہ انکار ہے۔ اگر کسی شخص نے

دیانۃً کسی قول کے حدیث رسول یا سنت رسول ہونے سے انکار کیا ہے تو آپ اس کو سمجھا سکتے ہیں ممکن ہے کہ
وہ غلط فہمی میں مبتلا ہو مگر آپ تحت اللفظ [illegible] نہ کیجئے اور اس کے ایمان پر حملہ نہ کیجئے۔ وہ اپنی دیانت سے رسول اللہ
پر سے کذب و افترا و بہتان کو دور کر رہا ہے۔ اس [illegible] کہ تم مسلمان [illegible] جیسے تم ہو جائیں یا جن کے
خلوص میں کوئی [illegible] کے سامنے سنت رسول اللہ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جو نہ حنفی تھے نہ شافعی نہ مالکی نہ
حنبلی نہ شیعہ نہ سنی نہ صوفی نہ اہل حدیث۔ وہ صرف مسلم تھے۔ اور بس۔

اس لئے میں محترم جناب خطیب گوجرانوالہ اور محترم جناب مرتب رسالہ "اسلامی زندگی" دونوں بھائیوں سے میری مخلصانہ درخواست ہے کہ فرقہ بندی و اسلاف پرستی کے جذبات سے بالکل خالی ہو کر اگر اصول تفسیر و اصول حدیث و اصول فقہ تینوں پر یکے بعد دیگرے محض حسبۃً للہ تنقید پوری دیانت داری کے ساتھ غور و خوض فرمایا جائے تو میں ہر ممکن خدمت کے لئے حاضر ہوں۔

اگر احادیث صحیحہ واجب القبول ہیں تو احادیث موضوعہ واجب الرد و الترک بھی ہیں۔ دونوں کے جانچنے کے لئے قطعی معیار قرآن مبین کے سوا اور کچھ نہیں۔ رجال وغیرہ کی دیکھ بھال تو ایک ثانوی چیز ہے۔

آخر میں عرض ہے کہ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے محض دیانۃً عرض کیا ہے اور دینی فریضہ جس کو دیانۃً حق سمجھتا ہوں۔ اس لئے میری تحریر بھی دیانۃً ہی ملاحظہ کی جائے۔ واللہ [illegible]
ان الحق [illegible] (تمنا عمادی)

البیان

"ظن سے بدترین ظن" اگر یہ صحیح ہے کہ افراط و تفریط کی ٹکر سے ایک معتدل مذہب ہو جایا کرتی ہے تو حضرت مولانا تمنا مدظلہ کی ذات گرامی کو بھی ان ہی معتدل زمروں میں سمجھنا چاہیے جو متشدد اہل قرآن اور غالی اہل حدیث کے ٹکراؤ سے پیدا ہوئے ہیں۔ ایک طرف وہ حضرات ہیں جن کے نزدیک نماز میں اللہ اکبر اور السلام علیکم و رحمۃ اللہ کہنا شرک ہے۔ اس لئے کہ یہ الفاظ قرآن میں نہیں آتے ہیں۔ اور دوسری طرف وہ بزرگان کرام ہیں جن کے نزدیک قرآن و حدیث میں کوئی فرق نہیں۔ حدیث "مثل القرآن مع القرآن" ہے۔ اس وقت ہمارے مخاطب اہل قرآن نہیں۔ اس لئے ان کے مسلک کے متعلق صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم

ساری عمر اور ہر آن صرف قرآن ہی نہیں بولا کرتے تھے۔ قرآن کے علاوہ بھی کچھ فرمایا کرتے تھے۔ اسی کا نام حدیث ہے۔ پس حدیث کی حقیقت یا افادیت سے کلیتاً انکار اور مطلقاً ترک حدیث کی تبلیغ کوئی قابل تعریف کام نہیں بڑا ہی ظلم ہوگا اگر نماز کا جتنا بھی طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر اور عملاً ثابت ہو وہ تو تسلیم نہ کیا جائے اور کسی غیر نبی کا تنہا وضع کردہ طریقہ نماز کو اس پر ترجیح دی جائے۔ چونکہ اس وقت منکرین حضرات ہمارے مخاطب نہیں اور نہ حضرت مولانا تمنا عمادی کے مقالے کا روئے سخن ان کی طرف ہے اس لئے ہم بھی اس سے زیادہ کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

اس بلند پایہ مقالے کے اصل مخاطب وہ حضرات ہیں جو حدیث اللہ (قرآن) اور حدیث الرسول (روایات) کو ایک سا درجہ دیتے ہیں۔ اور بے دھڑک حدیث کو مثل القرآن مع القرآن قرار دیتے ہیں۔ اس نظریئے کی بنیاد اس روایت پر ہے جس میں احادیث کو مثلہ معہ کہا گیا ہے۔ ہمارا مسلک جسے ہم صراطِ مستقیم کہتے ہیں یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان فرمان نبوی — اگر وہ فی الواقع فرمان نبوی ہو — کو ماننے سے انکار کرتا ہے یا اس کی تضحیک کرتا ہے تو اسے اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیئے لیکن اس کا حق ہر ذی علم مسلمان کو پہنچتا ہے کہ وہ کسی مضبوط دلیل سے کسی روایت کے متعلق صحیح یا غلط ہونے پر بحث کر سکے خصوصاً اس روایت کے متعلق جو قرآنی احکام سے ٹکراتی ہو یا روایت وعقل کے خلاف ہو۔ حدیث کی اہمیت و ضرورت میں کون کلام کر سکتا ہے لیکن حدیث کی صحت میں کلام کرنے کا حق — بشرطیکہ ہوائے نفس کے تقاضے سے نہ ہو بلکہ مستحکم دلائل کی بنا پر ہو — کیوں سلب کیا جائے؟ صحت حدیث کے لئے یہ کہنا کوئی قوی دلیل نہیں کہ فلاں کتاب میں موجود ہے یا فلاں محدث نے اسے صحیح تسلیم کیا ہے محدثین اپنی محنت، دیانت، اخلاص وغیرہ کے لحاظ سے کتنا بلند درجہ رکھتے ہیں ہم ان کی خاک پا بھی نہیں ہو سکتے لیکن پھر بھی وہ انسان ہی تھے پیغمبر نہیں، معصوم عن الخطا نہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ کسی چیز کے تمام پہلو ہر آن ان کے سامنے موجود ہوں۔ پھر ان کی محنت شاقہ کے مجموعوں کو درجہ قرآن نہیں دیا جا سکتا۔ اور اس لئے ان مجموعوں کو مثلہ معہ بھی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اب ہم ہر انصاف پسند کے سامنے کچھ ایسے حقائق پیش کرتے ہیں جن کے صحیح ہونے سے کسی محدث اور کسی عالم حدیث کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد فیصلہ آپ خود کر سکتے ہیں کہ حدیث کو مثل القرآن مع القرآن کہنا درست ہے یا نہیں۔

ملاحظہ ہو اور بغور ملاحظہ ہو:—

(۱) قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا ہے۔ انا لہ لحافظون لیکن حدیثوں کی حفاظت کے لئے ایسا کوئی ارشاد قرآنی موجود نہیں۔

(۲) قرآن کی طرح دوسری آسمانی کتابوں پر ایمان لانا تو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ یؤمنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک یہ مضمون بیسیوں جگہ قرآن میں ہے لیکن کسی جگہ حدیث کے متعلق اس طرح ایمان لانے کا ذکر نہیں۔ مثل القرآن اذکر تو بما انزل الیک کے بعد بما انزل من قبلک سے پہلے ہی ہونا چاہیئے تھا۔

(۳) آسمانی کتابوں میں سے بعض کا ذکر تو خود قرآن میں ہے اور قرآن ان کا مصدق ہے۔ مصدقاً لما بین یدیہ من التوراۃ والانجیل یہ مضمون قرآن میں بہت جگہ ہے لیکن کہیں قرآن میں مصدقاً لصحیح البخاری وصحیح مسلم نہیں آیا ہے۔ اور آ بھی کیسے یہ چیزیں تو بہر حال بعد کی ہیں۔

(۴) قرآن لفظ سے والناس تک یکساں متواتر ہے کسی آیت یا لفظ یا حرف یا نقطے کو بھی تواتر سے گرا ہوا نہیں کہہ سکتے لیکن حدیث میں صرف چند متواتر ہیں اور وہ بھی تواتر قرآنی کے درجے کی نہیں۔ خود محدثین ہی نے حدیث کی بیسیوں اقسام قرار دی ہیں۔ متواتر، مشہور، آحاد پھر ان کے اندر بیسیوں شاخیں، مرفوع، منقطع، مدلس، مضطرب، معلل، ضعیف، موضوع، منکر وغیرہ۔ کسی آیت قرآنی کو کبھی موضوع، منکر، مردود، ضعیف، مدلس، منقطع، مرفوع، مضطرب وغیرہ نہیں کہہ سکتے۔

(۵) حدیث میں روایت بالمعنی کی بھرمار ہے لیکن قرآن میں نقطے نقطے کی روایت باللفظ کے سوا کچھ نہیں۔

(۶) اس لئے ہر حدیث بیان کرنے کے بعد کہا جاتا ہے کہ او کما قال صلعم لیکن آیت تلاوت کرنے کے بعد یہ کبھی نہیں کہا جاتا کہ او کما قال اللہ تعالےٰ

(۷) قرآن کا دعویٰ ہے کہ ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً۔ اگر یہ قرآن غیر اللہ کی طرف سے ہوتا ہے تو اس میں بڑا اختلاف پاتے گویا قرآن میں قطعاً کوئی تناقض موجود نہیں اس لئے قرآن میں کوئی آیت منسوخ بھی نہیں لیکن احادیث میں اتنے تناقض ہیں کہ ان کو جمع کرتے کرتے خود شارحین حدیث بھی عاجز آ جاتے ہیں۔ بلکہ صرف انہی کے لئے ایک خاص فن "فن تطبیق" نام ایجاد کرنا پڑا۔

(۸) قرآن کا کوئی حکم عارضی نہیں لیکن حدیث کے بہت سے احکام وقتی ہیں۔

(۹) احادیث میں ایک امام فقہ ایک روایت کو لیتا ہے اور دوسری کو کسی وجہ سے ترک کر دیتا ہے لیکن قرآن کی کسی آیت سے استدلال کرنے والا امام یہ کبھی نہیں کہتا کہ فلاں آیت ضعیف یا ناقابل قبول ہے۔

(۱۰) حدیث کی صحت کو پرکھنے کے لئے روایت کے علاوہ کتب رجال، تلفیق و ضعفاء، موضوعات و اقوال محدثین اور بیسیوں باتوں کو دیکھنا پڑتا ہے پھر بھی تحقیق کی صحت بحد یقین نہیں ہوتی لیکن قرآن کی آیت کو

پرکھنے کے لئے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ وہ مابین الدفتین موجود ہے۔

(۱) قرآن کے لئے ۔ پورے قرآن سے لے کر دس سورتوں ، ایک سورۃ بلکہ ایک آیت اور آیت کے ٹکڑے (حدیث) تک کے لئے تحدی موجود ہے ۔ فلیاتوا بحدیث مثلہ ۔ لیکن کسی حدیث کے متعلق ایسی کوئی تحدی موجود نہیں۔

(۲) قرآن کی ۶۶۶۶ آیات کئی لاکھ آیات کے اندر سے چھانٹی نہیں گئی ہیں۔ اور حدیث کی ایک ایک کتاب کئی کئی لاکھ حدیثوں سے چھانٹ کر درج کی گئی ہے۔

(۳) قرآن حضورؐ کے وقت میں حضورؐ ہی کے حکم سے جمع ہو چکا تھا اور اس کو خود اللہ نے اپنے ذمے لیا تھا (ان علینا جمعہ و قرآنہ) لیکن حدیث نہ تو حضورؐ کے وقت میں نہ حضورؐ کے حکم سے جمع ہوئی نہ اس کا ذمہ خدا نے لیا بلکہ رسولؐ نے بھی نہیں لیا۔

(۴) حدیث ہی بتاتی ہے کہ حدیثوں کے بعض مجموعے جو صحابہ نے جمع کئے تھے کسی وجہ سے خود صحابہ نے جلا دیئے لیکن قرآن کہیں نہیں بتاتا کہ اس کے جمع کرنے والوں نے اسے غیر ضروری سمجھ کر جلا ڈالا ہو۔

(۵) حدیث ہی بتاتی ہے کہ حضورؐ نے حدیثیں لکھنے سے منع فرمایا (لا تکتبوا عنی سوی القرآن ...) لیکن خدا یا رسولؐ خدا نے کوئی ایسا حکم نہیں دیا کہ حدیث کے سوا کچھ اور نہ لکھو یا جو قرآن لکھا ہے اسے مٹا دو۔

(۶) سیدنا عمر کثرت روایت کو روکتے تھے لیکن کسی آیت کے پڑھنے والے سے یہ کبھی نہیں کہا۔ دو شاہد لاؤ ورنہ درے لگائے جائیں گے۔

غرض ایسی ایسی اور بھی بہت سی دلیلیں ہیں جن کو سن کر ہر موٹی عقل والا بھی یہ سمجھ سکتا ہے ۔ تصانیف حدیث کبھی مثل القرآن او مع القرآن نہیں ہو سکتیں ۔ لیکن جو بات ایک موٹی عقل والا بھی بآسانی سمجھ سکتا ہے اسے باریک عقل والے بعض اوقات نہیں سمجھنا چاہتے ۔ اگر وہ جرأت کے ساتھ ایک بار یہ اعتراف کر لیں کہ حدیث مثلہ معہ نہیں ہے تو یقیناً ان کے ایمان میں کوئی نقص نہیں آئے گا ۔ اگر وہ مثلہ معہ والی روایت کی صحت سے انکار کرنے کی جرأت نہیں پاتے یا اس روایت کی تغلیط کے لئے کتابیں کھنگالنے کا موقع نہیں پاتے تو کم از کم اس لفظ مثلہ معہ کی کوئی معقول توجیہہ و تاویل ہی پیش کریں تاکہ ہم بھی اس سے ــــ بشرطیکہ تاویل معقول ہو ــــ اختلاف نہ کریں ۔ ہم حضرت مولانا تمنا سے درخواست کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ وہ مثلہ معہ والی روایت کو بھی ذرا کھنگال کر ہم لوگوں کی تشفی فرمائیں۔

ہم نے جو کچھ موٹی موٹی دلیلیں مثلہ معہ نہ ہونے کی نمبروار پیش کی ہیں یقین ہے کہ ہمارے ناظرین کو اس

سے قطعاً اختلاف نہ ہوگا لیکن اگر تسکین کے لئے بڑی بڑی کتابوں کے حوالے اور بڑے بڑے علماء و محدثین کے رعب ڈالنے والے اسمائے گرامی ضروری قرار دیئے جائیں تو ہم اس خدمت سے بھی عاجز نہیں۔ بہر کیف زیر نظر مقالے میں آپ کو جا بجا ان حقائق کے حوالے بھی مل جائیں گے جو ہم نے نمبروار لکھے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ حضرت مولانا کے اس بلند پایہ مقالے سے لوگوں کو حضرت کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ ہم تو سیدھی سادی بات قرآن سے لکھ دیتے ہیں مگر بعض لوگ ایسی بات کو اس وقت تک نہیں مانتے جب تک بڑی بڑی کتابوں اور بڑے بڑے علمائے محدثین کے ناموں سے ڈرا نہ دیا جائے۔ زیر نظر مقالے میں آپ کو یہ نمایاں طور پر محسوس ہوگا کہ حضرت مولانا مدظلہ قرآنی علوم میں ان ہی اصولوں کو سامنے رکھ کر میدان میں اترے ہیں جن کو اب تک قرآن کے خلاف استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ یہ بھی یقیناً قرآن ہی کا زندہ معجزہ ہے کہ اس نے ان حربوں کو اپنا لیا ہے — ہمارے نزدیک صحیح مسلک یہی ہے کہ جو فرق اللہ اور رسول میں ہو وہی فرق قول اللہ اور قول الرسول میں ہو۔

ایک نقطہ اور بھی ہمیشہ یاد رکھنا چاہئیے۔ بعض لوگ ظنی کے معنی سمجھنے میں سوء ظن سے بھی کام لے لیتے ہیں یعنی جب ہم حدیث کو ظنی کہتے ہیں تو وہ اس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ ہم حدیث کو سرے سے کلیۃً واجب الترک، ناقابل اعتنا یا قابل نفرت جانتے ہیں۔ نعوذ باللہ من ذلک۔ ذرا سوچئے کیا فن طب ظنی نہیں ہے؟ فن تاریخ کیا سراسر قطعی ہی ہے؟ فن لغت ظن سے خالی ہے؟ سائنس کے تمام مسلمات قطعیت ہی کے حامل ہیں؟ کون سی شے ہے جو ظنیت سے قطعاً خالی ہے؟ لیکن کیا ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی ہے جسے ہم نے آج کل ترک کر دیا ہے؟ آخر ہر ایک ظنی فن ہماری زندگیوں میں داخل ہے ہی — پھر کیا فن حدیث ہی ایک ایسی چیز رہ گئی ہے جس سے ہم خواہ مخواہ نفرت کریں یا اسے کلیۃً قابل ترک سمجھیں؟ ہمیں خالص دنیوی علوم سے نفرت نہیں تو دینی، اخلاقی، نبوی حکمتوں سے کیوں نفرت کرنے لگے؟ نفرت اسی حصے سے ہوتی ہے جو قول رسول نہیں ہوتا اور قول رسول کہہ کر پیش کیا جاتا ہے۔ جو دین نہیں ہوتا اور دین بتا کر مسلط کیا جاتا ہے، اخلاق کے سراسر منافی ہوتا ہے اور اسے عین اخلاق بتا کر دکھایا جاتا ہے، عقل و حکمت کے بداہۃً منافی ہوتا ہے، قرآن کی تنقیص ہوتا ہے اور اس کے ماننے پر اتنا زور دیا جاتا ہے کہ اس سے انکار کرنے والوں کو بے دین قرار دیا جاتا ہے۔ ہم طب کے ظنی فن کو اپنا جزو زندگی بناتے ہیں لیکن خود روح طب اور سنت کے خلاف عقل اور مشاہدے کے خلاف لقمان کی طرف بھی کوئی قول منسوب ہو تو ہم اسے راوی کی سنا تعصب یا سادہ لوحی یا غلط فہمی پر ہی محمول کر سکتے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ ...... قرآن اخذ کل کی شے ہے۔ باقی تمام چیزیں نہ ترک کل کی شے ہیں نہ اخذ کل کے لئے۔ موافق کتاب اللہ جو کچھ بھی ہے قابل اخذ ہے باقی قابل ترک۔

عربی سے ترجمہ

"دعوۃ الرسل"

(مترجم: پروفیسر مولوی عبدالرحیم صاحب اسلامیہ کالج، پشاور)

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ ۚ وَجَاءَكَ فِي هَٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ (سورہ ہود)

اور ہم پیغمبروں کے حالات میں سے ہر قسم کا حال اور قصہ تمہارے سامنے بیان کرتے ہیں جس سے ہم تمہارے دل کو تقویت بخشتے ہیں اور ان آیات میں تمہیں وہ باتیں پہنچی ہیں جو بالکل سچ اور مومنوں کے لئے نصیحت اور یاد دہانی ہے۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَٰذَا الْقُرْآنَ وَإِن كُنتَ مِن قَبْلِهِ لَمِنَ الْغَافِلِينَ (سورۂ یوسف)

ہم بذریعہ اس قرآن کے جس کو وحی کے طور پر تمہارے پاس بھیجا ہے تمہارے سامنے نہایت ہی اچھے پیرایہ میں بیان کرتے ہیں۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اس سے پہلے تم بے خبروں میں سے تھے۔

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۗ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝

بے شک ان (رسولوں) کا حال بیان کرنے میں عقلمندوں کے لئے عبرت ہے۔ یہ کوئی من گھڑت بات نہیں بلکہ اس (کلام) کی تصدیق ہے۔ جو اس کے سامنے ہے اور ہر ایک بات کی تفصیل ہے اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں ان کے لئے (مجسم) ہدایت اور رحمت ہے۔

اللہ تعالٰے کا تقاضائے حکمت یہ تھا کہ لوگوں میں بشارت دینے والے اور ڈرانے والے رسول بھیجے اور ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے آخری نبی اور رسول ہوں۔ اللہ تعالٰے یہ جانتا تھا کہ کسی اصلاح کی دعوت دینا کس قدر خطرات میں گھر جاتا ہے اور وہ (پھولوں کی سیج نہیں بلکہ) کانٹوں کا تاج ہے۔ یہ مشکلات جو کسی داعی اصلاح کو پیش آتی ہیں اس کی ہمت کو پست کر دینے کا باعث ہو سکتی ہیں۔ (اور ممکن ہے) ان پر نظر کر کے اس پر یاس مسلط ہو جائے۔ اس لئے یہ ضروری تھا کہ رسول کے قلب کو اس سے محفوظ رکھا جائے اور اس پر واضح کر دیا جائے کہ داعی اصلاح کو ان مشکلات کا پیش آنا اور ان تکالیف اور صعوبتوں کا بطیب خاطر برداشت کرنا لازم ہے۔ اور اللہ تعالٰے کے رسولوں کو ہمیشہ یہ مصائب پیش آتے رہے ہیں۔ سنت اللہ یہی ہے (وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا) ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلَىٰ مَا كُذِّبُوا وَأُوذُوا حَتَّىٰ أَتَاهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ۚ وَلَقَدْ جَاءَكَ مِن نَّبَإِ الْمُرْسَلِينَ ﴿ (سورہ انعام)

بے شک تم سے پہلے رسولوں کو جھٹلایا گیا، تو انہوں نے اس تکذیب پر صبر کیا (خوشی سے اس کو برداشت کیا) اور انہیں تکلیف دی گئی (تب بھی انہوں نے رشتۂ صبر کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا) یہاں تک کہ ہماری مدد ان کو آپہنچی اور اللہ کی باتوں کو کوئی بھی نہیں بدل سکتا اور بے شک تم کو رسولوں کا کچھ حال پہنچ چکا ہے۔

کسی مصلح ملت کا ان مشکلات اور ان تکالیف سے محفوظ رہنا کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے جب کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ نفوس کو ان کی خواہشات سے روک دے اور دلوں کو من مانی باتیں عمل میں نہ لانے دے۔ وہ ان کو طریقِ مالوف سے ہٹا کر دوسرے راستے پر چلانا چاہتا ہے اور ان کو شہوات انسانی سے دور رکھنے کا خواہش مند ہے۔ جن خوبیوں اور اوصافِ حمیدہ کو وہ ترک کر چکے ہیں۔ وہ پھر انہیں ان خصائل سے قریب تر لانے پر تُلا ہوا ہے۔ مصلح ایک مربی ہے جو لوگوں کو ایک نئے قالب میں ڈھالنا چاہتا ہے اور ایک اتالیق ہے جو ان کو نئی زندگی بخشنے کا خواہاں ہے۔ ان کی منتشر طبائع کو آپس میں جوڑنا اور متفرق خواہشات میں موافقت پیدا کرنا اس کا کام ہے۔

بسا اوقات خواہشات نفسانی کی جڑیں مستحکم ہو چکی ہوتی ہیں۔ اور قوم میں ایک بڑی حد تک خرابی گھر کر چکی ہوتی ہے۔ جاہلیت کے زمانہ میں عرب قوم کا یہی حال تھا۔ ایسے حالات میں ضرورت ہے کہ داعی حق کے سامنے متعدد مصلحین کی سیرت ایسے پیرایہ میں پیش کی جائے جس سے اس کے مائل بہ یاس دل کو تسلی حاصل ہو۔ اس لئے کچھ تعجب نہیں۔ اگر خاتم الرسل کو گزشتہ رسولوں کی سیرت سے آگاہ کیا گیا اور ان کی دعوتِ حق کو قابلِ اتباع نمونہ کے طور پر اس کے سامنے پیش کیا گیا جس سے اس کے دل کو تقویت اور جی کو اطمینان حاصل ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو گزشتہ رسل کرام کی سیرت سے مطلع فرما کر آپ کو یہ بتایا کہ تقویٰ ہی کا انجام کامیابی ہے (والعاقبۃ للتقویٰ) اور حامیانِ حق ہی کو بالآخر غلبہ حاصل ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ ﴿ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنصُورُونَ ﴿ وَإِنَّ جُندَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ ﴿ (سورہ صافات)

بے شک ہم اپنے بندوں کو جو ہمارے رسول ہیں پہلے سے یہ قول دے چکے ہیں کہ فتح انہی کی ہوگی اور بے شک ہمارا ہی لشکر غلبہ پاتا ہے۔

ساتھ ہی اس کو یہ بھی بتا دیا کہ ہوس پرست جماعت کو کامیابی نہیں ہوتی اور اس کا انجام ہلاکت ہے۔

فَكُلًّا أَخَذْنَا بِذَنبِهِ ۖ فَمِنْهُم مَّنْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا وَمِنْهُم مَّنْ أَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ وَمِنْهُم مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْأَرْضَ وَمِنْهُم مَّنْ أَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِن كَانُوا

ہر ایک کو (ان اقوام میں سے) ہم نے اس کے گناہ کے سبب پکڑا۔ کسی پر پتھر برسائے کسی کو کڑاکے سے ہلاک کیا کسی کو زمین میں دھنسا دیا اور کسی کو غرقاب کر دیا۔ یہ تو ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم کرے

اَنْفُسَہُمْ یَظْلِمُوْنَ ۝ (سورۂ عنکبوت)

لیکن وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے تھے۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰہِ جَہْدَ اَیْمَانِہِمْ لَئِنْ جَآءَہُمْ نَذِیْرٌ لَّیَکُوْنُنَّ اَہْدٰی مِنْ اِحْدَی الْاُمَمِ فَلَمَّا جَآءَہُمْ نَذِیْرٌ مَّا زَادَہُمْ اِلَّا نُفُوْرَا ۝ اسْتِکْبَارًا فِی الْاَرْضِ وَمَکْرَ السَّیِّیِٔ وَلَا یَحِیْقُ الْمَکْرُ السَّیِّیُٔ اِلَّا بِاَہْلِہٖ فَہَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِیْنَ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَحْوِیْلًا ۝

(سورۂ فاطر)

انہوں نے مضبوط قسمیں کھائیں کہ اگر ان کے پاس کوئی ڈرانے والا آیا تو وہ کسی بہتر سے بہتر قوم سے بھی زیادہ ہدایت یافتہ ہوں گے۔ پھر جب ان کے پاس ڈرانے والا پہنچا تو ان کی نفرت ہی کو بڑھایا جس کی وجہ ان کا زمین میں تکبر کرنا اور بری سازشیں کرنا تھا۔ لیکن بری سازش کے ناگوار نتائج انہیں کو پیش آتے ہیں جو اس کے اہل ہوتے ہیں۔ (اب تو کوئی بات باقی نہیں رہی) تو کیا وہ پہلی اقوام ہی کے طریقہ (سزا) کا انتظار کر رہے ہیں۔ یا پس اللہ تعالیٰ کے قانون حکمت میں تم ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے اور خدا برتر کے قانون اور اس کے نوامیس میں ہرگز کوئی انحراف تمہیں نظر نہیں آئے گا۔

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِہِمْ کَانُوْا اَکْثَرَ مِنْہُمْ وَاَشَدَّ قُوَّۃً وَّاٰثَارًا فِی الْاَرْضِ فَمَآ اَغْنٰی عَنْہُمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ ۝ فَلَمَّا جَآءَتْہُمْ رُسُلُہُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَہُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِہِمْ مَّا کَانُوْا بِہٖ یَسْتَہْزِءُوْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَحْدَہٗ وَکَفَرْنَا بِمَا کُنَّا بِہٖ مُشْرِکِیْنَ ۝ فَلَمْ یَکُ یَنْفَعُہُمْ اِیْمَانُہُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا سُنَّتَ اللّٰہِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ فِیْ عِبَادِہٖ وَخَسِرَ ہُنَالِکَ الْکٰفِرُوْنَ ۝ (سورۂ مومن)

کیا انہوں نے زمین میں سفر نہیں کیا کہ وہ یہ دیکھتے کہ پہلے اقوام کا کیا انجام ہوا۔ ان کی تعداد ان سے زیادہ تھی۔ قوت میں ان پر فائق تھے اور زمین میں انہوں نے ان سے بڑھ کر یادگاریں باقی چھوڑی ہیں۔ لیکن ان کی تمام جدوجہد ان کے کسی کام نہ آئی۔ جب ان کے رسول واضح نشان لے کر ان کے پاس پہنچے تو وہ اپنے ہی علوم پر نازاں ہوئے (اور جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ) جس بات کا وہ تمسخر اڑاتے تھے وہی ان پر نازل ہوئی۔ ہمارے عذاب کو دیکھ کر کہنے لگے۔ ہم ایک خدا پر ایمان لائے اور جو کچھ بھی ہم نے شرک کیا۔ اس سے (اب) ہم بیزار ہیں۔ لیکن عذاب کو دیکھ کر ایمان لانا ان کے لئے کچھ بھی مفید ثابت نہ ہوا۔ یہی اللہ تعالیٰ کا قانون ہے جو اس نے اپنے بندوں پر جاری کر رکھا ہے اور اسی مقام پر (اسی قانون کے شکنجے میں پھنس کر) منکروں کو خسارہ اٹھانا پڑا۔

اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین اور نوامیس مصلحین اور مفسدین پر یکساں حاوی ہوتے ہیں۔ اور خدائے پاک اپنے کلام میں جا بجا مختلف پیرایوں میں ہمیں اس پر توجہ دلاتا ہے۔ تاکہ ہمارے دلوں میں اس کے متعلق راسخ عقیدہ پیدا ہو اور اہلِ دانش اس سے عبرت حاصل کریں۔ چنانچہ کبھی تو اس مضمون کے بیان کرنے میں تفصیل سے کام لیا جاتا ہے کبھی اجمال پر کفایت کی جاتی ہے۔ اور کئی موقعوں پر متوسط طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اس تکرار اور تاکید کا

مقصد یہ ہے کہ یہ اصول اچھی طرح ہمارے ذہن نشین ہوجائے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کا نزول ہدایت کے لئے ہوا ہے۔ اس کی تصنیف و تالیف سائنٹفک طور پر نہیں کی گئی[1]۔ وہ ہمارے دلوں میں یہ بٹھانا چاہتا ہے کہ جو سلوک صالحین کے ساتھ کیا گیا۔ وہ بہ لحاظ اپنے اعمال کے اس کے مستحق تھے۔ اور مفسدین کو جو کچھ پیش آیا، وہ ان کی سرکشی اور طغیان کا نتیجہ تھا۔ یہی اللہ تعالیٰ کے قانون حکمت کا تقاضا ہے۔ اور تمام اقوامِ عالم پر وہ یکساں طور سے حاوی ہوتا ہے اگر کوئی قوم اس کی نازل کردہ شرائع اور مقررہ حدود و احکام کی پابند رہے اور ان سے تجاوز نہ کرے تو وہ اس کو اپنی زمین پر تسلط بخشتا ہے۔ اور ہر طرح سے اس قوم پر اپنی نعمتیں بکثرت نازل فرماتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر کوئی قوم جادۂ ہدایت سے انحراف کرے۔ اور قوانینِ فطرت کی مخالفت کرے تو اس پر قسم قسم کے عذاب نازل فرماتا اور اس پر کسی ایسی قوم کو مسلّط کر دیتا ہے، جو اس کی عزت اور اس کے اقتدار کو اس سے چھین لے۔

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝
(سورۂ اعراف)

اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لاتے اور تقویٰ کے لوازم پر عمل پیرا ہوتے۔ تو ہم ان پر زمین و آسمان کی برکات کے دروازے کھول دیتے۔ لیکن انہوں نے (ہماری آیات اور احکام کو) جھٹلایا تو پھر ہم نے بھی ان کے اعمال پر مواخذہ کیا۔

قرآن کریم میں رسولوں کی سیرت ذکر کرنے اور ایک ہی قصہ کو کئی سورتوں میں مختلف طریقہ پر بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین (جن کو قرآنی اصطلاح میں سنّت اللہ کہا جاتا ہے) ہمارے ذہن نشین ہو جائیں اور ہمارے دلوں میں یہ اصول گھر کر لیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جس نے اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اس کے دل میں یاس پیدا نہیں ہونے پائے گی۔ اور اصلاحی کوششوں میں اس کا قدم سست نہیں ہوگا۔ اور یہ مقصود بھی ہے کہ سب لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اگر وہ رسولوں کی مخالفت کریں گے اور ان کی تعلیمات اور بیان کردہ شرائع سے روگرداں ہوں گے تو ان کا انجام وہی ہوگا جو دوسرے ظالموں کا ہوا۔

قرآن مجید متعدد جگہوں پر ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو گزشتہ رسولوں کی سیرت یاد دلا کر ان کے لئے تسلی کا سامان بہم پہنچاتا ہے جس سے ان کو یہ بتانا مقصود ہے کہ انہیں بھی دینِ حق کی تبلیغ اور اشاعت میں وہی کچھ پیش آرہا ہے جو دوسرے رسولوں کو پیش آیا۔

مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِن قَبْلِكَ | تم سے وہی باتیں کہی جاتی ہیں جو تم سے پہلے دوسرے رسولوں سے

---

[1] یہ فقرہ اگر یوں ہو کہ (اس کی تصنیف و تالیف سائنس آموزی کے لئے نہیں کی گئی) تو درست ہے۔ (مدیر)

اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ ٥ (سورہ فصلت) بے شک تمہارا رب بخشنے والا اور دردناک عذاب دینے والا ہے ۔

رسولوں کو تکلیف دینا مفسدوں کا شیوہ ہے اور ان کی تمام نسلوں کا اس پر اتفاق رہا ہے معلوم ہوتا ہے۔ کہ باوجود اختلاف زمان و مکان کے گویا انہوں نے ایک دوسرے کو وصیت کر رکھی ہے (کہ کسی رسول کی بات نہ ماننا اور اس کو تکلیف و اذیت دینے میں کوتاہی نہ کرنا)۔

كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ٥ اَتَوَاصَوْا بِهٖ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ٥ (سورہ ذاریات)

اسی طرح ان سے پہلے لوگوں کے پاس جب کوئی رسول آیا۔ تو انہوں نے یہی کہا کہ جادوگر ہے یا دیوانہ۔ کیا انہوں نے ایک دوسرے کو وصیت کر رکھی ہے (نہیں، بلکہ وہ ایک سرکش قوم ہے ۔

بسا اوقات قرآن حکیم اس کو حکم دیتا ہے کہ وہ صبر کا پابند رہے (تمام تکلیفات کو جو تبلیغ کے راستہ میں پیش آئیں خوشی سے برداشت کرے) اور جو کچھ پیش آئے اسی پر راضی رہے اور پھر واضح طور پر بتاتا ہے کہ مصلحین کو کامیابی عنایت کرنے کا جو وعدہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے وہ ایک سچا وعدہ ہے اور اس میں ذرہ بھی شک نہیں۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ٥

تو پھر صبر کر۔ بے شک اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے اور جو لوگ (اللہ کے کلام اور اس کے احکام پر) یقین نہیں رکھتے۔ وہ تم کو بے وقوف نہ بنالیں۔

یہ بھی اس کو بتایا گیا کہ عالی ہمت اور قوی الارادہ رسول ایسا ہی کرتے ہیں۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ؕ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ؕ بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ٥

(سورہ احقاف)

عالی ہمت اور قوی الارادہ رسولوں کی طرح صبر کرو اور ان (کافروں) کے حق میں تعجیل نہ طلب کرو جس دن وہ اللہ تعالےٰ کے وعدوں کو پورا ہوتا ہوا دیکھیں گے۔ ان کو ایسا معلوم ہوگا گویا (دنیا میں) وہ گھڑی بھر ہی ٹھہرے تھے (یہ کلام، تبلیغ ہے اور وہی قوم ہلاک کی جاتی ہے جو اللہ کی نافرمان ہو۔

تو اب جس طرح اللہ تعالےٰ نے اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسولوں کی سیرت سے آگاہ کرکے اس کی تربیت فرمائی ہے۔ اسی طرح ان آیات سے ان علماء کی تربیت بھی مقصود ہے جو داعی الی اللہ ہیں۔ ان کو یہ جتاتا ہے کہ ان کو دعوت الی اللہ میں اس لئے تکان نہیں محسوس کرنی چاہیئے کہ لوگ ان سے ناگوار سلوک کرتے ہیں۔ اور ان کی خواہش کے مطابق ان سے پیش نہیں آتے خصوصاً ایسے زمانہ میں جب کہ بُرے اعمال کثرت سے پھیل گئے ہوں۔ عقائد میں خرابی آگئی ہو۔ اور بدعات نے سنن شرعیہ کو مغلوب کر لیا ہو۔ اللہ تعالےٰ ان داعیان حق کو یہ دکھاتا ہے

کہ اللہ تعالیٰ کے قوانین اور نوامیس سے آگاہی حاصل کرنا ان کا فرض ہے۔ ان کو جان لینا چاہیئے کہ وہ اس دعوت میں انبیاء کرام کے نائب ہیں۔ انبیاء کرام کو اسی دعوت کے سبب سے ایسے حالات پیش آئے کہ وہ ترکِ وطن پر مجبور ہوئے۔ تاکہ اپنے دین اور اپنے عقائد کو محفوظ رکھ سکیں علماء اُمت کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ بہ حالتِ دعوت رسولوں کے اخلاق اور آداب کو اپنے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیں۔

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ ۝ وَإِمَّا يَنزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۚ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ ۝

عفو کو اپنا شعار بناؤ۔ اچھی باتوں کا حکم دو اور جاہلوں سے روگرداں رہو۔ اگر کبھی شیطان تم کو بہکا بھی دے تو اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگو۔ بے شک وہ سننے والا جاننے والا ہے بے شک جو لوگ پرہیزگار ہیں۔ جب ان کو شیطان (ان کے دل میں) وسوسہ ڈالتا ہے تو وہ چونک پڑتے ہیں اور فوراً ان کی بصیرت کھل جاتی ہے۔

رسولوں اور ان کی اقوام کے حالات بیان کرکے اللہ تعالیٰ ہمیں "اصلاح فی الارض" کی تاریخ سے مطلع فرماتا ہے اور ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اس قسم کی تاریخ پڑھنے سے متعدد نصیحتیں اور عبرتیں حاصل ہو سکتی ہیں اور کوئی مُصلح جس قسم کی بھی اصلاح کرنا چاہے۔ اس کے لئے اس تاریخ کا سمجھنا لازم ہے۔ اس کو واقف ہونا چاہیئے کہ اصلاح کے راستہ میں کون سی مشکلات حائل ہوتی ہیں اور کس قسم کے عوائق اور موانع پیش آتے ہیں؟ اور کیا وجہ ہے کہ لوگ ہمیشہ مصلح کے لئے سنگِ راہ ہوتے ہیں اور اصلاحی دعوت کو قبول کرنے میں طبائع کیوں مختلف ہوتی ہیں۔ جب کوئی مصلح، رسولوں کی دعوت اور ان کی اقوام کے اُس رویّہ کے حالات جو انہوں نے اس دعوت کے مقابلہ میں اختیار کیا اور جو تکلیفیں ان رسولوں کو دعوت الی اللہ کی وجہ سے برداشت کرنی پڑیں، پڑھتا ہے، تو اس کو متمدن اور غیر متمدن بنی نوع انسان کے اخلاق اور ان کی ذہنیت سے کافی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ اور ان کے طبائع اور عادات کا اس کو علم ہو جاتا ہے اور اس واقفیت سے اس کو بے حد فائدہ ہوتا ہے۔ اس کی اصلاحی جدوجہد بصیرت پر مبنی ہوتی ہے۔ اور اصلاح میں کامیابی کے جو وسائل ہیں، ان کو اختیار کرنے میں ان کو مدد ملتی ہے۔

کیوں کہ ہر عہد میں مفسدوں کی ذہنیت تقریباً یکساں ہوتی ہے اور دعوتِ حق کی مخالفت کرنے اور ان کو ناکام بنانے کے ذرائع ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ بطور مثال جو کچھ نوح علیہ السلام کے سرداران قوم نے ان کی دعوت کو سُن کر کہا۔ آج بھی اربابِ استعمار (اہلِ حکومت) سیاسی لیڈروں سے (جو قومی ترقی کے خواہاں ہیں) وہی کچھ کہتے ہیں۔

قوم نوح کے سرداران یہ کہتے تھے: ہماری رائے میں تم ہمارے جیسے آدمی ہو اور سرسری نگاہ سے بھی ہمیں تو یہی معلوم

ہوتا ہے کہ تمہارے اتباع کمینہ لوگ ہیں (سورہ ہود۔ آیت ۲۷) کمینہ لوگوں سے ان کی مراد قوم کا غریب طبقہ اور پیشہ ور لوگ ہیں جن کو ذلیل سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً آج کل مزدور جماعت۔ کیا تمہیں اس قول میں اور اس قول میں کچھ فرق نظر آتا ہے جو قائدینِ ملّت کی قدر کم کرنے اور عوام کی نظروں میں ان کو حقیر ثابت کرنے کے لئے کہا جاتا ہے؟ اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کی جماعت غریب لوگوں اور نیلی وردی پہننے والوں پر مشتمل ہے۔ جو ان کے خیال میں (مستعمرین کی رائے میں) اعلیٰ عقل اور سنہری رائے کے مالک نہیں ہیں۔ اگر لوگ ان اقوال کا غور سے موازنہ کریں، تو انہیں معلوم ہو جائے کہ ہر ایک زمانہ میں مصلحین کے مخالف طبقہ کا ایک ہی اسلوب رہا ہے اور تاریخ ہمیشہ اپنے آپ کو دُہراتی ہے۔

اگر سیاسی مصلح کو یہ معلوم ہو جائے کہ قوم کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر کے ان میں دھڑا بندی کی روح پیدا کر دینا، جس کے باعث وہ اپنے حقیقی بہبود کو بھول جائے۔ دشمنِ خدا فرعون ہی کی سنت ہے (اس کا وضع کردہ اصول ہے) جو استبداد اور ظلم و تشدّد کا مجسمہ تھا۔ اور اگر لوگ اس حقیقت کو واضح طور پر سمجھ لیں۔ تو انہیں صاف طور سے نظر آئے گا۔ کہ غاصبانِ ملک، اپنا قدم جمانے اور اپنی (مستعمرانہ) سیاست کو تقویت پہنچانے کے لئے اسی گر پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ ایک متحد قوم میں مختلف جماعتیں پیدا کر کے اپنی شیطانی چالوں سے ان میں فرقہ آرائی کی روح پھونک دیتے ہیں۔ اور جب پیشوایانِ قوم ان سے ملک و ملّت کی بہبود کا مطالبہ کرتے ہیں تو وہ یہی عذر پیش کرتے ہیں کہ قوم میں اتحاد نہیں۔ بالفاظِ دیگر "تعلیق بالمحال" (کسی چیز کو ناممکن بات پر منحصر کرنا) سے کام لیتے ہیں کیوں کہ جب تک غاصب قوم کا تسلّط باقی ہے۔ اس وقت تک اتحاد ناممکن ہے۔ ان کے نفوذ و اقتدار کا اصلی باعث یہی دھڑے بندی اور فرقہ آرائی ہی تو ہے۔

الغرض اس اصول کی بنیاد فرعون نے رکھی ہے اور وہی ان (اہلِ استبداد) کا مقتدائے اعظم ہے۔ جس کی تقلید کر کے یہ لوگ محکوم قوم پر ظلم و تشدّد کرتے اور ان کو ذلیل رکھتے ہیں۔

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ○

(سورہ قصص)

بے شک فرعون نے زمین (مصر) میں اقتدار حاصل کیا ہے اور وہاں کے باشندوں کو مختلف جماعتوں میں تقسیم کیا۔ وہ ایک فریق کو ان میں سے ذلیل سمجھتا۔ ان کے بیٹوں کو قتل کرتا اور ان کی عورتوں کو زندہ چھوڑ دیتا۔ بے شک وہ فساد پھیلانے والوں میں سے تھا۔

سیاسی مصلح کو ہم ایک اور مشابہت پر توجہ دلاتے ہیں۔ وہ یہ کہ رسولوں کی اُمّت میں جب سردارانِ قوم رسولوں کے دلائل سے لاجواب ہو کر ان کی دعوت کو کامیاب ہوتے ہوئے دیکھتے۔ تو ان کے جلاوطن کرنے پر آمادہ ہو جاتے اور غاصبانِ ملک نے بھی گویا انہی سے یہ سبق سیکھا ہے۔ شعیب علیہ السلام کے متکبر سردارانِ قوم اُس سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:

لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا ۚ قَالَ أَوَلَوْ كُنَّا كَارِهِينَ ۝

(سورہ اعراف)

اے شعیب! یقیناً ہم تم کو اور جو تمہاری بات ماننے والے تمہارے ساتھ ہیں۔ ان کو ملک بد۔ کر دیں گے۔ یا یہ کہ تم ہمارے دین میں واپس آجاؤ۔ اس نے کہا۔ اگرچہ ہم اس کو ناپسند بھی کرتے ہوں (یعنی زبردستی ہمیں جلاوطن کرو گے)۔

لوط علیہ السلام کی قوم نے کہا:

أَخْرِجُوهُمْ مِنْ قَرْيَتِكُمْ ۖ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ ۝ (سورہ اعراف)

ان لوگوں کو اپنی بستی سے نکال دو۔ بے شک یہ لوگ بڑے پرہیزگار بن رہے ہیں۔

(باقی آئندہ)

جن اصحاب کو

رسالہ پہنچ چکا ہے، وہ اپنے چندے اور عطیے "ڈاکٹر غلام حسن صاحب ۴۴ نسبت روڈ۔ لاہور" کے پتہ پر بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں اور پیغامِ توحید کو زیادہ سے زیادہ انسانوں تک پہنچانے کے لئے توسیع اشاعت کی کوشش کریں فرصت کے لمحوں کا بہترین مصرف تبلیغ حق ہے۔

(ادارہ)

اطلاع

خط و کتابت و ترسیلِ زر مندرجہ ذیل پتوں پر کیجیے :-

—— خط و کتابت ——

ادارہ البیان دار القرآن، نسبت روڈ، لاہور

—— ترسیل زر ——

ڈاکٹر غلام حسین صاحب، ۴۴ نسبت روڈ، لاہور

قمرالدین قمر پرنٹر پبلشر نے کپور آرٹ پرنٹنگ پریس لاہور
میں چھپوا کر دارالقرآن (گیتا بھون) نسبت روڈ
لاہور سے شائع کیا۔

الرحمٰن علم القرآن خلق الانسان علمه البيان

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اُمتِ مُسلمہ کا ماہنامہ

مستقل لکھنے والے

...ب ڈاکٹر برق صاحب	۵۔ جناب شبیر احمد موسوی صاحب	۹۔ جناب محمد جان صاحب
...ب مولانا تمنا صاحب	۶۔ جناب یعقوب توفیق صاحب	۱۰۔ جناب مولوی محمد ابراہیم صاحب سیشن جج
...اب سید محمد جعفر صاحب	۷۔ جناب سید نذر نیازی صاحب	۱۱۔ عرشی
...باب محمد اقبال سلمانی صاحب	۸۔ جناب ڈاکٹر سخاء اللہ صاحب	۱۲۔ قمر امرت سری

جلد ۳ | جمادی الثانی ۱۳۷۱ھ مطابق مارچ ۱۹۵۲ء | نمبر ۷

فہرس

عنوان		صفحہ
...عن	مدیر	۳
...ق قصوری	عرشی	۷
...نکرین کے لئے لمحہ فکریہ	مولانا سید محمد جعفر شاہ صاحب	۲۲
...م کا معاشی نظام	جناب محمد جان صاحب	۲۵
...یہ مانے کوئی وہ مانے (نظم)	عرشی	۲۶
...ور پاکستان	جناب احمد مختار صاحب	۲۷
...تجربہ	جناب یعقوب توفیق صاحب بی اے	۳۱
...ں نے ایک انسان دیکھا	عرشی	۳۴
...سبر...	ادارہ	۴۱
...فسارات	مدیر	۴۹
		۴۹
...یار		۵۰
...کے لئے	قمر امرت سری	۵۴
...حباب دوستاں	اسلم صاحب	۵۸

قیمت سالانہ پانچ روپے — فی پرچہ آٹھ آنے

من وعن

سستا بہشت

خدا بہشت نصیب کرے علامہ اقبال مرحوم کو جس نے ہمیں ایک نہایت قابل قدر خوش خبری سنائی۔ ع

"بہشتے فی سبیل اللہ ہم مہرت"

پاکستان بنتے کے ساتھ ہی ہم نے اس خوش خبری سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ اخبارات کا بیان ہے کہ اس ارض پاک میں جو خالص اسلام کے عملی تجربے کے لئے لامثال قربانیوں کے بعد حاصل کی گئی ہے کوئی چیز خالص دستیاب نہیں ہوتی ——— دودھ میں سے FATS ۱۵٪ نکالے جاتے ہیں۔

کھوئے میں پانی کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔

دہی میں پانی MOISTURE زیادہ ہوتا ہے۔ اس میں عام طور پر کریم نکلا ہوا دودھ ملا دیا جاتا ہے۔

گھی میں بنولے کا تیل، بناسپتی گھی، وائٹ آئل، سرسوں کا تیل وغیرہ ملا دیا جاتا ہے۔

چائے میں بیر، بانس وغیرہ کے پتے چورا کر کے ملائے جاتے ہیں۔ رنگ کے لئے کتھا ملایا جاتا ہے عام طور پر مستعمل چائے کی پتی بھی ملائی جاتی ہے۔ تجزیہ میں ان چیزوں کے علاوہ گرد اور مٹی بھی ملتی ہے۔

ہلدی میں دال اور چاولوں کا سفوف، پسا ہوا کھوپرا، کوٹی ہوئی چھال، گرد اور مٹی ملائی جاتی ہے۔

بیسن میں پرانا آٹا ملاتے ہیں جس میں ACIDITY زیادہ ہوتی ہے جو بے حد مضر صحت ہے۔

کھانڈ میں گرد اور آٹا ملاتے ہیں۔

شہد میں گڑ کا پانی شامل کیا جاتا ہے۔

کہاں تک گنے جائیے۔ تجزیئے نے بتایا ہے۔ ۱۲ اسو نمونوں میں پچاس فی صد سے زیادہ نمونے کھوٹے ثابت ہوتے ہیں۔ جو دیہات جو خالص اشیاء کے اعتبار سے معروف تھے اب وہاں بھی ملاوٹ کی بیماری پوری شدت سے پھیل چکی ہے۔ بڑے بیان دیئے دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ آرڈی ننس بنائے جاتے ہیں۔ مجسٹریٹ متعین کئے جاتے ہیں، سزائیں مقرر ہوتی ہیں لیکن ملاوٹ کا شیطان اسی طرح

نہ کوئی اس کا بال بیکا نہیں کر سکا۔

بنیادی ملاوٹ

اس کی وجہ کیا ہے؟ ـــــ وجہ ظاہر ہے۔ لیکن اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں (الا من شاء اللہ) ایک بنیادی ملاوٹ کو زائل بنا دیا جائے تو انشاء اللہ سب ملاوٹوں سے چھٹکارا مل جائے۔ ـــــ آپ پوچھیں گے ـــــ "ذرا جلدی بتاؤ صاحب! وہ بنیادی ملاوٹ کیا ہے؟ تاکہ حکومت کو اس کی طرف جلد متوجہ کریں"۔ ہم عرض کریں گے۔ حکومت متوجہ ہو یا نہ ہو ہم آپ کو بتائے دیتے ہیں۔ اور اگر ہماری بتائی ہوئی ملاوٹ غلط ثابت ہوئی تو جو چاہے سزا ہمیں دلوا دیجئے۔

آیئے سنئے! بنیادی ملاوٹ یہ ہے کہ ہم خود اپنے افکار و عادات اور عقائد و اخلاق کے لحاظ سے بالکل ملاوٹ ہی ملاوٹ بن چکے ہیں ـــــ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ ـــــ یہ بھی سن لیجئے آپ۔ ایسا یوں ہوا کہ ہماری دین میں ملاوٹ ہو گئی یعنی ہماری ولادت سے پہلے جو دین بن چکا تھا اور ہوش سنبھالتے کے ساتھ ہی ہمیں جس دین سے سابقہ پڑا اس میں اتنی زیادہ ملاوٹ ہو چکی تھی کہ اس کے مقابلے میں ہلدی گھی آٹے وغیرہ کی ملاوٹ تو یونہی بدنام ہے۔ ان میں تو پھر بھی نقل کے ساتھ اصل کے اجزا ابھی موجود ہیں مگر دین میں تو بس اصل کو پرے پھینک دیا گیا۔ اتخذوا ھذا القرآن مھجورا

اور نقل کو اس کی کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ اصل کے اتباع کے جو نتائج نکلنے لازم تھے وہ کہیں نہیں نکل رہے اور نقل کی پیروی سے جو ذلتیں اور تباہیاں پیش آنی مقرر کی جا چکی تھیں وہ بار بار آ رہی ہیں۔ اس کے باوجود ہم اس کو اصل دین کہتے جاتے ہیں۔ اس دین نے ہمیں کئی ایسے سہل نسخے بتا دیئے جن کے استعمال سے بیٹھے بٹھائے بہشت مل سکتا ہے۔ ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ کھلے بندوں مرد و زن ایسے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرتے رہو اور زبان سے "لا الہ الا اللہ" کہہ دو۔ بس جنت کے دروازے آپ کے لئے چشم براہ ہیں ـــــ ساری عمر گناہوں میں ڈوبے رہو ۔ ایک حج کر لو۔ بس بیڑا پار ہے۔ یہ بھی نہ کر سکو تو اتنی دفعہ فلاں درود شریف پڑھ لو پھر کوئی فکر نہیں۔ فلاں قبر شریف پر سات جمعرات حاضری دے آؤ وہ پیر صاحب نجات کے ذمہ دار ہو جائیں گے۔ فلاں بہشتی مقبرے میں قبر بنوا لو اور اس کے لئے جائداد کا اتنا حصہ دے دو۔ بہشت کی چابیاں گھر بیٹھے آپ کے پاس پہنچ جائیں گی۔

کیسی لاریب نفع کی تجارت ہے۔ کون ہے جو مرنے کے بعد آ کر بتائے کہ۔ یہ زبانی لا الہ، یہ مزیل گناہ حج، یہ درود شریف اور یہ بہشتی مقبرہ میرے کسی کام نہ آئے اور میں دوزخ میں پڑا جل رہا ہوں۔ لوگو! تم ان کے بھرے میں نہ آنا ـــــ! نہ کوئی واپس آیا نہ کسی نے بتایا قرآن یہاں وہاں کی ساری خبریں سنا رہا ہے۔ لیکن اس کی سنتا کون ہے ـــــ وہ تو ہم نے پہلے ہی کہہ دیا کہ یہاں ایسی ملاوٹ ہے کہ اس کو ملاوٹ کہنا بھی ملاوٹ کی بات ہے۔ کیوں جب اصل کا وجود ہی نہ ہو اور خالص نقل ہی نقل ہو تو ملاوٹ کس سے؟ کہنے والے نے خوب کہا تھا کہ اجمیر شریف میں تو شرک کا نام تک نہیں ایک ہی کی پوجا ہوتی ہے۔ اسی ایک سے دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ سننے والے

نے حیران ہو کر پوچھا

حضرت! یہ کیا کہا آپ نے "یہاں شرک نہیں" یہاں تو شرک کے سوا ہے ہی کچھ نہیں۔

آپ سمجھے نہیں۔ شرک کہتے ہیں ایک سے زیادہ معبود ماننے کو۔ یہاں تو ایک ہی یعنی خواجہ اجمیریؒ کو معبود برحق، مطاع، مستغاث، سمیع، بصیر، علیم، مجیب وغیرہ مانتے ہیں۔ کسی دوسرے کو حتیٰ کہ خدا کو بھی نہیں جانتے۔ پھر شرک کیسے ہوا۔ قدیم مشرک تو کو بھی اور بتوں کی طرح مانتے تھے۔ یہاں یہ صورت نہیں اس لئے شرک بھی نہیں۔

جب تک دین خالص قرآنی شکل میں ہمارے سامنے نہیں آئے گا کوئی قانون ہماری ملاوٹوں کو دور نہیں کر سکتا ہے۔ دین کے غیر خالص ہو جانے کی وجہ سے ہماری حکومت سیاست بقتدائی وغیرہ سب غیر خالص ہو گئیں۔

قرآنی دین کے طرز بیان میں نہ کوئی الجھن تھی (غیر ذی عوج) اور نہ ہی اس کی مقدار اتنی کثیر و عظیم تھی کہ وہ ہر طالب نصیحت کو میسر نہ آسکے (ولقد یسرنا القرآن فھل من مدکر)۔۔۔۔۔ اور مروجہ ملاوٹوں والے دین میں الجھنوں کی کوئی حد و شمار ہی نہیں۔ پہلے یہ الجھنیں پیدا کی گئیں۔ پھر ان کو دور کرنے کے لئے باقاعدہ بڑے بڑے فن ایجاد کئے گئے اور ان فنون میں عمریں صرف کرنے والوں کو ایکسپرٹ مانا گیا۔

اور اس "دین متین" کی مقدار کا تو کچھ پوچھو ہی نہیں: "ہر کہ آمد برو زیاد کرد" والا معاملہ ہے۔ کہیں پہنچ کر بھی اس کے اختتام کی امید نہیں اب یہ دینی مدارس کے جتنے طلبہ ذرا زبان و قلم چلانے کے اہل نکلتے ہیں۔ ماشاء اللہ سب ہی دین سازی کا ڈپلومہ لے کر قوم پر نازل ہو جاتے ہیں۔ ابن مسعودؓ نے چند قصے گرادئے اور جی بھر کر بدنام ہوا۔ لیکن یہ چلتے پھرتے تھے جن کے اندر دین کی لاش کے ٹکڑے دفن ہیں۔ ان کو گرانے کی جرأت کون کر سکتا ہے۔ یہ مسئلہ سازی کی ٹکسالیں ہیں جتنے مسئلے آپ چاہیں اور جس قسم کے چاہیں قیمت خرچ کریں اور ان قلب سازوں سے ڈھلوالیں۔۔۔۔۔ نبوت تک کی ٹکسال تو اس زمانے میں بن گئی اور یہ اسی کثیر المقدار ملاوٹی دین کے ذخیرے کی برکت سے ہوا۔ اب جتنے چاہو نبی بنالو۔ خدا کے فضل سے حدیثیں موجود ہیں اور ان حدیثوں کی برکت سے قوم پہلے سے مسیح و مہدی قسم کے لوگوں کی منتظر ہے ہی۔۔۔۔۔ جتنے چاہے "موعود" آتے جائیں۔ کروڑوں منتظروں میں سے ہر ایک کے حصے چند لاکھ مرید تو آہی جائیں گے۔

واہ رے اسلام تیری سخت جانی! ایسے ایسے بے شمار دشمنوں کے ہوتے ہوئے تو ابھی تک زندہ ہے۔

خواجہ ناظم الدین صاحب وزیر اعظم پاکستان نے ممالک اسلامی کے علماء کی کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا ہے

"علماء جو اس کانفرنس میں شریک ہیں۔ انسانیت اور بالخصوص دنیائے اسلام کی صحیح راہ نمائی کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں"

آگے چل کر علماء اسلام کو خطاب کیا ہے

"آج شمع ہدایت آپ کے پاس ہے اور بلا شک و شبہ ہر انسان اس روشنی کا خیر مقدم کرے گا۔ آج دنیا متصادم

نظریوں ...... کی تاریکی میں گھری ہوئی ہے، اور وہ ایک روشنی کی متلاشی ہے ...... میرا یہ عقیدہ ہے ...... کہ
یہ روشنی اسی مینارہ سے حاصل ہو سکتی ہے جس کی شعاعوں سے آپ کے دل و دماغ کے تمام گوشے جگمگا اٹھتے ہیں۔"
کتنی خوش آیند آرزو ہے جو خواجہ صاحب کی زبان سے نکل رہی ہے۔ لیکن ان کو شاید معلوم نہیں کہ وہ روشنی جس کی تمنا وہ علماء سے
رہے ہیں۔ بہت سی تاریکیوں کے نیچے دب چکی ہے اور بدقسمتی سے وہ تاریکیاں علماء ہی کی پیدا کردہ ہیں ـــــ علماء کو یہ فراموش ہو
یا کہ اللہ تعالیٰ نے روشنی (نور) کا اطلاق صرف اپنی وحی پر کیا ہے۔

۱۔ اتبعوا النور الذی انزل معہ ـــــ اس نور کی پیروی مطلوب ہے جو محمد رسول اللہ صلعم پر نازل ہوا۔

۲۔ وانزلنا الیکم نوراً مبینا ـــــ اور ہم نے تمہاری طرف نور مبین اتارا۔

اب جن مکتبوں سے ہمارے علماء، علماء بن کر نکلتے ہیں وہاں اس نور کے سوا سب کچھ ہے۔ اگر کہیں اس کا کچھ حصہ ہے تو بطور تبرک
اور وہ بھی دوسرے علوم کے ہجوم میں ایسا کہ

"صدا طوطی کی سنتا کون ہے نقار خانے میں"

ہمارے علماء کرام کے دماغوں میں "حضرت فلاں بن فلاں" کی اتنی بھیڑ سما چکی ہے کہ غریب قرآن کو اندر گھسنے کا کہیں راستہ ہی نہیں
ملتا بقول اکبر الہ آبادی

سر رشتۂ اتحاد ہم سے چھوٹا	آپس ہی کی خانہ جنگیوں نے لوٹا
قرآن کے اثر کو چھین لینے کیلئے	ہم لوگوں پہ راویوں کا لشکر ٹوٹا

اور پھر جب یہ بزرگ حکومت کے اشاروں پر ناچنے لگیں تو اسلام کا خدا حافظ۔ اور پاکستان میں اب یہی ہو رہا ہے۔ ہمارے اہل
اقتدار یا تو دہریے ہیں یا پھر قبر پرست۔ البتہ بیانوں میں اسلام اسلام ضرور پکارتے ہیں۔ نہ انہیں خبر ہے کہ اسلام کیا ہے اور نہ ہی وہ اس کی
خبر حاصل کرنے کا شوق رکھتے ہیں ـــ رہے عوام تو وہ کسی بازاری عورت کی زبان سے کسی بازاری شاعر کی نعت سن کر سمجھتے ہیں کہ یہی اسلام
ہے اور اسی پر سر دھنتے ہیں ـــــ یاد رہے کہ علماء کا اسلام قیامت تک کوئی پھل نہیں پائے گا۔ اور قرآنی اسلام میں اس مصنوعی اسلام
کے داعیوں کو اپنی موت نظر آتی ہے، پھر وہ کیوں ادھر آنے لگے۔

(ھلالیہ)

عرشی

مولانا غلام علی قصوریؒ

یادگار زمانہ تھے یہ لوگ

گزرے ہوئے زمانے کی چند باتیں جو یاد رہ گئیں

مغلوں کا چراغ گُل ہو رہا تھا اور پنجاب میں سکھ گردی کا آغاز ہو چکا تھا۔ جس نے بعد میں سکھا شاہی کی شکل اختیار کی۔ اسی زمانے میں پنجاب کے مشہور شہر قصور میں ایک بزرگ حضرت مخدوم مولانا غلام مرتضےٰ کا ظہور ہوتا ہے۔ اس آخری زمانے میں اسلامی علم و عمل کا چرچا انہی کے دم قدم سے اطراف و جوانب میں پھیلا۔ آپ کا حلقہ تعلیم و تربیت کافی وسیع تھا۔ اسی حلقہ سے دو سید زادے مستفیض ہو کر ایسے چمکے کہ پنجاب کے شہروں اور دیہات تک کے ہر ہر گوشے میں ان کی روشنی جا پہنچی۔ ان میں ایک سید بُلّھے شاہ قصوری اور دوسرے سید وارث شاہ جنڈیالوی تھے۔ دونوں سید زادوں نے قبول عام کے دربار سے ولایت کی سند حاصل کی ــــــ قصور جہاں مغل امراء وؤسا کے قصور (محلات) تھے۔ اس کا نقشہ بُلّھے شاہ کی زبان سے سُنئے۔

مُغلاں زہر پیالے پیتے		بھوریاں والے راجے کیتے

کُل اشراف پھرن چُپ کیتے		رہ رہ وے عشقا ماریائی!

کہہ کِس نوں پار اتاریائی

یعنی مغل ختم ہو گئے اور ذلیل قسم کے سکھ جاٹ راجے بن گئے۔ شریف لوگ سر چھپائے زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔ اے عشق تو نے کس سے نباہ کیا ہے جس سے تیرا معاملہ پڑا اس کو ختم ہی کر کے چھوڑا ــــــ جہاں تک راقم کا مطالعہ ہے۔ بُلّھے شاہ نے اپنے پیر طریقت سائیں عنایت شاہ لاہوری کا ذکر تو بار بار اپنی کافیوں میں کیا ہے۔ لیکن حضرت مخدوم کا نام کہیں نہیں لیا۔ اس کے برعکس سید وارث شاہ نے اپنے پیر طریقت کا نام کہیں نہیں بتایا۔ لیکن مخدوم رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر بڑے سوز و عقیدت سے کیا ہے۔ اپنی شہرہ آفاق تصنیف ہیر کے اخیر میں لکھتے ہیں

وارث شاہ وسنیک جنڈیالڑے دا		تے شاگرد مخدوم قصور والے
باشندہ

باراں ماہ میں ہیر کی زبان میں اڑتے ہوئے پرندے کو پیغام دیتے ہیں

آکھیں ادس مخدوم قصوری نوں میرے کم نوں کیوں اٹکایائی

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وارث شاہ حضرت مخدوم سے بہت متاثر تھے اور مُلّہے شاہ سائیں عنایت شاہ سے۔ انہی مخدوم صاحب کے خاندان سے آگے چل کر ایک بزرگ علم وفضل کا پیکر بن کر نکلے جنہوں نے اوّل اوّل امرت سر میں شمع توحید روشن کی۔ ان کا اسم گرامی مولانا غلام علیؒ ہے۔ یہ ان دو تین بزرگوں میں سے ایک تھے جنہوں نے اس زمانے میں توحید کی خاطر مصائب کے پہاڑ اٹھائے۔ مولانا عبداللہ غزنوی (جدّ مولانا سید محمد داؤد صاحب غزنوی) اور مولانا حمایت اللہ۔ آخر الذکر بزرگ کے متعلق راقم کے معلومات اتنے ہی ہیں کہ امرتسر کے شرک پسند مسلمانوں نے ان کو اتنا ستایا کہ آخر انہیں شہر بدر ہونا پڑا۔ کچھ عرصے کے بعد کسی امرت سری باشندے نے ان کو مکّے میں دیکھ کر سلام کیا۔ جب انہوں نے کچھ زیادہ توجہ نہ کی تو اس نے کہا "شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں"۔ آپ نے فرمایا "نہیں"۔ تو اس نے کہا "میں امرت سری باشندہ ہوں"۔ آپ نے کہا "امرت سر ابھی موجود ہے"۔ اس نے کہا "جو لوگ آپ کو ستاتے تھے تباہ و برباد ہو چکے ہیں"۔ ——— مولانا عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلۂ خلافت حضرتِ شہید بریلوی سے جاملتا ہے۔ آپ کے حالات میں نے اپنے شہر کے بڑے بوڑھوں سے سنے ہیں اور سوانح عمری بھی دیکھی ہے۔ علم وفضل اور اخلاق و روحانیت میں اپنے زمانے کے فرد فرید تھے۔

اس موقع پر مجھے مولانا غلام علیؒ کا مختصر ذکر کرنا ہے۔ ان بزرگ سے مجھے خاص دل چسپی ہے۔ مجھے ان کے بعض حالات صرف ایک درمیانی واسطے سے پہنچے ہیں یعنی میں نے ان لوگوں کو دیکھا ہے جنہوں نے براہ راست مولانا کی مجلس علم وارشاد سے استفادہ کیا جس طرح ان کے بزرگ حضرت مخدومؒ کے دامن تربیت میں نشوونما پا کر وارث اور مُلّہا شہرت کے آسمان پر مہر و ماہ بن کر چمکے۔ اسی طرح ان کے فیض تربیت سے بھی کئی مشہور ہستیاں وجود پذیر ہوئیں۔

میرے نانا حکیم محمد بخش امرت سری ان خوش قسمت لوگوں میں سے تھے جنہوں نے آپ کی دعوت توحید قبول کرنے میں سبقت کی۔ میری شیرخوارگی اور بچپن ننھیال ہی میں گزرا۔ اس لئے میری توتلی زبان نے توحید و رسالت کا سبق سب سے پہلے انہیں سے سیکھا۔ یہ مولانا ہی کا فیض تھا جو ایک واسطے سے مجھے پہنچا۔ میں ابھی چند ہی سال کا تھا کہ نانا کا انتقال ہو گیا۔ مجھے ان کی زبان سے مولانا کے حالات سننے کا موقع نہیں ملا۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو اپنے قرب وجوار میں تین فرقوں کا زیادہ چرچا دیکھا حنفی، اہل حدیث اور شیعہ۔ میرے افرادِ خاندان بریلوی قسم کے حنفی اور اہل حدیث سے سخت متنفر تھے۔ لیکن اس کے باوجود میرے والد محترم مولانا غلام علیؒ کا نام ادب سے لیتے تھے۔ اس کی وجہ آگے بیان کروں گا۔

علمی ہستیوں میں جن کو میں نے قریب سے دیکھا اور استفادہ کیا۔ مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرت سری رحمۃ اللہ اور حضرت خواجہ احمد الدین

امرتسری رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا غلام علی رحمۃ اللہ علیہ سے مستفید تھے۔ حکیم سلطان احمد اور میاں مولا بخش سوداگران صابون رحمۃ اللہ علیہما بھی حضرت مولانا کی صحبت کے فیض یافتوں میں سے تھے۔ میں انہی بزرگوں کی زبان سے سنی ہوئی کچھ باتیں عرض کروں گا۔ جو ہمارے لئے سبق آموز ہو سکتی ہیں۔

مزے کی بات بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ جناب مولانا ثناء اللہ اور حضرت خواجہ احمد الدین دونوں بزرگوار ہی اپنے آپ کو مولانا غلام علی سے مستفیض کہتے تھے اور اپنے خیالات و عقائد کو انہی سے ماخوذ بتاتے تھے لیکن آپس میں بتدریج اتنا بُعد ہوتا گیا کہ خواجہ صاحب حضرت ابوالوفا کے عقیدۂ مُطاعین[1] کو شرک سے تعبیر فرماتے تھے ——— جہاں تک میرے معلومات کا تعلق ہے کفایت قرآن کا عقیدہ پنجاب میں سب سے پہلے خواجہ صاحب نے واضح کیا۔ غالباً اسی زمانے میں عظیم آباد پٹنے میں مولانا محب الحق عظیم آبادی نے یہ اعلان کیا۔ لیکن دونوں بزرگوں کو اس وقت آپس میں کوئی تعارف نہیں تھا، بعد میں ہُوا۔ مولوی عبداللہ چکڑالوی مرحوم نے خواجہ صاحب ہی سے بحث مباحثہ کرنے کے بعد حدیث کو ترک کیا لیکن وہ افراط و تفریط میں اُلجھ گئے۔ حدیث کو من حیث الحدیث ترک کرنا کوئی محققانہ وصف نہیں۔ البتہ اس کا صحیح مقام متعین کرنا چاہیئے تھا جو مولانا عبداللہ چکڑالوی سے نہ ہو سکا۔ اس اعتدال پسندی کا سہرا خواجہ صاحب کے سر ہے جنہوں نے حدیث کی حجیت یعنی وحی ہونے سے قطعی انکار کر دیا اور احسن و ابدی ہونے کی صورت میں اس کو دینی چیز تسلیم کیا۔ ("برہان القرآن" پہلا پرچہ دیکھو) قریب قریب یہی مسلک مولوی چراغ علیؒ اور سرسیدؒ کا تھا۔ لیکن تفہیم آیات اور معجزات میں خواجہ صاحب کا مسلک ان بزرگوں سے الگ ہے جس کی تشریح کا یہ موقع نہیں۔

میں نے خواجہ صاحب سے ایک دفعہ پوچھا کہ "آپ نے کفایت قرآن اور حدیث کی عدم حجیت کا سبق کہاں سے سیکھا" تو آپ نے فرمایا کہ "مولانا غلام علی مرحوم سے"۔

میں نے عرض کیا کہ "اہل حدیث اصحاب تو انہیں اپنا امام مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حدیث کی طرف لوگوں کو انہوں نے توجہ دلائی ہے"

---

[1] اس کی مختصر تشریح یہ ہے کہ خواجہؒ اصل، بنیادی اور حقیقی اطاعت کے لحاظ سے صرف اللہ تعالیٰ کو مُطاع مانتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ اصل مُطاع صرف ایک ہی ہے۔ انبیاءؑ اسی کی اطاعت کرانے کے لئے آتے ہیں۔ ان کی اپنی ذاتی اطاعت، اطاعت الٰہی سے الگ کوئی مستقل ابدی حیثیت نہیں رکھتی۔ لیکن مولانا ابوالوفاؒ دو اصل مُطاعوں کے قائل تھے۔ یعنی خدا اور رسولؐ۔ جن میں فرق یہ ہے کہ خدا اصل مطاع بالذات اور رسول اصل مطاع بالغیر ——— خواجہ صاحب اس "اصل اور بالغیر" کو سمجھنے سے قاصر تھے اور شاید کوئی شخص اس "نکتہ غامضہ" کو نہیں سمجھ سکتا۔ تثلیث کی قسم کا راز ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

خواجہ صاحب نے فرمایا: "ان کا رسالہ "قرطاس" منگوا کر دیکھو۔"
یہ رسالہ فارسی زبان میں تھا خوش قسمتی سے مجھے ان کے پوتے مولوی عبدالرحیم صاحب سے مل گیا۔ اس میں حضرت مرحوم نے اس حدیث پر بحث کی ہے جو حضور صلعم نے اپنے مرض الموت میں فرمائی تھی کہ
"ایتونی بقرطاس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" میرے پاس ایک کاغذ لاؤ تاکہ میں تمہیں ایسی بات لکھا دوں کہ تم میرے بعد کبھی گمراہ نہ ہو جاؤ۔
اس پر جناب عمرؓ نے فرمایا: "حسبنا کتاب اللہ" اللہ کی کتاب ہمیں کافی ہے۔
مجھے سرسری سا یاد ہے کہ اس رسالے میں شیعوں کی تردید ہے اور حضرت عمرؓ کی بالخصوص ان کے اس قول کی موافقت کی گئی ہے کہ واقعی اللہ تعالیٰ کی کتاب کافی ہے۔ میں نے ان دنوں "البیان" میں اس رسالے کا خلاصہ بھی شائع کر دیا تھا۔ اگر کسی کے پاس اس زمانے کا البیان ہو تو دیکھ سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ میرے پاس اپنا پرایا علمی سرمایہ کچھ بھی نہیں رہا ــــــ جہاں تک مجھے خیال ہے اہلحدیث کی طرف سے اس کے متعلق کچھ شائع نہیں ہوا تھا یا کوئی کام کی بات شائع نہیں ہوئی تھی۔ اب ٹھیک یاد نہیں ــــــ البتہ ایک بات یاد آگئی۔

مولانا کی تفسیر

میں نے خواجہؒ کی زبان سے سنا کہ ایک دفعہ ان کو مولانا غلام علیؒ نے فرمایا:۔
"احمد! ہم نے ایک تفسیر لکھی ہے جو ہماری زندگی میں شائع نہیں ہوگی۔"
خواجہ صاحب فرماتے تھے کہ اس فقرے نے انہیں اس تفسیر کی طرف سے مایوس کر دیا۔ تاہم انہوں نے اس کے مسودے سرسری طور پر ضرور دیکھے تھے۔ بعض دفعہ وہ اس کا حوالہ بھی دیا کرتے تھے۔ ان حوالوں سے معلوم ہوتا تھا کہ مولانا غلام علی مرحوم قرآن کی اہمیت کے قائل تھے۔ اس کو حدیث کے پیچھے نہیں لگاتے تھے ــــــ چنانچہ حدیث میں مسیحؑ کی ولادت و وفات بالکل رومن کیتھولک عقیدے کے مطابق ہے۔ لیکن مولانا غلام علیؒ اس کے برعکس سنت اللہ الجاریہ کے مطابق مانتے تھے۔ یہ عبارت میں نے ان کے قلمی نسخہ تفسیر میں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ اس وقت وہ سماں میری آنکھوں میں پھر رہا ہے، جب میں ایک شام خلیفہ عبدالرحمان مرحوم ابن مولانا غلام علیؒ کے پاس پہلے سے مقرر کردہ وقت کے مطابق بعد مغرب پہنچا اور وہ اندر سے تفسیر کا مسودہ نکال کر لائے۔ اور مسجد کے چراغ کی روشنی میں مجھے تلاش کر کے وہ جگہ دکھائی جہاں مسیحؑ کے متعلق لکھا تھا۔
"ولادت من غیر اَب قرآن سے ثابت نہیں۔"
یعنی مسیحؑ کا بے باپ ولادت قرآن سے ثابت نہیں ــــــ خلیفہ صاحب مرحوم نے مجھے نقل کرنے کی اجازت دے دی بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ میں روزانہ حاضر ہو کر اس متبرک مسودے سے مستفید ہو سکتا ہوں۔ میں نے مسیحؑ کے متعلق بعض عقلی توجیہات

نقل کرلیں۔ اس کے بعد انہیں ترغیب دیتا رہا کہ اس تفسیر کو چھپوالیں۔ چنانچہ وہ، ان کے صاحب زادے مولوی عبدالرحیم صاحب اور
کے بھتیجے مولوی محمد داؤد صاحب وکیل قصوری اس پر آمادہ بھی ہو گئے ـــــــ مجھ سے یہ غلطی ہو گئی کہ میں نے ان حوالوں کو شائع کر دیا جس
سے اہل حدیث کے کیمپ میں اضطراب پیدا ہو گیا کیوں کہ عوام میں اس وقت یہی مشہور تھا کہ مولانا غلام علی مرحوم اہل حدیث یا وہابی ہیں اور
قرآن کو حدیث کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ اور یہ بالکل اچنبھا بات تھی ـــــــ اس کے متعلق جو بات مجھے پہلے لکھنی چاہیئے تھی اب لکھ رہا
ہوں۔ میں نے خود خواجہ صاحب سے مولانا مرحوم کی اس عجیب شہرت کے متعلق پوچھا تھا تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ مولانا لوگوں کی استعداد
دیکھ کر ان سے گفتگو کرتے تھے۔ یعنی "کلموا الناس علیٰ قدر عقولھم" کے اصول پر

"دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر"

اگر وہ اس زمانے میں ایسی غیر اہم باتوں (ولادت مسیح وغیرہ) میں الجھ جاتے تو جتنی اصلاح انہوں نے عوامی عقائد کے متعلق کی،
ہرگز نہ کر سکتے۔ عوام کو کھلی شرکیہ رسوم اور قبر پرستی وغیرہ سے نکال کر حدیث کے قابل قدر ذخیرے تک لے آنا کوئی معمولی بات نہیں تھی
ـــــــ اس زمانے میں اردو کی ترویج ہو چکی تھی۔ لیکن وہ جب کوئی محققانہ مسئلہ بیان کرنا چاہتے تھے تو فارسی میں لکھتے تھے۔ چنانچہ میں نے
ان کے کئی چھوٹے چھوٹے رسائل فارسی ہی میں دیکھے ہیں۔ حالانکہ وہ اردو میں اظہار مافی الضمیر کر سکتے تھے۔ چنانچہ تفسیر کا مسودہ سارا اردو
ہی میں ہے ـــــــ خواجہ صاحب مرحوم کی ذہانت و ذکا کی آغاز شباب ہی میں اپنے زمانے کے اذہان سے بہت ارفع واقع ہوئی تھی اور
مولانا مرحوم

بالائے سرش ز ہوش مندی		می تافت ستارۂ بلندی

کو دیکھ رہے تھے۔ جس کا اظہار کئی دفعہ ان کی زبان سے بھی ہوا (جیسا کہ آگے بیان کیا جائے گا) اس سبب سے وہ خواجہ صاحب سے ایسے
اسرار و حقائق بیان کر دیا کرتے تھے جن کی تاب اس زمانے کے عوام تو در کنار لکیر کے فقیر علماء تک نہ لا سکتے تھے۔

بات تفسیر کی اشاعت کی ہو رہی تھی ـــــــ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ مولانا احمد اللہ امرت سری مرحوم (استاذ مولانا ثناء اللہ مرحوم)
کے زمانے میں بھی خلیفہ عبدالرحمٰن مرحوم (جو اہل حدیث کے امام عیدین بھی تھے) کو اس کے چھپوانے کا خیال آیا تھا تو مولانا احمد اللہؒ نے یہ کہہ
کر روک دیا تھا کہ اگر یہ تفسیر چھپ گئی تو آپ (خلیفہ عبدالرحمٰنؒ) کی امامت عیدین چھن جائے گی ـــــــ اس دھمکی سے اشاعت
رک گئی۔ اب جو میں نے اشاعت پر زور دیا تو سب تیار بھی ہو گئے اور میں نے اس پر ایک مقدمہ لکھ دینے کا وعدہ کیا۔ جس میں یہ ظاہر کیا جاتا
کہ مندرجہ تفسیر مسائل کے ذمہ دار مولانا غلام علی مرحوم ہیں۔ ان کے جانشینوں پر اس کی ذمہ داری کسی طرح نہیں ڈالی جا سکتی۔

یہاں پہنچ کر ایک متنازع سوال پیدا ہو گیا۔ محترمی مولوی محمد داؤد قصوری نے مسودۂ تفسیر کو بڑی محنت سے ماڈرن اردو
میں منتقل کیا تھا۔ ایک خیال یہ تھا کہ اصل کی بجائے اس کو چھاپا جائے۔ دوسرا خیال تھا کہ اصل ہی کو چھاپ دیں۔ اسی تعین میں

، میری مذکورہ بالا غلطی کہئے یا جسارت الم نشرح ہوگئی ــــ اب لوگ مولانا ثناء اللہ مرحوم کے پاس پہنچتے ہیں اور حیران ہوکر پوچھتے ہیں کہ کیا مولانا غلام علیؒ حدیث کے قائل نہیں تھے جو مسیح کو خلاف حدیث مولود زمین سمجھ رہے ہیں۔ ان بے چاروں کے نزدیک تو اہمیت کا سب سے مضبوط ستون گر گیا۔ مولانا مناظرانہ داؤ پیچ کے تو استاد تھے۔ لیکن یہاں معاملہ ٹیڑھا تھا ــــ در اصل بات یہ تھی کہ مسودۂ تفسیر انہوں نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ چنانچہ انہوں نے وارثان مسودہ سے منگوا کر اپنی آنکھوں سے دیکھا تو حوالہ بلفظہٖ ٹھیک نکلا۔ اب کیا کرتے تحریراً تو انہوں نے کچھ نہیں لکھا۔ تفسیر کی اشاعت رکوادی اور پوچھنے والوں سے صرف اتنا کہا کہ مولوی غلام علیؒ ایک طالب علم تھے، ان کی بات کوئی سند نہیں۔

موجود اولاد | اب لاہور میں اس محترم خاندان کی دو یادگاریں چلتے پھرتے کبھی نظر آجاتی ہیں۔ مولوی خلیفہ عبدالرحیم اور ان کے برادر اصغر۔ دونوں صاحب سرکاری ملازم ہیں۔ آبائی مشاغل اور علمی نوادر غالباً امرتسر ہی میں چھوڑ آئے ہیں۔ مرحوم مولانا کی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ اور ایسی ایسی کتابیں تھیں جو اب کسی قیمت پر نہیں ملیں گی۔ یہ لوگ راقم کے ساتھ مہربانی سے پیش آتے تھے اور مطلوبہ کتاب مستعار دینے سے کبھی انکار نہیں کرتے تھے۔

اب میں مولانا کی سیرت کے متعلق بعض باتیں بیان کروں گا۔ جو مجھے ان بزرگوں کی زبان سے پہنچیں۔ جنہوں نے برسوں مولانا کی صحبت سے فیض اٹھایا تھا۔ اور جن کی طبائع پر حضرت کے علم و تقویٰ کا اثر پڑ چکا تھا۔

اخلاق | میاں مولا بخش مرحوم نے بیان کیا

"ہم مولانا کی مسجد میں روزانہ سبق پڑھنے جاتے تھے۔ مولانا کے اخلاق کا یہ عالم تھا کہ ہم جمعے کی چھٹی بھی انہی کے پاس گزارتے تھے۔ عام طور پر شاگردوں کو استادوں سے وحشت ہوتی ہے مگر یہاں معاملہ اس کے برعکس تھا۔ بقول نظیری

درس کتاب اگر بود زمزمہ محبتے   جمعہ بمکتب آورد طفل گریز پائے را

ایک صحبت میں میاں صاحب نے ذکر کیا کہ ہم چھوٹے چھوٹے بچے کبھی کبھی کھیل کے طور پر آئینہ مولانا مرحوم کے چہرے کے سامنے کر دیا کرتے تھے۔ مولانا اس میں اپنی صورت دیکھ کر فرماتے۔

فتبارک اللہ احسن الخالقین

برکت والا ہے اللہ سب سے اچھا خالق

انکسار | خواجہ احمد الدینؒ نے بیان کیا کہ

"بعض دفعہ مسجد میں آنے والے نمازی مولانا کی تعریف کرتے کہ حضرت آپ بڑے بزرگ ہیں۔ ہم تو سگ دنیا ہیں گنہگار ہیں" ــــ مولانا اس کے جواب میں فرماتے۔

"نہیں بھائی تم لوگ زیادہ بزرگ ہو"

وہ کہتے ۔۔۔۔۔۔ "حضرت ہم تو دن رات دنیا کے دھندوں میں ڈوبے رہتے ہیں اور آپ ہر وقت نماز، تلاوت، اور دینی کاموں میں لگے رہتے ہیں۔ ہم بمشکل ٹیڑھی ترچھی نماز کے لئے وقت نکالتے ہیں"

مولانا فرماتے ۔۔۔۔۔۔ "بھائی تمہاری نماز ہماری سب عبادتوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ تم عیال دار اور کاروباری لوگ ہزاروں کی مصروفیتوں، دلچسپیوں، محبتوں اور لالچوں کے ہجوم سے خدا کے سامنے جھکنے کے لئے وقت نکال لیتے ہو۔ اللہ کے نزدیک تمہارے اس وقت کی بہت قدر ہے ۔۔۔۔۔۔ اور ہم مسجدوں کے باشندے تو اور کوئی شغل ہی نہیں رکھتے، جس کے لئے نفس سے مقابلہ کرنا پڑے"

خدا کا سراغ

اس موقع پر راقم کو ایک مناسب محل بات یاد آگئی۔ سیال کوٹ کا ایک سوداگر بچہ عیاشیوں میں مبتلا ہو کر قلاش ہو گیا۔ جب کوئی آسرا نہ رہا تو فقیری لباس پہن کر ادھر اُدھر درگاہوں پر چکر لگاتا اور اولیاء اللہ کی صحبتوں سے مستفیض ہوتا۔ آدمی تھا چالاک، آخر سوداگری کر چکا تھا اور دیس پردیس کا پانی پی چکا تھا۔ اس کی فقیری میں بھی شان تھی آخری عمر میں اس نے امرتسر کے ایک قبرستان میں ایک رئیس کی قبر کی مجاورت اختیار کر لی۔ انہی دنوں میرے ساتھ تعارف ہوا اور قریباً روزانہ ہی ملاقات ہو جاتی تھی۔ ایک دن میں نے پوچھا۔

"سائیں جی! آپ نے دنیا داری اور درویشی دونوں کا تجربہ کیا ہے۔ یہ تو بتائیے! آپ کو خدا کا کچھ سراغ ملا؟"

سائیں صاحب نے جواباً کہا ۔۔۔۔۔۔ "سچ پوچھتے ہو یا جھوٹ؟"

میں نے عرض کیا ۔۔۔۔۔۔ "حضرت سچ ہی بتا دیجئے!"

"دیکھو میاں! ہم نے درویش بھی دیکھے اور علماء بھی دیکھے۔ لیکن خدا نہ ان میں دیکھا نہ ان میں پایا۔ یہ دونوں گروہ ہمیں تو خدا سے خالی ہی نظر آئے۔ ہاں دنیا داروں میں کچھ کچھ اس کا اثر دیکھا ہے"

میں نے حیرانی سے کہا ۔۔۔۔۔۔ "واہ سائیں جی! یہ تو عجیب بات کہی آپ نے، کہاں دنیا دار اور کہاں خدا"

"سنو بھائی! حیرانی کی کوئی بات نہیں۔ ہم نے اپنے تجربے کی بات بتائی ہے۔ دنیا دار بھولے اور سیدھے ہیں جو فقیروں اور عالموں کے پاس خدا کی تلاش میں خراب ہوتے پھرتے ہیں۔ عالم اور فقیر دونوں ہی دنیا دار کے محتاج ہیں۔ درویشوں کی خانقاہیں اور مولویوں کی مسجدیں دنیا داروں ہی کے دم سے آباد ہیں۔ یہ دونوں مقدس گروہ اپنی ضروریات کا دامن دنیا داروں کے سامنے پھیلاتے ہیں۔ دنیا داروں کے دل میں خدا بس رہا ہوتا ہے وہ ان لوگوں کی حاجت براری کر دیتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ اگر دنیا دار اپنے معاملے کا کھرا ہے، اور حق داروں کے حق ادا کرتا ہے۔ تو اس سے بڑا ولی اللہ کوئی نہیں"

سائیں جی کی یہ تقریر ایسی تھی جس کا انکار مجھ سے ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

نِکھرے مُلّا مولانا حالیؒ نے اس قسم کا ایک مضمون لکھا تھا، کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ ایک شہر ہو جس میں صرف کاروباری لوگ بستے ہوں اور اس میں کوئی مذہبی مُلّا، پنڈت، پادری وغیرہ نہ ہو، وہ ایک دوسرے سے تعاون سے اپنی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ اور ان بزرگوں کے نہ ہونے سے ان کا کوئی کام ادھورا نہیں رہے گا۔ اس کے برعکس ایک ایسا شہر فرض کیجئے جس میں صرف علما کرام، صوفیہ عظام اور پوپ و برہمن قسم کے بزرگ ہی رہتے ہوں اور کوئی دنیادار، موچی، جولاہا، کاشت کار، بڑھئی لوہار، وغیرہ وہاں موجود نہ ہو۔ غور کیجئے۔ وہ شہر کتنے دن آباد رہ سکتا ہے؟ یہ بزرگ جو خدا، رسول، فرشتوں اور دیوی دیوتاؤں کو جیب میں ڈالے پھرتے ہیں کیا کھائیں گے۔ کیا پہنیں گے، کیسے جئیں گے؟

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ لیکن میں مولانا کے اس قول کی تشریح و تائید ہی کر رہا ہوں کہ دنیا دار کی نماز مسجد نشینوں کی عبادت سے زیادہ قیمتی ہے بشرطیکہ وہ صاحب کردار ہو۔

بے نفسی میرے والد صاحب نے ذکر کیا۔ آغا کلب عابد[1] امرت سر میں بہت بڑے شیعہ افسر تھے۔ کسی نے اُن سے افواہاً مولانا مرحوم کی شیعہ دشمنی کا ذکر کیا۔ انہوں نے محرم کے موقع پر مولانا کو وعظ کے لئے بلایا۔ مولانا نے واقعہ شہادت محققانہ انداز اور نہایت مؤثر پیرائے میں بیان کیا۔ آغا صاحب کی بدگمانی دُور ہوگئی۔ اگلے دن گراں بہا خلعت اور چالیس روپے مولانا کی خدمت میں ارسال کئے۔ مولانا نے یہ کہہ کر واپس کردیئے کہ ہم وعظ کی قیمت نہیں لیا کرتے۔

ایثار خواجہ احمدالدین صاحب نے بیان کیا
ایک دفعہ ایک دیہاتی مولانا کی ملاقات کو آیا اور تین روپے نذر کئے (اس زمانے میں تین روپے بڑی چیز تھے خصوصاً دیہاتی کی

---

[1] آغا صاحب کا ذکر آگیا ہے تو ایک شاعرانہ لطیفہ بھی سُنتے چلئے۔ یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب مولانا گرامی امرت سر میں فارسی کے مدرس تھے۔ شعری ذوق کی وجہ سے ان کے اور آغا صاحب کے مراسم تھے، ایک دفعہ آغا صاحب نے فرمائش کی۔ ہماری ہجو لکھئے۔ مولانا نے انکار کیا۔ انہوں نے اصرار کیا۔ مولانا کو ان کے خاندانی نام یاد ہی تھے۔ آغا کلب عابد، آغا کلب علی اور آغا کلب حسین وغیرہ اسی سے ہجو کے لئے مضمون فراہم کرلیا۔ مجھے صرف ایک شعر یاد رہ گیا۔

زآغا کلب عابد می چہ پُرسی
سگ و سگ زادگاں کرسی بکرسی

آغا صاحب نکتہ فہم اور خود بھی صاحب دیوان شاعر تھے۔ گرامی مرحوم کی نکتہ آفرینی سے بہت محظوظ ہوئے۔

طرف سے، مولانا نے پوچھا ـــــ "یہ روپے کیسے ہیں؟"

اس نے عرض کیا ـــــ "حضرت! میں اپنے گاؤں میں بہت تنگ حال تھا۔ میں نے سوچا شہر میں جاکر قسمت آزماؤں۔ اگر اللہ نے کوئی صورت روزی کی پیدا کردی تو واپسی پر تین روپے حضرت کی خدمت میں نذر کروں گا ـــــ سو اللہ نے میری مراد پوری کی۔ میں نے اچھی کمائی کی۔ اب وہ مانی ہوئی منت پوری کر رہا ہوں۔"

مولانا نے روپے قبول کرلئے اور تھوڑی دیر بات چیت کے بعد اس کو وہیں بٹھا کر گھر میں چلے گئے (گھر کا دروازہ مسجد کے اندر ہی سے نکلتا تھا) چند منٹ کے بعد واپس تشریف لائے اور دیہاتی سے مخاطب ہوئے۔

"دیکھو بھائی! ہم نے تمہاری بات مان لی، تمہاری نذر قبول کرلی، اب ایک بات ہماری تم مان لو۔"

"حضرت! میں آپ کے حکم کا انکار کس طرح کرسکتا ہوں؟"

الغرض، اس سے پکا وعدہ لے کر پانچ روپے اس کے سامنے رکھ دئے اور فرمایا

"یہ روپے ہماری طرف سے اپنے بچوں کو دے دینا۔"

اب وہ وعدہ کرہی چکا تھا، مجبور ہوگیا اور روپے لے لئے۔

میرے والد اور مولانا

میں یہ مضمون یہاں تک لکھ چکا تھا کہ والد صاحب سے ملنے کا موقع ملا۔ میں نے ان سے مولانا کے متعلق کچھ اور سوال کئے۔ ان کے جوابات کا خلاصہ یہ ہے۔

مولانا کی رحلت کے وقت والد صاحب جوان تھے انہوں نے مولانا کو بہت اچھی طرح دیکھا اور سنا ہے۔ ان کا استاکارہ کا ندا مولانا کا بہت عقیدت مند تھا۔ اس کی وجہ سے وہ فجر کی نماز اور جمعہ مولانا کے پیچھے پڑھتے اور ان کا خطبہ سنتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ مولانا خطبے میں خالص قرآن بیان فرماتے تھے اور اس کا سختی سے التزام رکھتے تھے ـــــ نماز جمعہ کے بعد محراب سے برآمدے میں آبیٹھتے اور وہیں ممبر رکھ دیا جاتا۔ پھر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک حدیث بیان کرتے ـــــ ان کی آواز کچھ زیادہ بلند نہ تھی۔ لیکن تاثیر غضب کی ہوتی تھی۔ دُور دُور سے لوگ کثیر تعداد میں جمعے میں شریک ہوتے تھے۔ دور و نزدیک کے دیہات سے بھی لوگ آتے تھے، صرف عیدین کے موقع پر مولانا بند گاڑی (بگھی) میں مسجد سے باہر نکلتے اور میدان میں عید پڑھا کر واپس آجاتے۔ اس قسم کی بند گاڑیاں راقم نے دیکھی ہیں لیکن اب وہ غائب ہوچکی ہیں۔ اس زمانے کے ایک اَن پڑھ فقیر جانی شاہ سے والد صاحب کو عقیدت تھی۔ جانی شاہ بہت ذہین اور جید آدمی تھے۔ راقم نے ان کو دیکھا ہے۔ اچھے اچھے لوگ ان کے مرید و معتقد تھے ـــــ والد صاحب نے بتایا کہ وہ کہا کرتے تھے

"یہ مولوی (غلام علیؒ) بہت بزرگ انسان ہے جو لوگ اس کو تکلیفیں پہنچاتے ہیں تباہ ہو جائیں گے۔"

انجام موذی

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ایک شخص نے مولانا پر گیارھویں شریف کی توہین کا جھوٹا مقدمہ بنا دیا۔ جس میں شاید چار سو

روپیہ جرمانہ ہوا جو اُسی وقت عدالت میں مولانا کے ایک عقیدت مند نے ادا کر دیا ـــــ لیکن اس موذی کی عظمت و ریاست خاک میں مل گئی ـــــ اسی طرح ایک شخص جس نے لاہوری دروازے کے اندر اونچی مسجد بنوائی تھی، وہ اور اس کی بیوی مولانا کو گالیاں دیا کرتے تھے ـــــ کچھ عرصے کے بعد دونوں مقتول پائے گئے اور قاتل کا سراغ نہ ملا۔

وضع اور عُمر

والد صاحب نے مزید فرمایا کہ مولانا کی عمر رحلت کے وقت اسّی سال کے قریب تھی۔ ڈاڑھی پر مہندی لگاتے تھے۔ نہایت وجیہہ تھے، قد متوسط تھا۔

روایت کا مرتبہ

اوپر میں نے آغا کلب عابد کا جو واقعہ بیان کیا ہے۔ والد صاحب نے اس کے بعض جزئیات سے اختلاف کیا۔ اس وقت ان کی عمر نوّے سال کے لگ بھگ ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاید ان کو اپنی سابقہ بیان کردہ روایت میں ذہول ہو رہا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرے حافظے نے غلطی کی ہو ـــــ یہی وجہ ہے کہ روایتی باتیں دین بننے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ ان سے معمولی تاریخی اور اخلاقی فائدے اٹھائے جا سکتے ہیں ـــــ یہ حقیقت ہے کہ ایک ہی راوی اپنی بیان کردہ روایت کو کچھ عرصے کے بعد روایت کرے گا تو یقیناً الفاظ میں ردوبدل ہو جائے گا۔ جب الفاظ بدلے تو معنوی تفاوت بھی ممکن الوقوع ہوا ـــــ بعض خوش عقیدہ لوگ کہتے ہیں کہ "یہ ہم لوگوں کی حالت ہے۔ راویانِ حدیث کے حافظے نہایت اعلیٰ تھے۔ اس زمانے کے لوگ انساب و قصائد کے دفتر کے دفتر حفظ کر لیتے تھے۔ وہ ہماری طرح نسیان زدہ نہیں تھے"۔ راقم عرض کرتا ہے کہ کتبِ روایات ہی سے اس حسنِ ظن کی تغلیط کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہاں اس کا موقع نہیں۔ یہاں صرف ایک آیت پیش کر کے سلسلہ مضمون کی طرف رُخ کرنا مناسب ہے۔

ہمہ گیر نسیان

سورہ بقرہ کا آخری رکوع کھول کر دیکھئے۔ رسول (محمدؐ) اور دوسرے مسلمان قرآن پر ایمان لائے یہ سب مل کر اللہ پر اور اس کے فرشتوں اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر بلا تفریق ایمان لائے اور سمع و طاعت کا اقرار کیا اور مغفرت کے طالب ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ مکلّف نہیں کرتے ہر شخص اپنے کئے کا پھل پاتا ہے۔ (پھر یہ لوگ یعنی رسول اور مسلمان دعا مانگتے ہیں) ربنا لا تواخذنا ان نسینا او اخطانا الخ "اے ہمارے پروردگار اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو ہم کو (اس کے وبال میں) نہ پکڑ"۔ (ترجمہ نذیر احمد)

جس کے دل میں کچھ بھی عقل و انصاف ہے وہ اس آیت کے آگے سر جھکا کر تسلیم کر لے گا کہ بشری جامے میں آ کر کوئی بھی بشری صفات (خطا و نسیان وغیرہ) سے مبّرا نہیں ہو سکتا۔

احتمالِ شرک سے اجتناب

میں نے خواجہ صاحب سے سنا کہ مولانا اپنے نام (غلام علی) کے دوسرے جزو کو حضرت علیؓ ابن ابی طالب کی طرف منسوب نہیں فرماتے تھے بلکہ ان کے سامنے قرآن کا علی تھا۔

ان اللہ ھو العلی الکبیر

اللہ ہی علی و کبیر یعنی بلند و بزرگ ہے

خواجہؒ سے محبت

ایک دفعہ خواجہ صاحب نے ذکر کیا کہ ان کے والد میاں محمد صاحب نے مولانا کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت میرے بچے احمد (یعنی خواجہ احمد الدینؒ) کے حق میں دعا فرمایئے،

آپ نے فرمایا ——— "کیا ہم تمہارے کہنے سے دعا کریں؟ ہم تو دعا کرتے ہیں کہ ہمارے بیٹے بھی احمد جیسے ہو جائیں"

خواجہ صاحب جس زمانے میں سکول میں پڑھتے تھے۔ تعلیمی مصروفیات کی وجہ سے چند دن مسلسل مولانا کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکے۔ جب حاضر ہوئے تو مولانا نے غیر حاضری کی وجہ دریافت فرمائی۔ آپ نے سکول کے کاموں کا عذر کیا۔

اس موقع پر مولانا نے عربی کا ایک شعر پڑھا جس کا مفہوم (بروایت خواجہ صاحب) یہ تھا

"ہم دعا مانگتے تھے کہ "وہ ہم سے ملے، وہ ہم سے ملے، لیکن وہ ہم سے نہ ملا ——— اب ہم دعا مانگیں گے کہ "وہ ہم سے نہ ملے، وہ ہم سے نہ ملے" تاکہ وہ ہمیں مل جائے"

وہی مومنؔ دہلوی والی بات

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی　　　　دیکھا کہ دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

کشتہ امرتسری

منشی مولا بخش صاحب کشتہؔ جو اس وقت عمر کے آخری دور میں ہیں۔ انہوں نے ذکر کیا کہ ایک دفعہ وہ بیمار ہوئے تو ان کے والد ان کو مولانا کی خدمت میں لے گئے۔ مولانا نے فرمایا: "معوذتینؔ[1] پڑھ کر دم کر دیا کرو" ——— ایسا ہی کیا گیا، اللہ تعالیٰ نے صحت دے دی۔

علم غیب

معوذتین کے متعلق مجھے خواجہ صاحب کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ انہوں نے فرمایا کہ ایک زمانے میں امرت سر کٹڑہ سفید کے ایک بالاخانے میں ایک غیب دانی کا مدعی آکر ٹھہرا۔ لوگ جاتے اور اس سے دل کی باتیں پوچھتے۔ اس کی بہت شہرت ہوئی۔ خلیفہ امام الدین (خواجہ صاحب کے بہت پرانے دوست، راقم نے انہیں خوب دیکھا اور سنا ہے، نادر روزگار انسان تھے) نے مجھے (خواجہ صاحب کو) وہاں چلنے کو کہا، میں ایسی باتوں کا قائل نہیں تھا، انہوں نے اصرار کیا اور ساتھ ہی دعویٰ بھی کیا کہ تم ضرور قائل ہو جاؤ گے چنانچہ میں گیا، جب مکان کی سیڑھیاں چڑھنے لگا تو "معوذتین" زیر لب پڑھتا گیا۔ خلیفہ صاحب نے غیب دان صاحب سے تعارف کرایا اور دل کی بات پوچھنے کو کہا۔ میں نے دل میں "معوذتین" ہی کا خیال رکھا۔ اس نے اپنے علم کا بہت زور مارا لیکن کچھ نہ بتا سکا۔ آخر اس نے کہا کہ "آج میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں" ——— واپسی پر خلیفہ صاحب نے حیرت کا اظہار

[1] قرآن پاک کی دو آخری صورتیں۔

کرتے ہوئے کہا کہ: میں نے اس کو ایسا درماندہ کبھی نہیں دیکھا معلوم نہیں آج اس کو کیا ہوا۔ یہ تو بتاؤ تم نے اپنے دل میں کیا بات سوچی تھی جس کا علم اسے نہ ہو سکا؟

میں (خواجہ صاحب) نے کہا: معوذتین۔

خلیفہ صاحب نے کہا: پھر تو جو کچھ ہوا ٹھیک ہی ہوا: معوذتین رحمانی چیز ہے اور اس نجومی کا علم شیطانی چیز۔ رحمانی کے آگے شیطانی کیسے ٹھہر سکتا ہے!

موضع جگ دیو کلاں ضلع امرتسر کے ایک سادھو کا واقعہ بھی خواجہ صاحب نے قریب قریب ایسا ہی سنایا تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ شاید میں نے اُس واقعہ کی بعض جزئیات اس واقعہ میں شامل کر دی ہوں۔

ضمنی باتوں کی طوالت کا خوف ہے ورنہ وہ سبق آموز واقعہ بھی لکھتا۔ خیر زندگی ہے تو پھر سہی۔

گشتہ صاحب نے بتایا کہ مولانا غلام علیؒ نوجوانوں کو تقریر کی مشق کراتے تھے۔ چنانچہ خواجہ صاحب بھی تقریریں کیا کرتے تھے۔ سامعین ان کی تقریروں کو پسند نہیں کرتے تھے اور مولانا سے شکایت کرتے تھے۔ مولانا جواب دیتے تھے۔

"یہ لڑکا بہت ہوشیار ہے۔"

چنانچہ خواجہ صاحب کی یہ انفرادیت عمر بھر ان کے ساتھ رہی۔ عوام جو ہمیشہ روایتوں کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ انہوں نے خواجہ صاحب کی باتوں کو کبھی پسند نہ کیا۔ اور یہی ان کی عظمت کی دلیل ہے۔

گشتہ صاحب کا بیان ہے کہ مولانا غلام علی کا حلقہ تلامیذ بہت وسیع تھا۔ مولانا ابوالوفا ثناء اللہ مرحوم امرتسری کے استاذ مولانا میر احمد اللہ امرتسری بھی مولانا غلام علیؒ کے شاگرد تھے۔

اس موقعہ پر مجھے یاد آیا کہ مولانا ابوالوفا اپنی مجلس میں کبھی کبھی خواجہ صاحب کا ذکر کرتے تو شدید اختلاف کے باوجود اتنی بات نہایت فراخ دلی سے کہتے کہ

مولینا ثناء اللہؒ | ہم دونوں ایک ہی (علمی) خاندان کے رکن ہیں۔"

یہ لفظ میں نے ان کے درس نشینوں کی زبان سے کئی مرتبہ سنے ہیں۔ کاش کوئی شخص ان کی سوانح عمری لکھتا اور ان کی قرآنی تصانیف بالخصوص تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن (عربی) کی اشاعت و طباعت کا انتظام ہو سکتا۔۔۔۔ اہل حدیث دوست جلسے کرتے ہیں، اخبار نکالتے ہیں۔ لیکن اپنے اکابر کی قابل قدر عرق ریزیوں کو زندہ رکھنے کے لئے کوئی سعی و ایثار نہیں کرتے۔ کاش میری یہ آواز کسی صاحب دل اہل حدیث تک پہنچ جائے۔ میرے دل میں بنیادی اختلاف کے باوجود مولانا ثناء اللہ رحمۃ اللہ کی بعض باتوں کی بہت قدر ہے۔ مجھے ان کے پوتوں پر بہت زیادہ افسوس ہے جو دنیا تو خوب کما رہے ہیں لیکن محترم دادا کو بہر لحاظ سے

دفن کر چکے ہیں۔ دل میں ایک دُکھ اٹھا، جس کو میں نے ظاہر کر دیا ــــــ یہاں مجھے یہ اعتراف کر لینا چاہیئے کہ جو الزام میں دوسروں پر لگا رہا ہوں۔ ہم خود بھی اس سے بری نہیں۔ ہم خواجہ صاحب کی تصانیف کے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔

یا لیت قومی یعلمون

مولانا تمنا عمادی | ہمارے بزرگ مولانا تمنا عمادی مدظلہ زندہ ہیں۔ ان کی بے گنتی قلمی تصانیف آسمان کی طرف منہ اٹھا اٹھا کر دیکھ رہی ہیں۔ اگر وہ افسانہ یا ناول ہوتیں تو ملک بھر میں پھیل چکی ہوتیں۔

اے دل نادان چھوڑ یہ باتیں! اس حسرت سے کیا حاصل ہے

تلخی مزاج | مولانا غلام علیؒ کو اختلاج کا عارضہ تھا۔ اس کی وجہ سے کبھی کبھی مزاج میں تلخی آجاتی تھی۔ اور وہ اپنی اس مجبوری سے بچنے کی کوشش کرتے رہتے تھے ــــــ ایک واقعہ کا خواجہ صاحب نے ذکر کیا۔

"میں (خواجہ صاحب) نے مولانا سے آدم کو فرشتوں کے سجدہ کرنے کی تشریح پوچھی۔ انہوں نے عام معنی بیان کئے۔ میں نے اس پر اعتراض کیا کہ غیر اللہ کو سجدہ حرام ہے۔ لہذا یہ معنی درست معلوم نہیں ہوتے۔ انہوں نے میری تسلی کی کوشش کی، میں اپنی بات پر اڑا رہا۔ بات میں بحث کی شکل پیدا ہوگئی۔ آخر انہوں نے مجھ سے پوچھا:۔

"پھر اور کیا مطلب ہوسکتا ہے؟"

میں نے عرض کیا ــــــ "اسجدوا لآدم" میں لام کو لام تعلیل کیوں نہ مان لیں۔ یعنی "اسجدوا لاجل آدم" فرشتے آدم کے متعلق اپنے سوء ظن سے واقف ہوکر اللہ کے حضور جھک گئے اور اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔ یعنی وہ سجدہ آدم کی وجہ سے اللہ کو ہوا۔ آدم کو نہ ہوا۔"

میری اس عجیب توجیہہ و تاویل پر مولانا کو تاؤ سا آگیا۔ اسی وقت اٹھ کر اندر زنان خانے میں چلے گئے (گھر کا دروازہ مسجد کے اندر سے نکلتا تھا) تھوڑی دیر کے بعد باہر تشریف لائے تو نہایت سکون سے فرمایا۔

"میاں احمد! تمہارے معنی صحیح ہوں یا غلط۔ لیکن تمہاری نیت بخیر ہے۔ آخر تم توحید ہی کی حمایت کے لئے ایسے معنی بنا رہے ہو۔"

یہ بھی سنا گیا ہے کہ تلخی کے وقت مولانا عموماً جگہ چھوڑ کر اندر چلے جاتے اور جب مزاج اعتدال پر آتا پھر تشریف لے آتے اپنے مزاج کی کسی کمی کو سمجھنا اور مخاطب کو اس کی اذیت سے بچانے کی کوشش کرنا بہت بڑی فضیلت ہے۔ اور مخاطب کی غلطی کی تہ میں اس کے اخلاص کا مطالعہ کر کے اس کے سامنے اعتراف کر لینا اور بھی خوبی کی بات ہے ــــــ بعد میں خواجہ صاحب نے اپنی توجیہہ سے رجوع فرما لیا تھا۔ اور مشہور مفہوم ہی کو مدلل پیرائے میں بیان فرمایا کرتے تھے۔ "کما فسرہ فی تفسیرہ رحمۃ اللہ تعالیٰ

بحث سے اجتناب

یہ بات بھی مجھے خواجہ صاحب نے سنائی جو انہوں نے اپنے والد میاں محمد صاحب سے سُنی تھی کہ مولانا غلام علیؒ اور مولانا عبداللہ غزنوی میں بعض مسائل میں اختلاف تھا۔ (راقم نے مولانا کے بعض ایسے سائل دیکھے ہیں جن کو گزشتہ حوادث نے نایاب کر دیا) مثلاً حضرت غزنوی پیری مریدی کی بیعت کے قائل تھے اور حضرت قصوری اس کے خلاف تھے ۔۔۔۔ ایک شخص نے دونوں بزرگوں کی دعوت کی اور مولانا قصوری کو پہلے سے کہہ دیا کہ آپ فلاں مسئلے کے متعلق تیاری کر رکھیں۔ اور آج اس کے متعلق مولانا غزنوی سے ذرا گفتگو ہو جائے ۔۔۔۔ مجلس منعقد ہوئی کھانا کھایا جا چکا تو صاحب خانہ نے مولانا قصوری کو آغاز کلام کے لئے اشارہ کیا ۔۔۔۔ حضرت غزنوی اردو پنجابی نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے ان کے ساتھ تحریر و تقریر فارسی ہی میں ہوتی تھی۔

مولانا قصوری جو گھر سے بحث پر تیار ہو کر آئے تھے۔ آگے بڑھ کر بولے۔

مولانا! از شما چیزے پرسیدن می خواہم:

مولانا غزنوی نے نہایت ملائمت سے فرمایا۔

بلے! اگر نیت بخیر باشد:

بس اتنی سی بات سے مولانا قصوری خاموش ہو گئے۔ ایک لفظ بھی ان کی زبان سے نہ نکلا۔ کتنا بے پناہ اخلاص تھا دونوں طرف ۔۔۔۔ کہاں ہیں آج کل کے اکثر پیشہ ور مناظر جن کی "نیت بخیر" کبھی ہوتی ہی نہیں (الا ماشاء اللہ) اور جدھر طبع دیا بس ایک دفعہ ان چلے اس پر اڑے ہی چلے جاتے ہیں۔

مولانا عبداللہ

اب اُن حضرت عبداللہ غزنوی کی بھی ایک بات سُن لیجئے۔ راوی یاد نہیں رہا کون تھا۔ روایت یاد رہ گئی۔

مولانا غزنوی امرت سر سے پہلے لاہور چینیاں والی مسجد میں مقیم ہوئے (جہاں آج کل آپ کے وارث پوتے مولانا داؤد غزنوی صاحب ہیں۔) انہیں دنوں مولانا قصوری آپ کے مہمان ہوئے۔ مسجد میں مریدین جمع تھے اور حضرت غزنوی ان کو توجہ دینے کی تیاری کر رہے تھے (نقشبندی درویشوں کی اصطلاح میں "توجہ" مرید کے تزکیہ قلب کے ایک طریقے کو کہتے ہیں جو مرشد کی تاثیر خیال پر منحصر ہے) مولانا قصوری نے اس سے سختی سے اختلاف کیا۔ مولانا غزنوی نے نرمی سے کہا" چند منٹ اس حلقے میں بیٹھ کر ذرا تجربہ کر لیجئے اس کے بعد جو خیال میں آئے فرمائیے:

مولانا بیٹھ گئے۔ توجہ شروع ہوئی۔ آہستہ آہستہ اہل حلقہ کے قلوب پر باطنی کیفیت طاری ہونا شروع ہوئی۔ مولانا قصوری بھی متاثر ہوتے بغیر نہ رہے۔ اسی حال میں اٹھ کھڑے ہوئے اور" لاحول ولا قوۃ الا باللہ" پڑھنے لگے۔

حضرت غزنوی نے لاحول کی وجہ پوچھی تو فرمایا

"رسول اللہ نے ساری عمر میں صحابہ کا کوئی حلقہ توجہ قائم نہیں کیا۔ یہ سراسر بعد کی بدعت ہے"

مولانا غزنوی نے اسی وقت سر اعتراف جھکا دیا اور عہد کر لیا کہ آئندہ اس سے باز رہیں گے۔

راقم نے غالباً ان کی سوانح عمری میں دیکھا ہے کہ مولانا غزنوی نے آخر عمر میں تمام صوفیانہ "ورزشیں" جو رسول اللہ صلعم سے ثابت نہیں، ترک کر دی تھیں اور بالکل سیدھے سادے طریقوں سے ذکر و صلوٰۃ کی پابندی کرتے تھے۔

سبحان اللہ کیسے مخلص اور سلیم القلب تھے یہ لوگ۔ جہاں اپنی غلطی معلوم ہوئی فوراً چھوڑ کر صحیح راستے پر ہوئے ——

یہ بات مجھے امرتسر کے مولوی سلام بابا امام مسجد محمد جان کے متعلق بھی معلوم ہے کہ عمر بھر قبروں اور عرسوں کی تعظیم کرتے رہے۔ آخر عمر میں ایک صحبت کے اثر سے اس گناہ عظیم سے علی الاعلان تائب ہوئے —— وہ جو کسی یورپین دانا کا قول ہے کہ "جو شخص اپنے خیالات کو نہیں بدلتا، دماغ سے محروم ہے" —— اس کا یہی مطلب ہے کہ انسان ترقی پذیر حیوان ہے —— سب سے پہلے آدم نے غلطی کی پھر اس کا اعتراف کیا۔ اس کے ساتھ ہی شیطان نے بھی نافرمانی کی، لیکن اعتراف نہیں کیا اور اڑ گیا —— بس غلطی کو ماننا، غلطی سے نکل کر صحت کی طرف آ جانا آدمیت ہے اور غلطی پر اڑے رہنا شیطان کی سنت ہے۔ جس پر عام مذاہب کے رہنما و عوام چل رہے ہیں —— نعوذ باللہ منہما۔

خواجہ صاحب کی استعداد

خواجہ صاحب مدرسۃ المسلمین امرتسر کے طالب علم تھے۔ وہاں دینیات اور عربی کی بھی کسی قدر تعلیم دی جاتی تھی۔ جس کی طرف عام طلبا کم توجہ کرتے تھے (اور اب بھی یہی حال ہے) لیکن خواجہ صاحب اپنے ہر مضمون میں استادوں کے بتائے ہوئے سے بہت زیادہ ترقی کر لیتے تھے۔ ان کی مکتبی تعلیم کا آخری زینہ انٹرنس تھا۔ لیکن حساب و ریاضی میں ایجاد و اجتہاد کا درجہ رکھتے تھے۔ علم میراث میں ان کی نکالی ہوئی غلطیوں کی ملک بھر میں کوئی تردید نہیں کر سکا۔ فارسی میں حکیم طغرائی مسلم الثبوت استاذ تھے۔ لیکن وہ بھی خواجہ صاحب سے مشکلات میں استفادہ کرتے تھے۔ عروض میں انہوں نے بحور و اوزان و زحافات وغیرہ پر اعتراضات کئے تو حکیم طغرائی مرحوم کو ان کی صحت تسلیم کرنا پڑی۔ اب عربی کی بات سنئے اسی طالب العلمی کے زمانے میں ایک دن حضرت مولانا غلام علیؒ سے تفسیر کبیر مانگی۔ انہوں نے حیران ہو کر کہا

"یہ تو تفسیر، چند سطریں پڑھ کر سناؤ! اگر صحیح پڑھ گئیں تو لے جانا" خواجہ صاحب نے فر فر پڑھ دیں۔

مولانا نے فرمایا —— "احمد الدین کو کھلی اجازت ہے، جو کتاب چاہو مطالعہ کے لئے لے جایا کرو!

آخری گذارش

مضمون ختم کر رہا ہوں۔ آخر میں مجھے یاد آیا کہ امرتسر تباہ ہوا لیکن قصور تو پاکستان میں رہا۔ ممکن ہے مولانا محمد داؤد صاحب وکیل قصوری کے پاس مولانا مرحوم کے مسودات تفسیر یا ان کی صاف کردہ نقل موجود ہو

(باقی صفحہ ۲۲ کے نیچے)

مولانا سید محمد جعفر شاہ صاحب پھلواروی

دینی مفکرین کیلئے لمحۂ فکریہ

ہر مفکر کو شرعی گفتگو کرنے سے پہلے چند ضروری نکتے پیش نظر رکھنے چاہئیں:۔

دین ایک مکمل نظام زندگی کو کہتے ہیں۔ اسی کی تعبیر کیلئے شریعت ہوتی ہے۔ جس کے معنی قانون کے ہیں۔ شریعت کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک عارضی و عبوری۔ دوسرے دائمی و مستقل۔ عارضی قوانین کو عبوری۔ امدادی جس مناسب لفظ سے یاد کیجئے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ سوسائٹی کو ایک خاص منزل تک پہنچنے میں مدد دے اور خود ختم ہو جائے۔ ختم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اصل بنیادی اور مطلوبہ قوانین کی طرح زندگی میں دخیل نہ ہو بلکہ محفوظ شکل میں الگ تھلگ پڑا رہے۔ اس خیال سے کہ اگر سوسائٹی پھر کبھی مائل بہ انحطاط ہو اور اسے قانون کی ضرورت محسوس ہو تو وہی عبوری یا امدادی قوانین پھر اپنا امدادی کام کرکے الگ ہو جائے ——— آپ کو ایک محراب بنانی ہو تو نیچے بہت سی اینٹوں کی ایک عارضی دیوار اٹھاتے ہیں اور اس کے اوپر اپنی مجوزہ شکل کا سانچہ تیار کرکے اس پر محراب کی اینٹیں جماتے ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد نیچے کی تمام دیوار الگ کرلی جاتی ہے اور محراب کی ڈاٹ معلق مضبوطی کے ساتھ کھڑی رہتی ہے۔

مضمون بقیہ صفحہ ۲۱ ﴿ اور مولانا کی کوئی اور چیز بھی رہ گئی ہو ——— مجھے مولوی محمد داؤد صاحب کا بھی مدت سے کچھ علم نہیں کہ کہاں ہیں۔ کس حال میں ہیں۔ کوئی صاحب میری یہ خواہش ان تک پہنچا سکے یا مجھے ان کا پتہ بتا سکے تو شکرگزار ہوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس ذخیرے سے استفادہ کیا جائے۔ اور اہل علم تک حضرت مرحوم کی تحقیق پہنچانے کی کوئی راہ نکالی جائے۔

یہ مضمون محض زبانی روایتوں سے مرتب کیا گیا ہے۔ اگر کوئی صاحب کسی غلط روایت کی تصحیح لکھ بھیجیں گے۔ تو البیان میں شائع کر دی جائے گی ——— میرا مقصد خالص عبرت ہے سو وہ تو اہل دانش حاصل کر ہی لیں گے۔ ان شاء اللہ العزیز

لقد کان فی قصصہم عبرۃ لاولی الالباب (سورہ یوسف)

عقل والوں کے لئے ان لوگوں کے حالات میں بڑی عبرت ہے

(مسافر آخرت عرشی)

گویا مقصود ہوتی ہے محراب، اور اس کو منزل تک لے جانے کے لئے ہوتی ہے وہ دیوار جو اس سے پہلے اٹھائی جاتی ہے۔ دیکھنے میں دونوں ہی اینٹوں کا مجموعہ ہیں۔ لیکن ایک کی مستقل حیثیت ہے دوسری کی عارضی و امدادی ہے۔ یہی شکل شرعی قوانین کی بھی ہے۔ امدادی کو مستقل میں اور مستقل کو امدادی میں گڈ مڈ کر کے ایک کو دوسرے کے ساتھ ابدی نظائر اور سند کے طور پر پیش کرنا کوئی جاندار طریقہ نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض قوانین اپنی امّت کو کچھ اور دیئے اور خود حضورؐ کا عمل کچھ اور رہا ہے۔ ایسے موقعوں پر دو باتیں خود سمجھ لینی چاہئیں کہ:-

(۱) حضورؐ خود اصل منزل مقصود پر کھڑے رہے اور امّت کو اسی مقام تک تدریجی طور پر لانے کے لئے عارضی قوانین دیئے ہیں۔

(۲) جہاں ایسا نظر نہ بھی آتا ہو وہاں اپنی عقل سے عبوری اور مستقل قوانین کا الگ الگ امتیاز کر لینا چاہیئے۔

اس کے لئے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صاحبان نصاب پر ڈھائی فی صد زکوٰۃ واجب کی۔ لیکن خود "انفاق عفو" پر عمل فرمایا۔ انفاق عفو سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ بھی اپنی ضرورت اصلیہ سے زائد ہو وہ حاجت مندوں کو دے دو۔ اصطلاحی زکوٰۃ حضورؐ نے کبھی نہیں نکالی۔ زکوٰۃ تو وہ نکالے جس کے پاس مال جمع ہو۔ جو مال جمع ہی نہ کرے اور صبح کا آیا شام ہونے سے پہلے خرچ کر دے اس کے زکوٰۃ نکالنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ امّت کے لئے یہ ڈھائی فی صد کوئی دوامی قانون نہیں بلکہ ایک ابتدائی قدم ہے اور اس راہ سے اس منزل پر پہنچانا مقصود ہے جہاں پہنچ کر یہ سارے فقہی مسائل زکوٰۃ ختم ہو جاتے ہیں اور وہ منزل ہے۔ انفاق عفو یعنی اپنی ضرورت سے جو فاضل ہو اسے ان لوگوں کے حوالے کر دینا جن کے پاس ضرورت سے کم ہو۔

(۲) اُمّت کے لئے وراثت کے قوانین دئے لیکن خود ؟ یہ فرمایا کہ نحن معاشر الانبیاء لا نرث ولا نورث[1]۔ ہم نہ وراثت لیں نہ دیں۔ اس کا مطلب کیا ہوا ؟ کیا قرآنی قانون صرف ہمارے اوپر فرض ہیں اور حضورؐ اس سے مستثنیٰ ہیں ؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "ان الذی فرض علیک القرآن...الخ جس نے اے رسول قرآن کو تم پر فرض کیا ہے۔

دراصل... وراثت کے قانون تقسیم کا مطلب ہی یہ ہے کہ رفتہ رفتہ نظام زندگی ایسا بن جائے کہ وراثت کا قصہ ہی ختم ہو جائے نہ کوئی وارث ہو نہ مُورث۔ یعنی ہر شے ریاست کی ملک ہو اور ریاست کا نظام ہر ایک فرد کا کفیل ہو جائے ——

ہمارے حضرات اہل تقنین ہر روز نئے سے نئے قوانین بناتے چلے جاتے ہیں اور اسے اپنی انتہائی کامیابی سمجھتے ہیں۔ سوچنا چاہیئے کہ قوانین کا تہ بہ تہ انبار لگے جانا کامیابی ہے یا قوانین کا ختم ہونا ؟ درحقیقت چند اصولی و ابدی قوانین کے سوا باقی تمام امدادی قوانین کی

---

[1] جس طرح اوپر آپنے ڈھائی فی صد کے مقابلے میں انفاق عفو کی قرآنی سند پیش کر دی اسی طرح " لا نورث " کے لئے بھی کوئی سند مل جاتی تو بہتر ہوتا، اس کے برعکس " وورث سلیمان داؤد " سے دونبیوں کا وارث و مورث ہونا قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے۔ (مدیر)

کامیابی ان کے اضافہ تعداد میں نہیں بلکہ ان کے ختم ہونے اور مٹ جانے میں ہے۔ چور کی سزا قطع ید ہے اور یہ ایک قانون ہے لیکن اس کی کامیابی یہ نہیں کہ اس کا خوب ڈھنڈورا اور چرچا ہوتا رہے اور ہر روز صبح شام سو پچاس آدمیوں کے ہاتھ کٹتے رہیں۔ بلکہ یہ ایک امدادی قانون ہے اور اس کی کامیابی یہ ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو یہ قانون ختم ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں معاشرہ ایسا صالح اور نظام زندگی ایسا بہتر ہو جائے کہ "چوری اور اس کے بعد قطع ید" کی نوبت ہی نہ آئے۔

اس سلسلے میں ایک بات اور بھی پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ قوانین امدادی بالکل بے معنی ہیں اگر ان کی پشت پر کوئی قوت منفذہ نہ ہو۔ اسی قوت منفذہ کا دوسرا نام حکومت ہے۔ پس قوانین امدادی کے ختم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ رفتہ رفتہ قوت منفذہ بھی کم سے کم تر ہوتی چلی جائے۔ یہاں تک کہ معاشرے کے صالح ربط کو باقی رکھنے والی قوت خود اس کے اندر سے رضاکارانہ طور پر پیدا ہو نہ کہ بیرونی ہیأت حاکمہ کے بل بوتے پر اکراہاً قائم رہے۔ گویا آخری کامیاب نتیجہ یہ ہو کہ قانون سمٹتے سمٹتے صرف اصولی رہ جائے اور قوت منفذہ گھٹتے گھٹتے عام رضاکارانہ خوش دلی میں تبدیل ہو جائے۔ اور قانون اور پبلک کے درمیان کوئی مجبیرہ قوت حائل نہ رہے۔ اسی کا نام ہے حکومت الٰہیہ۔ اگر خدا اور بندوں کے درمیان قوت جابرہ حائل ہو تو وہ حکومت الٰہیہ نہیں۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ صالح حکومت بھی دراصل ایک امدادی و عبوری حیثیت رکھنے والی چیز ہے۔ مقصود نہیں۔ مقصود صالح معاشرہ ہے۔ جہاں تک پہنچ کر یہ حکومت خود ختم ہو جاتی ہے۔ لفظ حکومت سے جبر کا مفہوم الگ کرنا مشکل ہے۔ اس کے لئے صحیح لفظ 'عبادت الٰہیہ' ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت الٰہیہ قائم کرنے کا کہیں حکم نہیں دیا گیا ہے۔ جہاں بھی حکم دیا گیا ہے عبادت کا دیا گیا ہے

اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ

عبادت سے مراد صرف نماز روزہ نہیں بلکہ پوری زندگی کو خوش دلی کے ساتھ خدا کی غلامی دے دینا ہے۔

اگر ہم ٹھنڈے دل سے ان اہم نکات پر غور کریں تو امید ہے کہ فکر کا سانچہ بدل کر بڑے اہم نتائج پیدا ہو سکیں گے۔

محمد جان صاحب

اسلام کا معاشی نظام

اللہ رب العالمین نے اہل ایمان کے لئے دین اسلام کو پسند فرمایا۔ اسلام کے معنی ہیں قانون قدرت کا کامل احترام۔ اب قانون قدرت جو ہمہ وجوہ مکمل ہے کائنات بھر میں کارفرما ہے تو ہماری دنیا پر جو کائنات کا ایک جزو ہے وہی قانون حاوی ہوا۔ ہماری زندگی کا کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں ہو سکتا جس پر اسلام میں مکمل ہدایت نہ ہو اور اس پر دھیان دینا ہمارا کام ہے۔ آج سے کوئی پونے چودہ سو برس پہلے پیغمبر اسلام جناب رسول اللہ ؐ نے اسلام کا عطا کردہ معاشی نظام اپنا دستور العمل بنایا جسے صحابہ کرامؓ نے بھی اپنا لیا اور اس متبرک نظام کے فیوض و برکات پر تاریخ شاہد ہے پھر بعدہٗ جب جاہ پسند لوگوں نے اس سے اعراض کیا وہ سب برکات رفتہ رفتہ ہم سے چھن گئیں۔ داعیان قرآن کی پکار اسی نظام کی طرف عملی دعوت دینا ہے۔ اور وہ نظام کیا ہے؟

صرف یہ کہ خزائن الارض پر ملت کا اجتماعی قبضہ ہو اور ملت کے ہاتھوں ہر فرد ملت کو اس کا حصہ برابر ملتا رہے اور ہر فرد ملت حسب استعداد و استطاعت اپنا فرض ادا کرتا چلا جائے۔ کوئی شخص ماسوا اللہ کسی دوسرے کا بندہ یا محتاج نہ کہلائے اور یوں تمام ملت میں خوشگوار ہمواری قائم رہے۔ اپنے فرائض کے حدود سے باہر کسے را با کسے کارے نہ باشد کا منظر ملت بھر میں نظر آئے۔ نیز اللہ کی دنیا میں کسی قسم کا فتنہ و فساد نہ ہونے پائے پھر اگر کوئی فرد یا جماعت فتنہ برپا کرے تو اس کی گوشمالی اور تنبیہ و تادیب ملت کے ذمے ہو۔ جس سے نپٹ لینے کو مطلوبہ قوت پر ملت کا تصرف ہو۔

مزید براں اگر بشریت کے باعث ہم میں کوئی تنازعہ ہو تو اس کا فیصلہ دین اللہ کے مطابق کیا جایا کرے۔ دین اللہ میں یہ حکم بھی ہے کہ کبھی کسی صورت میں عدل و انصاف سے انحراف نہ کرو۔ حتیٰ کہ کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں عدل سے بے نیاز نہ کر پائے۔ اور اس کی دلیل یا شہادت بھی پیش کر دی کہ کائنات بھر میں چاند سورج اور دیگر ستارے، سیارے وغیرہ جتنے بھی اجسام ہیں وہ سب صرف میزان و عدل (حق) ہی کی بدولت ہی باقاعدگی سے چل رہے ہیں ان کو تھامے رکھنے کو کوئی ستون وغیرہ نہیں ہیں۔ اب غور فرمائیے اس سے بڑھ کر معاشی نظام اور کیا ہو سکتا ہے؟

کوئی یہ مانے، کوئی وہ مانے

تورات میں جلوہ ہے تیرا ۔ قرآن سراپا ہے تیرا

لڑتے ہیں ناداں دیوانے
کوئی یہ مانے کوئی وہ مانے

گاتا ہے ترانہ وید تیرا انجیل کے دل میں بھید تیرا

دونوں ہیں تیرے افسانے
کوئی یہ مانے کوئی وہ مانے

سب تجھ میں ہیں تو سب میں ہے یا تجھ سے جدا ہے ہر اک شے

دراصل اس راز کو تو جانے
کوئی یہ مانے کوئی وہ مانے

ہے شمع حرم کے نور میں تو تنویر چراغِ طور میں تو

ہر سمت ہیں تیرے پروانے
کوئی یہ مانے کوئی وہ مانے

یہ حادث دنیا پر مائل، اور وہ ہے قدامت کا قائل

یاں دیوانے ہیں فرزانے
کوئی یہ مانے کوئی وہ مانے

میں نے اک عارف سے پوچھا شیعی ہے یا سنی سچا

ہنس کر وہ لگے یوں فرمانے
کوئی یہ مانے کوئی وہ مانے

عیسٰی کے لب پر نام تیرا احمد کے ہاتھ میں جام تیرا
اِک صہبا ہے دو پیمانے کوئی یہ مانے کوئی وہ مانے

(علوشی)

(۱) پاکستان میں کسی قانون ساز اسمبلی کی تو اس لئے ضرورت نہیں کہ اسلام کا قانون قرآن مجید میں پہلے سے خدا کی طرف سے بن کر آچکا ہے۔ البتہ اس قانون کو جاری کرنے اور اس کے اصولوں کے ماتحت حالات کے مطابق کچھ قواعد وقتاً فوقتاً ضرور بنانے پڑیں گے جن کے لئے ملک کے قابل ترین اور دیانت دار لوگوں پر مشتمل ایک مجلس جس کو عوام کے ہر طبقہ نے رضاکارانہ طور پر انتخاب کیا ہو۔ لہذا اس مجلس کے انتخاب کے سلسلہ میں قرآن مجید کے انصاف اور دیانت داری کے اصولوں کی روشنی میں چند تجاویز مناسب غور کے لئے پبلک کی خدمت میں پیش کی جاتی ہیں جو مناسب بحث و مباحثہ کے بعد اگر قابل قبول ہوں۔ تو پبلک کی طرف سے حکومت کو اس طرف راغب کرنے کی درخواست کی جانی چاہیئے۔

(۱) براہ راست انتخابات جن کا طریقہ آج تک جاری رہا ہے۔ نہایت تکلیف دہ اور نامناسب ثابت ہوتے ہیں۔ ووٹر بہت وسیع رقبہ میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لئے امیدواروں کی قابلیت وغیرہ سے ووٹروں کی بیشتر تعداد براہ راست کوئی واقفیت نہیں رکھتی۔ اور فقط ایجنٹ حضرات کے (جو بالعموم اپنی ذاتی اغراض کے ماتحت نالائق امیدواروں کا پروپیگنڈا کرتے ہیں) ناجائز رعب یا لالچ دلانے پر ووٹر اپنے ووٹ کا غلط استعمال کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ علاوہ ان بے شمار تکلیفات کے جو ووٹروں کے آنے جانے اور عملہ نگراں کے وقت اور خرچ وغیرہ سے پیدا ہوتی ہیں، ووٹروں کی عدم واقفیت کی وجہ سے اور بھی بے شمار بے ضابطگیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ اس لئے نہایت ضروری ہے کہ کوئی ایسا آسان اور کم خرچ طریقہ اختیار کیا جائے جس سے ان خرابیوں کا سدباب ہو سکے۔ یقین ہے کہ اگر انتخابات بالواسطہ کا طریقہ اختیار کیا جاوے تو موجود طریقہ سے وہ زیادہ مفید اور کم خرچ ہوگا۔ جو حسب ذیل ہونا چاہیئے۔

انتخاب ممبران ڈسٹرکٹ بورڈ

(۱) ایک ممبر کا حلقہ اندازاً پچیس ہزار آبادی پر مشتمل ہو جس میں ہر بالغ مرد و عورت کو ووٹ دینے کا حق ہو۔ بشرطیکہ وہ فاتر العقل اور کسی فوجداری جرم میں سزایاب نہ ہو۔

(۲) ہر واحد گاؤں کے ووٹر اپنے ذاتی علم اور تجربہ کی بنا پر آزادانہ ووٹ ڈال کر ایک ایک ووٹر کا انتخاب کریں۔

(۳) پچیس ہزار کی آبادی میں جو بیس پچیس ایسے ووٹر منتخب ہو جاویں۔ ان میں سے حسب ذیل اوصاف کے ووٹر ممبری کے لئے امیدوار کھڑے

ہو سکیں :۔

الف۔ جن کی عمر تیس سال سے کم اور پچھتر سال سے زیادہ نہ ہو۔

ب۔ جو کم از کم میٹرک تک تعلیم یافتہ ہوں۔

ج۔ کسی پرانی بیماری میں مبتلا نہ ہوں۔

د۔ کم از کم تین صد روپیہ ماہوار آمدنی رکھتے ہوں تاکہ ممبری کو ذریعہ معاش نہ بنا سکیں۔

ہ۔ انداز گفتگو پسندیدہ ہو، مذہبی مسائل میں قرآن پاک سے واقفیت رکھتے ہوں۔ جذبہ خدمت خلق کے علاوہ اخلاق پسندیدہ کے حامل ہوں۔ اور قومی اور رفاہ عامہ کے کاموں کے لئے وقت نکال سکتے ہوں اور ان میں دلچسپی لینے کے عادی ہوں اور اس عادت یا کام کی چند ٹھوس مثالوں کو بھی پیش کر سکتے ہوں۔

صفات بالا کے رکھنے والا اپنے حلقہ ممبری سے منتخبہ ووٹروں کے سب سے زیادہ ووٹ حاصل کرے۔ وہ ڈسٹرکٹ بورڈ کا ممبر ہوگا۔

میونسپل ممبران کا انتخاب

(۱) پانچ ہزار آبادی کے وارڈ میں ایک ممبر کمیٹی کا حلقہ قرار دیا جانے جس کے ہر بالغ مرد و عورت کو ووٹ دینے کا حق ہوگا۔

(۲) ہر حلقہ میں اوسطاً دس ووٹروں کا انتخاب ہر پانسو کی آبادی والے محلہ واروں سے کرایا جائے۔

(۳) ایسے دس یا زیادہ ووٹروں میں سے وہ شخص امیدوار ممبری کا اہل قرار دیا جائے جو مندرجہ ذیل اوصاف کا حامل ہو۔

الف۔ عمر تیس سال سے کم اور پچھتر سال سے زیادہ نہ ہو۔

ب۔ تعلیم میٹرک برائے کمیٹی درجہ اول اور بی۔ اے برائے کمیٹی درجہ اول ہو۔

ج۔ صحت اچھی ہو۔ کوئی دیرینہ بیماری نہ ہو۔

د۔ کم از کم تین صد روپیہ ذاتی آمدنی ماہوار رکھتا ہو تاکہ ممبری کو وجہ معاش قرار دینے پر راغب نہ ہو جائے۔

ہ۔ دینیات سے واقف۔ اچھا بولنے والا۔ خوش خلق، رفاہ عامہ کے کاموں میں دلچسپی لینے اور ان کے سرانجام کے لئے مناسب وقت دے سکتا ہو۔ دیانت داری میں اچھی شہرت کا مالک ہو۔

و۔ اپنی رفاہ عامہ اور دیانت داری اور تجربہ انتظامی کے متعلق کچھ ٹھوس مثالیں پیش کر سکتا ہو۔

ایسا جو شخص اپنے حلقے کے منتخب شدہ ووٹروں کے سب سے زیادہ ووٹ حاصل کرے۔ وہ ممبر کمیٹی ہوگا۔

اگر ہر ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپلٹی کے انتخاب شدہ ممبروں میں ڈاکٹر، انجنیئر، وکلاء اور تجارت پیشہ اصحاب میں سے کوئی منتخب نہ ہو سکے تو ممبران کمیٹی جو منتخب ہوئے ہوں۔ مندرجہ بالا ہر شعبہ کے دو دو ممبران اپنی کثرت رائے سے مزید منتخب کر لیں۔ کیونکہ ان اوصاف کے

بغیر بورڈوں اور کمیٹیوں کے کاموں میں ٹیکنیکل رائے کی عدم موجودگی کی وجہ سے اندیشہ نقصان اور خامی کا رہتا ہے۔

یہ ممبر اپنے صدر و نائب صدر وغیرہ بھی خود اپنے ووٹوں سے منتخب کریں گے اور میعاد ممبری و صدارت وغیرہ پانچ سال کے لئے ہوگی۔

البتہ ان میں سے ہر ایک ممبر یا عہدے دار اس میعاد سے پہلے کسی نامناسب حرکت کی بنا پر ⅔ اکثریت کی رائے سے علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔

جو ممبر اجلاس بورڈ یا کمیٹی میں بلا وجہ معقول شرکت نہ کریں یا کام میں دلچسپی نہ لیں۔ ایک دفعہ کی غیر حاضری کی جواب طلبی کے بعد ممبری وغیرہ سے علیحدہ کئے جائیں۔

صوبائی مجلس کی ممبری

ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپلٹیوں کے منتخب شدہ ممبر صوبائی مجالس کے لئے ممبر انتخاب کریں گے۔ ہر وہ ممبر جس کو اپنی بورڈ یا کمیٹی کے پانچ یا اس سے زیادہ ووٹ حاصل ہو جاویں صوبائی مجلس کا ممبر بن سکے گا۔ مگر یہ ضروری ہوگا کہ صوبائی مجلس کی ممبری پچاس ہزار سے لے کر ایک لاکھ کی آبادی تک ہوگی۔ جس کا کوٹا اس شرط کے تحت ہر ڈسٹرکٹ بورڈ اور کمیٹی کے لئے جدا جدا مقرر ہوگا۔

صوبائی مجالس کے فرائض

قرآن مجید کے مقرر کردہ قوانین کے نفاذ کے سلسلہ میں نامناسب موقعہ و وقت قواعد کا بنانا جو کسی حال میں بھی اصول قرآنی کے خلاف نہ ہوں۔

اگزیکٹو کے کام میں بورڈوں، کمیٹیوں اور صوبائی مجلسوں کے ممبروں کو مداخلت کی قطعی ممانعت تاکہ انتظام و سرانجام کار ہائے مفاد عامہ میں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ ہر ادارہ میں ممبروں کا کام پالیسی مقرر کرنا ہو۔ نہ کہ حقیقی انتظام میں دخل اندازی۔ جب وہ کوئی پالیسی یا قواعد مرتب کر لیں تو اگزیکٹو کو بلا مداخلت اسے اصل تجویز کے سرانجام کرانے کا پورا پورا موقعہ دینا چاہیئے۔ اگر ایگزیکٹو کے نااہل یا بد دیانت ثابت ہونے پر اس کے برخلاف ضابطے کی کارروائی ہونی چاہیئے۔ نہ کہ ذاتی اغراض کے ماتحت اس کی ذمہ داری پر، یا اس کو اپنی مطلب براری کرانے کا آلہ کار بنایا جاوے۔

امید ہے کہ اگر مندرجہ بالا تجاویز کے ماتحت ہر گاؤں میں رائے شماری کرائی جاوے تو نہایت آسانی سے ہر ایک ووٹر اپنی ذاتی واقفیت اور رائے کے مطابق اپنے نمائندہ کا انتخاب بہت کم خرچ اور نہایت تھوڑے عرصہ میں کر سکے گا۔ اور کسی کو شکایت نہ ہوگی کہ اس نے بغیر جانے بوجھے اپنے ووٹ کا غلط استعمال کیا۔ اور درحقیقت جو نمائندے اس طرح سے ہر سہ اداروں کے لئے منتخب ہوں گے۔ وہ بڑی حد تک مناسب اور موزوں ہوں گے۔

اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ کار ایسا نظر نہیں آتا جس سے ووٹنگ میں بد دیانتی یا نامناسب طریقہ ہائے استعمال روکا جا سکے۔

چونکہ پاکستان کی نوزائیدہ مملکت میں ابھی تعلیم نہایت کم ہے یعنی بمشکل تمام دس فی صدی آبادی کو نوشت و خواند سے واقف قرار دیا جا سکتا ہے اور ملکی بہتری اور ترقی کا تقاضہ ہے کہ جب تک آبادی کی اکثریت پوری طرح تعلیم یافتہ ہو جائے۔ اس کا انتظام جن لوگوں کے

سپرد کیا جائے۔ وہ علاوہ دیگر صفات کے بالضرور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں۔ ناخواندہ آبادی کو بہبود عامہ کا لحاظ کرتے ہوئے اس پر قطعاً اعتراض نہیں ہونا چاہیئے جب تک ہماری کونسلوں میں قابل اور دیانت دار اور اسلام سے واقفیت رکھنے والے ممبر منتخب ہو کر نہ جائیں گے۔ نہ تو قرآن مجید کی تعلیم کے مطابق عدل و انصاف اور نہ ہی ملکی ترقی کے لئے مناسب حالات پیدا ہو سکیں گے۔

اس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہمارے جیسے کم تعلیم یافتہ ملک میں ووٹر اور ممبر کے اوصاف بالکل جداگانہ ہونے چاہئیں۔ اور ان تعلیم یافتہ ملکوں کی مثال ہمارے واسطے بجائے فائدے کے نقصان دہ ہوگی۔ جہاں ہر آدمی اچھا لکھا پڑھا اور اپنے فرائض و حقوق سے ایک حد تک واقف ہوتا ہے۔ اور ایسے ملک میں ووٹر ممبر اور وزیر کے یکساں اوصاف ہوتے ہیں۔ کوئی ہرج نہیں ہو رہا۔ زبان سے کہنے اور اخبارات میں پراپیگنڈہ کرانے سے ہرگز ہرگز لائق آدمی ممبری اور وزارتوں کے لئے کبھی نہیں مل سکیں گے جب تک ان کی قابلیت جانچنے کے لئے ایسے معیار مقرر نہ ہوں گے جن پر پورا اترنے کے بعد ہی وہ ان مناصب جلیلہ کے اہل قرار پا سکیں۔

جب ادنیٰ و اعلیٰ ملازمتوں کے لئے اوصاف مقرر ہیں تو ان لوگوں کے لئے کیوں ایسے اوصاف قانوناً قرار نہ دیئے جائیں جنہوں نے تمام ملازمتوں اور امورات ملکی کے انصرام کا ذمہ دار بننا ہے۔

(احمد مختار، کنسلٹنگ انجینیر، گجرات۔ پنجاب)

(بقیہ صفحہ ۲۳) ہمارے کیمپ کے مختصر سلسلہ پیغام رسانی سے کیجیئے ان حقائق کا مقابلہ۔ پھر کہیئے کہ احادیث کی تدوین و صحت کے لئے آپ کا کیا نظریہ ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ قرآن حکیم کی سرمدی حکومت اور مقصد حیات کو چھوڑ کر مسلمان جب احادیث کی ہزار وادیوں میں وارد ہوئے تو اُن کا نبیؐ، اُن کا خدا ان سے ناراض ہو گیا۔ خوب کہا تھا، اکبر الہ آبادی نے ؎

سر رشتہ اتحاد ہم سے چھوٹا — آپس ہی کی خانہ جنگیوں نے لوٹا

قرآن کے اثر کو روک دینے کیلئے — ہم لوگوں پہ راویوں کا لشکر ٹوٹا

ضرورت اس امر کی ہے کہ صحیح (قرآن کے مطابق) احادیث کو موجودہ مجموعہ احادیث سے علیحدہ کر دیا جائے۔

یعقوب توفیق بی اے

ایک تجربہ

جولائی کے مہینے مجھے روورز سکاؤٹ کیمپ میں ٹریننگ کے لئے گھوڑا گلی جانا پڑا۔ مری کی شباب و رعنائی سے بھرپور وادی سے ذرا اس طرف جہاں انسان کی خوش پوشاں محفلیں فطرت کی سادگی کے سامنے ہیچ ہو جائیں۔ اس بھری دنیا کے ہنگاموں سے پرے ہمارا سکاؤٹ کیمپ عجیب فضا و ماحول میں بسا تھا۔ جہاں کی آب و ہوا سکون بیز اور سادگی تسکین آور تھی۔

ہمارے ٹریننگ کا ایک جزو تھا پیغام رسانی۔ ۲۷ جولائی کو ہلکی سی بارش سے فضا بھیگ گئی تھی۔ خنک ہوا کے جھونکوں سے تن و جاں میں ارتعاش کا پیدا ہونا تو عجیب نہ تھا مگر تخیل شاعری کے لئے گرما اٹھا۔ ابھی الفاظ کے تار و پود سلجھنے بھی نہ پائے تھے کہ سکاؤٹ ماسٹر صاحب کا وسل ہوا اور تمام سکاؤٹ میدان میں دوان دواں پہنچ رہے تھے۔

پیغام رسانی پر لیکچر ہوا اور اس کی عملی صورت کے لئے ہمارے الگ الگ ٹروپ کو سکاؤٹ ماسٹر صاحب نے سو سو گز کے فاصلے پر کھڑا کر دیا اور ہر ٹروپ کے پانچ سکاؤٹوں کو کافی فاصلے پر۔ ہدایت یہ ہوئی کہ ہر ٹروپ کا پہلا سکاؤٹ ماسٹر صاحب سے ایک پیغام سنے گا اور بھاگ کر اپنے ٹروپ کے دوسرے سکاؤٹ کو سنائے گا۔ اسی طرح دوسرا تیسرے کو، تیسرا چوتھے کو اور چوتھا پانچویں کو۔ پانچواں سکاؤٹ اس پیغام کو لکھ کر سکاؤٹ ماسٹر کو دے گا۔ پانچ ٹروپ کے یہ پیغام جب اکٹھے ہو جائیں گے تو تمام سکاؤٹ پھر میدان میں اکٹھے ہوں گے جہاں سکاؤٹوں کے یہ پیغام پڑھ کر سنائے جائیں گے۔

یہ سارا راؤنڈ پانچ منٹ میں ہونا تھا اور بس۔

پیغام یہ تھا:۔

"آج شام کو چھ بجے ایک ملٹری لاری ۱۲ زخمیوں کو لے آئے گی اور خالی ہو کر پھر مری لوٹ جائے گی۔ گھوڑا گلی کے ریسٹ ہاؤس میں زخمیوں کے لئے ۱۲ چارپائیاں۔ ۲۴ کمبل۔ ۴۸ ڈبل روٹی۔ ۱۰ مکھن کی ڈلیاں۔ تین درجن انڈے اور چائے کے لئے چار سیر دودھ تیار ہو۔"

آخری سکاؤٹوں نے جو مختلف ٹروپ کی طرف سے پیغام پہنچایا یہ تھا:۔

خالد ٹروپ:۔

"آج ایک ملٹری لاری زخمیوں سے بھری ہوئی ریسٹ ہاؤس میں آئے گی جس کے لیے ۱۲ چارپائیاں ۔ ۲۴ کمبل ۔ ۴ سیر مکھن ۳۶ ڈبل روٹیاں اور تین درجن انڈے اور چائے تیار رکھیں۔"

ٹیپو ٹروپ:۔

"زخمیوں کی ایک لاری مری سے ملٹری ریسٹ ہاؤس میں شام کو چھ بجے آئے گی جس کے لئے چائے کے تین درجن بسکٹ ۴۸ کمبل ۔ ۱۸ ڈبل روٹی، دو درجن مکھن، دو درجن انڈے اور ۲ سیر دودھ تیار ہو ۔ یہ لاری گھوڑا گلی میں رہے گی۔"

اورنگ زیب ٹروپ:۔

"پنڈی سے ایک لاری زخمیوں کو لے کر مری جاتے ہوئے گھوڑا گلی کے ہسپتال میں آئے گی ۔ زخمی ۲۴ ہوں گے ۔ اُن کے آنے پر انہیں ۴ درجن کمبل، تین درجن انڈے، تین درجن ڈبل روٹی اور ایک درجن مکھن دے دیں ۔ چائے اور دودھ کا انتظام خاطر خواہ کریں۔"

قاسم ٹروپ:۔

"مری سے ایک لاری شام کو ملٹری زخمیوں کو لے کر گھوڑا گلی کے ملٹری ہسپتال میں آئے گی ۔ اُن کے آنے پر انہیں چائے بالکل تیار ملے اور ہر ایک زخمی کو ایک چارپائی اور دو کمبل دئے جائیں ۔ نیز ان کو دو درجن ڈبل روٹی تین درجن مکھن اور چار درجن انڈے دئے جائیں ۔ یہ زخمی رات کو ہسپتال میں رہیں گے اور پھر مری لوٹ جائیں گے۔"

جناح ٹروپ:۔

"ملٹری کی ایک لاری ایک درجن آدمیوں کو لے کر ریسٹ ہاؤس میں آئے گی ۔ یہ آدمی رات رہ کر دوسرے دن مری واپس چلے جائیں گے ۔ ریسٹ ہاؤس میں ان کے لئے چارپائیاں اور تین درجن کمبل، چار درجن انڈے، تین درجن مکھن اور ڈبل روٹی تیار ملے ۔ چائے اور دودھ کا ہونا ضروری ہے۔"

ماسٹر صاحب اپنا پیغام سنا کر ہر ٹروپ کا علیحدہ علیحدہ لکھا ہوا پیغام سنا رہے تھے اور کیپ وجنگل کے ملے جلے قہقہے فضا میں کھلبلی مچا رہے تھے ـــــــ آپ اصلی پیغام کو پھر ایک دفعہ پڑھیے اور ہر ٹروپ کے پانچویں سکاؤٹ کا، پانچ منٹوں بعد لکھا ہوا پیغام ۔ آپ کو یقین ہو جائے گا کہ ہمارے قہقہے بیکار نہ تھے، حقیقت کا اظہار تھے۔

ایک پیغام ۔ بالکل مختصر ۔ سادہ اور سلیس ۔

پانچ پانچ سکاؤٹوں کے پانچ ٹروپ ۔

یہ کھیل صرف پانچ منٹ کے لئے۔

اور نتیجہ ـــــ کتنا مضحکہ خیز۔ کتنا غلط۔ کتنا تعجب انگیز۔

تمام سکاؤٹ ہنس رہے تھے اپنی بے مائیگی پر اور قحطِ حافظہ کے ہاتھوں شرمندہ ہو رہے تھے اور میں محو حیرت بنا یہ سوچ رہا تھا کہ پانچ منٹ کے وقفہ سے ـــــ سکاؤٹ ماسٹر حاضر ـــــ ہر ٹروپ کا سکاؤٹ حاضر ـــــ ایک سے پانچویں سکاؤٹ تک مختصر پیغام کی ترسیل اور آخری سکاؤٹ کا تحریر شدہ پیغام اصل سے یوں بیگانہ ـــــ تقریباً بالکل غلط۔

پانچ منٹ میں انسانی ذہن نے پانچ مختلف افراد کے ہاتھوں مختصر پیغام کو کیا سے کیا بنا دیا۔ تو ہمارے مجموعہ احادیث کو اکابر نے اڑھائی سو سال کے طویل عرصہ میں کہاں سے کہاں اور کیا سے کیا نہ کر دیا ہوگا۔ جب کہ

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن حکیم کے علاوہ اُمت کو کوئی مجموعۂ احادیث دے کر نہ گئے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے اپنی چند احادیث اُمت میں تفرقہ کے ڈر سے جلا ڈالیں۔

حضرت عمر رضؓ نے احادیث کی روایت کو قانوناً بند کر دیا۔

حضرت عثمان رضؓ نے صرف قرآن حکیم کی نقول مختلف ممالک میں ارسال کیں۔

حضرت علیؓ، امام حسنؓ، امام حسینؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ نے احادیث کا مختصر سا مجموعہ بھی اُمت کے لئے نہ چھوڑا۔

مگر یہ "سعادت" امام موطا اور بخارا و سمرقند و نیشاپور کے دوسرے اماموں کے حصے میں آئی۔ یوں کہ زید سے کہا بکر نے، بکر نے سنا عمرو سے، عمرو سے بیان کیا خالد نے، خالد سے ذکر کیا طالب نے اور طالب کو بتایا عبداللہ نے ـــــ یہ فلاں ابن فلاں ابن فلاں کا سلسلہ زندوں سے زیادہ اکثر ان بزرگوں سے مروی ہے جو اللہ کو پیارے ہوئے اور ہمارے بزرگ ائمہ حدیث ملک ملک کی خاک چھان رہے ہیں اور فلاں ابن فلاں سے اپنے قائم کردہ معیار صداقت کے مطابق مجموعہ احادیث اکٹھا کر رہے ہیں۔

امام بخاریؒ نے تقریباً ایک لاکھ ۶ ہزار احادیث اکٹھی کیں اور قطع و برید کے بعد تقریباً پانچ ہزار اپنے صحیفہ میں محفوظ کیں جو تکرار کے بغیر تقریباً تین ہزار رہ جاتی ہیں۔

اور یہ احادیث کے مختلف مجموعے اس وقت اکٹھے ہوئے جب کہ

۱ـــــ نبی اکرمؐ کی ذات بابرکات ان کی تصحیح یا تغلیط کے لئے موجود نہ تھی۔

۲ـــــ کوئی صحابی ان کی صحت و عدم صحت کے لئے گواہی نہ دے سکتے تھے۔

۳ـــــ خلفائے راشدین کے زمانہ میں کسی کو احادیث لکھنے اور جمع کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

۴ـــــ اکثر راوی مُلکِ بقا کو سدھار چکے تھے۔

(باقی دیکھئے صفحہ ۳۰ کے نیچے)

عرشی

میں نے ایک انسان دیکھا

اللہ پاک نے مجھے ایک کسوٹی دے رکھی ہے جس پر کس کر میں انسان کی انسانیت اور مسلم کی اسلامیت کو پرکھ لیتا ہوں۔ اور خدا کے فضل سے کبھی ایک دفعہ بھی غلطی نہیں لگی۔ معلوم ہو ہی جاتا ہے کہ یہ کھرا سونا ہے یا آمیزش والا یا نرا پیتل ـــــ میں آپ کو بھی کسی شکریے کی امید رکھے بغیر وہ کسوٹی دے دیتا ہوں۔ برتئیے اور اپنے ملنے والوں کو پرکھتے جائیے۔ وہ کسوٹی کیا ہے ـــــ ایفائے عہد۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کردار کی ساری عمارت اسی ایک بنیاد پر استوار ہو سکتی ہے۔ میں نے جس جس ملنے والے کو عہد کا پورا دیکھا۔ اس میں اخلاق کی باقی تمام خوبیاں بھی موجود دیکھیں، اس کے برعکس وہ لوگ بھی دیکھے۔ جو علم و ارشاد کی مسندوں پر بیٹھتے ہیں۔ حکم و عدالت کی کرسیوں کی آرائش بنے ہوتے ہیں۔ علوم شرعیہ کے بحر ذخار ہیں۔ اخلاق پر کتابیں لکھتے ہیں۔ قرآنی نکات سے متعلق گفتگو ہو تو بال کی کھال اتارتے ہیں۔ سچ مچ دل میں کھب جانے والے نکتے نکالتے ہیں ـــــ لیکن جب انہیں وعدے کی کسوٹی پر کسا جاتا ہے۔ تو پیتل ثابت ہوتے ہیں ـــــ خدا کی قسم نرے پیتل ـــــ بس یہیں آ کر ہمارا ان کا راستہ الگ ہو جاتا ہے۔ رسماً ملتا رہتا ہوں ـــــ اور رسماً کس کو نہیں ملتا۔ گھر کی مرغیوں اور گائے بھینسوں کو بھی ملنا ہی پڑتا ہے۔ لیکن دل کے کسی عزیز گوشے میں ان کو جگہ نہیں دے سکتا ـــــ دینی مجلسوں اور میٹنگوں میں بیٹھ کر وعدے کرنے والے بڑے بڑے چندے لکھوانے والے، مولوی کہلانے والے، مضمون نگاری اور تقریر بازی کرنے والے۔ جابجا قوم کی حالت پر کڑھنے والے، اچھے کھاتے پیتے، اثر و رسوخ والے لوگ وعدے کی کسوٹی پر یا تو آمیزش والا سونا ثابت ہوتے ہیں یا بالکل ہی پیتل ـــــ غریب مولوی ذرا زیادہ بدنام ہے کہ

"چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند"

کا فتویٰ اس کی ڈاڑھی سے لٹکا دیا گیا ہے۔ لیکن یہ غیر مولوی قسم کے مشاہیر و صنادید اس معاملے میں مولوی کے بھی کان کترتے ہیں۔

خیر یہ ایک تمہید تھی اس بات کی جو میں کہنے والا ہوں۔ یعنی میں نے ایک آدمی ایسا دیکھا جس کو وعدے کی کسوٹی پر بالکل کھرا سونا پایا ـــــ لوگ مقالے لکھتے ہیں، ادیبوں پر، شاعروں پر، افسانہ نگاروں پر، لیڈروں اور بڑے بڑے عالموں فاضلوں پر ـــــ میں مقالہ لکھنے بیٹھا ہوں ایک ایسے گمنام شخص پر جس نے تمام زمانہ تعلق میں میرے ساتھ ایک بھی وعدہ خلافی نہیں کی ـــــ وعدے

کی اہمیت میرے دل سے پوچھو ـــــ یا پھر خدائے قرآن سے پوچھو جس نے اسماعیلؑ پر ایک شاندار ابدی مقالہ لکھ دیا۔ جس کا عنوان ہے

واذکر فی الکتاب اسماعیل انہ کان صادق الوعد ...

اس ابدی کتاب میں اسماعیل کا نام بھی درج کردو۔ وہ یقیناً وعدے کا سچا تھا۔ (سورہ مریم)

صحیح مدت تو مجھے یاد نہیں شاید ڈھائی تین سال کا عرصہ ہو۔ فون پر پہلے سے وقت مقرر کر کے ایک دن مرزا معراج الدین صاحب مجھے ملنے کے لئے دار القرآن میں تشریف لائے۔ ان کے ساتھ ایک اور صاحب تھے۔ گورے چٹے، ڈاڑھی منڈھی ہوئی۔ قد متوسط سے ذرا کم، معتدل حد تک خوش پوش و خوش وضع مگر سادگی لئے ہوئے ـــــ مرزا معراج الدین صاحب تقسیم سے پہلے امرت سر ہی میں مجھ سے متعارف ہو چکے تھے۔ نئے صاحب سے انہوں نے میرا تعارف کرایا

"یہ ہیں میرے چھوٹے بھائی مرزا خدا بخش، قرآن مجید کے حافظ ہیں۔ گہرا دینی ذوق رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی آپ کو ملتے رہیں گے آپ سے پھر کبھی مل کر بعض مسائل پر تفصیلی گفتگو کرنا چاہتے ہیں"

سچی بات ہے۔ مجھے اس ملاقات میں مرزا خدا بخش صاحب کی شخصیت نے کچھ متاثر نہیں کیا۔ لیکن میں ان کے حافظ قرآن ہونے پر قدرے متعجب ضرور ہؤا۔ باقی رہے دینی مسائل، تو میں نے خیال کیا۔ آج کل کے جنٹلمین تفریح طبع کے طور پر دینی مسائل پر گفتگو کر ہی لیا کرتے ہیں۔ کسی وقت کوئی شطرنج کھیلنے والا نہ ملا تو ذرا "طلوع اسلام" ہی پڑھ لیا ـــــ میں نے خیال کیا اسی قسم کے یہ صاحب بھی ہوں گے۔ لیکن تجربے نے میرے اس خیال کی پوری طرح تغلیط کی۔

مرزا صاحب نے واقعی میرے ہاں آمدورفت شروع کردی۔ اور مجھے بھی اپنا مکان دکھا دیا۔ جب آنے کا وعدہ کرتے تو وقت پر پہنچتے۔ مجھے ان کے انتظار میں ذرا بھی پریشان نہ ہونا پڑتا۔ جب مجھے بلاتے تو وقت پر موجود ہوتے۔ ابتدائی صحبتوں میں خوب جی بھر کے باتیں ہوئیں۔ چند ہی دنوں میں ہم دونوں کو اطمینان ہو گیا کہ ہم اپنے تبلیغی سفر میں صدقی صدر رفیق بن سکتے ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کی پرورش لاہوری اہل قرآن (مولوی عبداللہ چکڑالوی مرحوم) کے ماحول میں ہوئی ہے۔ ان کے والد اس مسلک کے پکے معتقد تھے۔ اس کے بعد انہوں نے دوسری جماعتوں کا لٹریچر دیکھنا شروع کیا۔ مولانا اسلم اور جناب پرویز کے مضامین دیکھے۔ مولانا مودودی کا لٹریچر بھی دیکھا۔ ان کی صحبتیں اٹنڈ کیں۔ احمدیت کے کوچے سے بھی گزرے۔ لیکن اس سے متاثر نہ ہو سکے۔ ایک بات انہوں نے مجھے خاص طور سے کہی جو میں ان کے لفظوں میں بیان کرتا ہوں۔

"میں نے خواجہ احمد دین مرحوم کی تفسیر بیان للناس کو اول سے آخر تک دیکھا ہے۔ اس نے مجھے بہت بلند کر دیا"

بس یہ چیز میرے ان کے کامل اتحاد کا باعث ہوئی۔ وہ نہایت معقول قسم کے انسان تھے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ "مجھے خواجہ صاحب

کی ہر ہر بات سے اتفاق نہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی میں ان کو بہت ارفع و اعلیٰ سمجھتا ہوں"

میں (راقم) براہ راست خواجہ صاحب سے مستفیض ہوں۔ برسوں خلوتوں اور جلوتوں میں ان سے صحبت رہی۔ ان کو اپنے زمانے کا ولی اللہ اور بہترین انسان سمجھتا ہوں۔ لیکن ان کی ہر ہر تحقیق سے متفق ان کی زندگی میں بھی نہیں تھا۔ ان سے اختلاف کا اظہار بھی کرتا تھا اور یہ انہی کی تعلیم تھی کہ محض کسی شخصیت کی تقلید سے کوئی بات نہ مانو۔ تحقیق کرو۔ دل مطمئن ہو تو تسلیم کرو ورنہ چھوڑ دو۔ اپنی ہر بات منوانے کا حق قرآن کے سوا کسی کو نہیں۔ اس کی کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو اپنے قصور فہم کا اعتراف کرو اور سمجھنے کی کوشش میں لگے رہو۔ بڑوں کی ہر بات کو ضرور ہی صحیح ماننا اور غلط ثابت ہونے پر بہ تکلف صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرنا، احبار و رہبان پرستی ہے جو اس امت میں ائمہ پرستی اور پیر پرستی بن گئی ہے ـــــ یہ بہت بڑی ارفع اور اعلیٰ چیز تھی جو ہم نے خواجہ صاحب سے سیکھی اور خواجہ صاحب نے مولانا غلام علی قصوریؒ کی صحبت میں بیٹھ کر قرآن مجید سے حاصل کی۔

آخر متعدد صحبتوں کے بعد ہم دونوں اس نکتہ پر متفق ہوئے کہ ہم نے بقدر فہم اس صداقت کو دریافت کر لیا ہے۔ جس پر ان مقدسین اور متبحرین علاموں کی نظریں ہرگز نہیں پہنچ سکتیں جو حدیث فقہ اور تصوف وغیرہ کی عینک لگا کر قرآن کو دیکھتے ہیں ـــــ قرآن اپنے جمال ابدی کو ان غیر محرم لوگوں سے چھپا لیتا ہے۔ جو اس کے اپنے حکم کی خلاف ورزی کر کے غیروں کو ساتھ لئے ہوتے اس سے عشق کا دعویٰ کر رہے ہوں۔ اس کا اپنا حکم کسی سے چھپا ہوا نہیں۔ لیکن تاویل کی نگاہ نے ہمیشہ اس سے انحراف کیا۔

اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ـــــــــ یہ امر ہے

ولا تتبعوا من دونہ اولیاء ـــــــــ یہ نہی ہے (اعراف رکوع ۱)

اسی کتاب کو مانو ـــــــــ اس کے غیر کو نہ مانو

اس میں ایک ٹکڑے کو مانو اور دوسرے کی تاویل کرو تو دونوں سے محروم رہ گئے ـــــ راقم نے اور مرحوم مرزا نے اس راز کو پالیا اور اس کی بعض تفصیلات بھی آپس میں طے کریں اور آہستہ آہستہ قدم اٹھانے کا وعدہ کیا ـــــ جن سلیم اور معتدل نکتوں پر ہم متفق ہوئے، ہمارے پرانے دوستوں اور خواجہ صاحب کے کئی ہم نشینوں نے بھی ان کو نہیں سمجھا، بعض وہ بھی ہیں جو جمود و تقلید کے اسی مقام پر کھڑے ہیں جس کا وہ دوسروں کو طعن دیتے ہیں ـــــ جزئیات میں کامل اتفاق کا مطالبہ نہ قرآن نے کیا اور نہ خواجہ صاحب نے سکھایا۔ لیکن اہل مذاہب اس مہلک غلطی میں مبتلا ہوئے اور ہمارے بعض دوستوں کو بھی یہ غلطی لگی۔ مرزا صاحب سعید الفطرت اور سلیم الطبع انسان تھے وہ اس الجھن سے بالکل صاف نکل چکے تھے خدا کا شکر ہے کہ اب بھی ہمارے حلقے میں (گو قلیل تعداد میں ہی سہی) ایسے لوگ موجود ہیں۔ اگر حالات ان کی مساعدت کریں تو قرآن کا صحیح پیغام دنیائے انسانیت کے سامنے یہی لوگ پیش کر سکتے ہیں۔

اس مقام پر پہنچ کر ہم نے ایک دوسرے کے دوستوں سے تعارف پیدا کیا۔ وہ میرے ملنے والوں اور میں ان کے ملنے والوں سے متعارف

ہؤا۔ ملاقاتوں کے علاوہ فون پر بھی ہماری طویل گفتگوئیں ہوتی رہیں۔ اور ایک دوسرے کے حالات سے باخبر رہنا ضروری سمجھا گیا۔ ان کو ہر چیز سے زیادہ اس بات کا فکر تھا کہ ہم نے جو کچھ سمجھا ہے، اگر لوگوں کی استعداد کے مطابق اس کی تبلیغ نہ کی تو ہم اللہ کے حضور پکڑے جائیں گے۔ ہماری نجات اسی میں ہے کہ مسلمانوں کو اعمال صالحہ کی طرف بلائیں۔ کسی جماعت سے متصادم ہوئے بغیر کوئی فرقہ بنائے بغیر سب مسلمانوں کی خیر چاہیں۔ جو لوگ تبلیغ کا کام کر رہے ہیں، جس حد تک وہ صحیح چلتے ہیں ہم ان کی تائید کریں۔ ساری قوم کو یعنی مسلمانوں کے تمام فرقوں کو چند ایسے اصولوں پر متحد کریں جو سب کے نزدیک مسلّم ہیں اور اختلافی امور کے متعلق ان میں بُردباری پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

حالات کیسے ہی مایوس کن ہوں، مرزا صاحب مایوس ہونا نہیں جانتے تھے۔ میں نے بعض باتیں ان میں خصوصیت سے دیکھیں جن میں سے بعض کے متعلق اگر میں کہوں کہ کہیں نظر نہ آئیں تو شاید مبالغہ نہ ہوگا۔

وعدہ

ان کے ایفائے عہد کے متعلق میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ میں نے اپنی عمر میں چند ہی انسان وعدے کے پابند دیکھے ہیں۔ لیکن وہ عموماً وعدہ کرتے ہی نہ تھے کہ پابند نہ ہونا پڑے۔ مرزا صاحب کی خاص بات یہ تھی کہ وعدہ میں بخل نہیں کرتے تھے۔ اس کے باوجود ہمیشہ ہی صد فی صد پورا کرتے تھے۔

ترجیحِ دین بر دنیا

وہ آہستہ آہستہ مشق کرکے اس مقام پر پہنچ چکے تھے کہ قریب قریب ہر ایسے موقع پر جہاں دین و دنیا کا تصادم ہو دین کو دنیا پر ترجیح دے سکیں۔ اور اب انہیں اس میں کوئی تکلف نہیں ہوتا تھا۔ سادہ مسلمان کرامات کے پیچھے پیچھے بھاگا پھرتا ہے۔ یہ ایسی کرامت ہے کہ بڑے بڑے اکابرین میں نہیں دیکھی گئی۔

وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ

انہوں نے اپنے گھر کے ہر ہر فرد کو اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا، بچوں تک کی تربیت میں تیغ عملی اور معقول اسلام کا بہت لحاظ رکھتے تھے۔ اس سے بھی ہمارے صلحاء ابرار کے گھرانے عموماً محروم ہی ہیں۔ آخری میٹنگ میں میرے والد صاحب نے مجھے کہا کہ آج رات کے لئے بطخ ذبح کردو، میں نے عذر کیا کہ میں نے آج تک کبھی یہ کام نہیں کیا قصاب سے کرا لیجئے۔ مرزا صاحب کے کان میں یہ بات پہنچی تو بولے

"مجھ سے اونٹ ذبح کرا لیجئے"

دوسرے ہی دن صبح کو ان کی کوٹھی پر پہنچا تو باتوں باتوں میں انہوں نے کہا

"میں حیران ہوں کہ آپ کے گھر میں کوئی نہیں جو جانور کو ذبح کر سکے۔ یہ اسلامی تعلیمات کے لحاظ سے سخت کمی ہے۔ میں نے اسی ایک بات سے آپ لوگوں کا بہت کچھ اندازہ لگا لیا۔ ہمارا ہر بچہ ذبح کر سکتا ہے۔ ہمارے بچے، دینی تربیت و تعلیم کے ساتھ ساتھ تیراکی، اور کشتی کرنے میں موچی دروازہ کے کسی "گامے ماجھے" سے پیچھے نہیں۔ ہم سب آپس میں مل کر ورزش کرتے ہیں"

شدّتِ عمل

اس میں شک نہیں کہ ان کا جسم ورزشی اور صحت مند تھا —— یہ میری ان کی آخری ملاقات تھی اور ہم نے آخری بار

ل کر کھانا کھایا۔ ایک دفعہ انہوں نے میرے سامنے اپنے کسی جسمانی عارضے کی شکایت کی۔ میں نے انہیں قدرتی علاج (نیچر کیور) کی طرف متوجہ کیا۔ انہوں نے میری باتوں کو غور سے سُنا اور مجھ سے اس فن کی کتاب مانگی۔ میں نے کتاب دے دی۔ انہوں نے پڑھ کر اور بھی کئی جدید الطبع کتابیں مہیا کر کے دیکھ ڈالیں اور اس کے قائل ہو کر جلد ہی عامل بھی بن گئے۔ میرا تخمینہ ہے کہ انہوں نے گھر بھر کو قدرتی خوراک کا پابند بنا دیا۔ یہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ مجھے جب بھی ان کے ہاں جانے کا اتفاق ہوتا تھا کھلائے پلائے بغیر نہ چھوڑتے تھے اور ہر دفعہ وہی کھانے سامنے آتے تھے جن کی قدرتی علاج کے محققین نے سفارش کی ہے۔ پھر وہ ساتھ ہی ان کھانوں کی نوعیت اور باہمی توافق و تضاد پر بھی مفید گفتگو کرتے جاتے ـــــ اور مجھ بے عمل کا یہ حال ہے کہ

مُلّاں تے مشالچی دونویں اکو ہان

لوکاں کردے چاننا آپ ہنیرے جان

(مشعل بردار اور مُلّاں دونوں ہی یکساں ہیں لوگوں کو روشنی دیتے ہیں اور خود اندھیرے میں رہتے ہیں)

میں نے ان کو قدرتی علاج کی روشنی دکھائی اور خود مختلف قسم کے علاجوں کی تاریکیوں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہوں۔

میں نے مذکورہ بالا آخری میٹنگ میں ایک مایوس اصلاح بزرگ کے جواب میں ایک حوصلہ افزا تقریر کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ "اگر ہم صرف افکار میں تبدیلی کر سکیں تو یہی غنیمت ہے۔ افکار و اعمال میں پچاس سال کا فاصلہ ہوا کرتا ہے۔ ہم خود اپنے فکر کے لحاظ سے بہت آگے اور عملاً ابھی پیچھے ہیں۔"

اس کا اثر اچھا ہی ہوا، سب نے خموشی سے سُنا اور بعض نے تائید بھی کی، مرزا صاحب مصلحتاً خاموش رہے۔ دوسرے دن گھر کی ملاقات میں تنہائی کا موقع دیکھ کر فرمایا

"آپ کی کل والی تقریر ٹھیک نہیں۔ فکر و عمل میں کوئی فاصلہ و تفاوت نہیں ہونا چاہیئے۔"

میں نے کہا ـــــ "ہونا نہیں چاہیئے۔ لیکن واقعتہً ہوتا ایسا ہی ہے" ـــــ اس لئے آپ ان کی ذہنی پرواز اور عملی ذوق و شدت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اور جہاں تک میں نے دیکھا انہیں اور ـــــ شاید صرف انہیں ایک بڑی حد تک ایسا ہی پایا ـــــ انہوں نے تنہا اپنے ذمے بہت سے دینی، سرکاری اور خانگی کام لے رکھے تھے اور قریب قریب سب کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے

توازن

ایک اور عجیب بات میں نے ان میں دیکھی۔ بڑے بڑے ہیجانی موقعوں پر آپے سے باہر نہ ہوتے تھے۔ ایک دلآویز توازن سے مخاطب کے جوش کو ٹھنڈا کر کے قائل معقول کر لیتے تھے

انفاق فی سبیل اللہ

ضرورت مندوں کی مدد بلا طلب کرتے بھی میں نے انہیں دیکھا ہے۔ بلکہ بعض دفعہ لینے والا انکار کرتا اور آپ اصرار کرتے کہ "قبول فرما لیجئے" ـــــ گزشتہ سیلاب کے موقعہ پر میری زبان سے نکل گیا کہ

"میرے فلاں عزیز بھی اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ ان کے کاروبار اور مکان دونوں پر سخت اثر پہنچا ہے اب وہ میرے ہاں مقیم ہیں۔"
شاید دوسرے یا تیسرے دن مرزا صاحب آئے۔ مجھے آواز دی۔ میں نیچے اُترا۔ سیڑھیوں میں کھڑے کھڑے پچاس روپے کے نوٹ مجھے دے کر کہا

"سیلاب زدوں کی امداد کے لئے۔"

میں کہتا ہی رہ گیا کہ ان کی گزر ہو رہی ہے۔ آپ تکلیف نہ کیجئے۔ آپ "نہیں نہیں رکھ لیجئے" کہتے ہوئے یہ جا وہ جا، نظروں سے غائب ہو گئے۔

اُن کی رحلت کے بعد ایک صاحب نے سنایا

"ہم دو شخص انہیں ملنے کے لیے گئے۔ میرے ساتھی نے جھک کر سلام کیا۔ مرزا صاحب نے جھکنے سے منع کیا —— اس نے اپنی لڑکی کی شادی کے لئے اپنی محتاجی بیان کی۔ مرزا صاحب ہمیں اوپر کی منزل پر لے گئے۔ نہایت اخلاق سے بٹھایا اور پانچ سو روپے کی رقم دے کر کہا

"کسی سے ذکر نہ کرنا۔"

میرے ایک صاحب علم دوست جو اِن دنوں بیکار تھے۔ انہوں نے خط میں اپنی مفلوک الحالی کا ذکر کیا۔ مرزا صاحب نے خط پڑھ کر مجھے کہا

"انہیں بلا لیجئے، ہماری کوٹھی میں قیام فرمائیں، فی الحال پچاس روپے ماہوار اور کھانا ان کی خدمت میں پیش ہوتا رہے گا اور وہ یہ خیال نہ کریں کہ خیرات کھا رہے ہیں۔ ہمارے بچے گھڑی دو گھڑی ان کے پاس بغرض تعلیم بیٹھ جایا کریں گے۔"

لیکن ان کا کام کسی اور جگہ بن گیا اور اس پیشکش کو قبول نہ فرما سکے۔ اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت ہی تھی۔ اگر آ گئے ہوتے تو انہیں مرحوم کی ناگہانی رحلت کا کتنا زبردست صدمہ سہنا پڑتا۔

جہاں تک میں نے دیکھا ان کی زندگی کا ہر پہلو باقاعدہ باضابطہ اور بااصول تھا۔

خطیب دار القرآن حافظ سردار بیگ نے یعقوب توفیق صاحب کی زبانی سن کر مجھے سنایا کہ

دیانت مرزا صاحب چوں کہ بہت بااختیار گورنمنٹ سپلائی کنٹرولر تھے۔ سرکاری سامان جو کروڑوں روپے کے خریدے جاتے تھے۔ ان کی منظوری ہی سے خریدے جاتے تھے۔ ایک دفعہ کسی شخص نے ان کو لاکھ روپیہ رشوت دیکر اپنا ناقص مال بھی سرکار فروخت کرنا چاہا —— آپ نے کہا

"کیا ہمیں مرنا نہیں ہے؟"

یہ کہہ کر رد کر دیا ۔۔۔۔۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اگر انہوں نے قبول کر لیا ہوتا تو آج وہ اس کی پاداش میں گرفتار ہوتے اور وہ ان کے کام بھی نہ آتا۔ بلکہ وہ ان کے پیچھے رہا ہوا روپیہ ان کی اولاد کے اخلاق پر مہلک اثر ڈالتا ۔۔۔۔ آج وہ اللہ کے حضور میں سُرخ رُو ہیں۔ اور ان کے ورثا کو حکومت کی طرف سے ستر ہزار روپیہ ان کی نیک نامی کا انعام ملا ہے۔ اور ان کے بڑے لڑکے کو اعلیٰ ملازمت کی امید دلائی گئی ہے۔

اوپر ان کی سخاوت کے چند واقعے اور ترکِ رشوت کا صرف ایک واقعہ بیان ہوا۔ اس کو نمونہ سمجھئے۔ کس کو معلوم ہے کہ ان کی سخاوت کا فیض کہاں کہاں پہنچتا تھا۔ اور کتنی رشوتیں انہوں نے لوٹائیں اور پھر اس لوٹانے کا کسی سے ذکر بھی نہیں کیا ۔۔۔۔ یہ ہے اخلاص للہ۔

مجھ پر ان کی اچانک موت کا یہ اثر ہوا کہ کئی دن تک ان کا خیال اور صورت دل کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکی۔ بس یہ حالت تھی

ہردم رہندا ای رانجھا میریاں اکھیاں دے ساہمنے

اور اب بھی کہ اس واقعہ کو کئی ہفتے گزر چکے ہیں اور زندگی باقی ہے تو کئی سال گزر جائیں گے ۔۔۔۔ لیکن یہ زخم مندمل نہیں ہوگا۔

۔۔۔۔ ایسے آدمی کہاں پیدا ہوتے ہیں جن کے پاس بیٹھ جانا بھی داخلِ عبادت ہو جائے۔

میں ان کے برادرِ اکبر مرزا معراج الدین صاحب (جو خدا کے فضل سے بہترین انسان اور بہترین مسلمان ہیں) اور ان کے فرزند اکبر مرزا سمیع صاحب اور ان کے احباب سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ اپنی اپنی استعداد و استطاعت کے مطابق ان کے جاری کئے ہوئے نیک کاموں کو جاری رکھ کر ان کی پاک روح کو صحیح معنی میں ثواب پہنچانے کی خدمت انجام دیتے رہیں گے۔ اور ان کے کام یہی تھے ۔۔۔۔ قرآن کا علم اور قرآن پر عمل۔

وہ یقین رکھتے تھے کہ اسی سے پاکستان مستحکم ہو سکتا ہے۔ اسی سے تمام ممالک اسلامی حیات نو حاصل کر سکتے ہیں۔ اسی میں تمام دنیائے انسانیت کی فلاح مضمر ہے۔

وہ جانتے تھے کہ مُلّا اور پیر کے اسلام میں کوئی زندگی نہیں۔ یہ مصنوعی اسلام تجربۃً فیل ہو چکا ہے ۔۔۔۔ لیکن وہ اس بھڑوں کے چھتے کو چھیڑے بغیر مسلمانوں کو محمد رسول اللہ کے بھولے بھالے وارثوں کو محمد رسول اللہ کے ابدی ترکہ سے واقف بنانا چاہتے تھے۔

بلاشبہ اس زمانے میں وہ عظیم انسان تھے، جن کو اپنی عظمت کا غلط احساس نہیں تھا، وہ ہر غریب سے غریب شخص کے پاس دین کے بھکاری بن کر جاتے تھے۔ اس میں انہیں کبھی عار نہ ہوتا تھا۔ میں نے ان کے کردار سے بعض ایسی باتیں سیکھیں جو برسوں کتابیں پڑھنے سے عملاً نہیں سیکھ سکا تھا ۔۔۔۔ کتابیں بڑی چیز ہیں، بہت کچھ سکھاتی ہیں۔ لیکن صاحبِ عمل انسان کی تاثیر ان سے بہت ارفع و اعلیٰ پائی گئی ہے ۔۔۔۔ البیان کے صفحات جو آج آپ کے زیر مطالعہ ہیں، انہی کی دانش و تدبر اور ہمت و استقلال کی بہترین یادگار ہے۔ اور اس یادگار کو جوان کی اور سابق بزرگوں کی مقدس یادگار ہے پائندہ تر بنائیں اور اس کے ذریعے قرآن کا نور اپنے اندر اور باہر پھیلائیں۔

سر بازار

مستبصرین

آج (۲۲/۵) قبل فجر دوران تلاوت میں یہ آیت سامنے آگئی کئی عقدے حل ہو گئے۔
"وزین لھم الشیطان اعمالھم فصدھم عن السبیل وکانوا مستبصرین"

کئی دفعہ اپنے آپ کو خیال آتا تھا اور بعض پوچھنے والے بھی پوچھتے تھے کہ فلاں فرقہ صراحۃً گمراہ ہے، اس کے بانی کے اقوال میں اتنا تضاد و تناقض پایا جاتا ہے کہ پناہ بخدا! اس کے دعاوی اور تحدی اور پھر بار بار کی شکست سے اس کا دماغی خلل صاف دکھائی دیتا ہے۔ اس کی بنیاد محض موضوع احادیث پر، بلکہ ان کی بارد تاویلوں پر ہے، وہ بھی سیدھی طرح اس پر پوری نہیں اترتیں۔ اور آیات کا تو وہ اس طرح تکا بوٹی کرتے ہیں کہ خدا ہی جانتا ہے۔ ایسے لوگوں کا انجام کیا ہوگا ـــــ لیکن جب ہم اس کے مریدوں کو دیکھتے ہیں تو حیران ہوتے ہیں کہ ان میں اہل علم ہیں، انگریزی دان ہیں، قانون دان ہیں، فلسفہ دان ہیں۔ بڑے بڑے ماہرین علوم و فنون، تجربہ کار اور بال کی کھال ادھیڑنے والے ہیں۔ کیا وہ سب داؤ میں آگئے؟ کیا ان کو اپنے پیر و مرشد کی بے ہودگیاں اور ہرزہ سرائیاں دکھائی نہیں دیتیں؟ ـــــ اسی طرح اور کئی فرقے اور قبروں قوالیوں کے معتقد ہیں جو بڑے چالاک و ہشیار ہیں۔ ان کو اتنی سی بات کیوں معلوم نہیں ہوتی کہ یہ الٹی سیدھی قبروں کی اینٹیں نفع و نقصان کچھ بھی نہیں پہنچا سکتیں۔ ان کے اندر کوئی ولی اللہ قید نہیں ہے ـــــ اور یہ اپنے ہاتھوں سے لکڑی کا بنایا ہوا تعزیہ ایندھن سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتا! اور یہ تاریخ کی سچی جھوٹی کہانیاں دین بننے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ کسی اچھے یا برے آدمی کو گالیاں دینے اور تبرا کہنے کو عبادت سمجھنا نہایت ہی بے ہودہ بات ہے ـــــ کیوں ان داناؤں، وکیلوں بیرسٹروں، ڈاکٹروں، محدثوں، فقیہوں اور مجتہدوں کی سمجھ میں یہ موٹی موٹی باتیں نہیں آتیں؟ ـــــ یہ سوال اکثر میرے سامنے آتے تھے اور کوئی اٹل سا جواب نہیں بن پڑتا تھا۔ آج اس آیت نے تمام مشکلیں حل کر دیں۔ الحمد للہ

زین لھم الشیطان اعمالھم ـ فصدھم عن السبیل ـ وکانوا مستبصرین

"شیطان نے ان کے عملوں کو اچھا کر دکھایا اور اس تدبیر سے ان کو براہ راست اختیار کرنے سے روک دیا۔ اور وہ شامت اعمال سے شیطان کے بہکانے میں آگئے ورنہ یوں تو وہ بڑی سوجھ بوجھ کے لوگ تھے۔"

کچھ معلوم ہے آپ کو یہ کون لوگ تھے؟ یہ کوئی سیدھے سادے دیہاتی یا جنگلی قسم کے لوگ نہیں تھے۔ اپنے زمانے کے متمدن، صناع، تاجر، سیاست دان، حکومت رس اور جانے کیا کیا خوبیاں رکھنے والے انسان تھے۔ اسی آیت شریفہ کے آگے پیچھے ان کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔ وہ قوم شعیبؑ کے چالاک کاروباری آدمی تھے جو بڑے بڑوں کو چکا دے جاتے تھے۔ عاد و ثمود کے عظیم و جسیم انسان تھے جن کی مثل اس وقت شہروں میں نہیں پائی جاتی تھی (لم یخلق مثلها فی البلاد) وہ قارون جیسے دولت مند صاحب علم اور فرعون و ہامان ایسے باعزت و تمکنت لوگ تھے۔ جن کی یادگاریں آج بھی ان کی عظمت کی گواہی دے رہی ہیں (قد تبین لکم من مساکنهم)

اللہ پاک کا ایک ہی لفظ "مستبصرین" ان کی فکری عظمت اور دماغی صلاحیت کے لئے کافی سے بڑھ کر شہادت دے رہا ہے۔

۔ پھر انہیں کون سا سانپ سونگھ گیا کہ وہ باطل کی راہ پر ہوئے اور ان کے استبصار (دانائی۔ بینائی) کو حق کی روشنی نظر نہ آئی۔ اس سوال کا جواب مقدمہ آیت میں موجود ہے۔ "زین لهم الشیطان"۔ یہ شیطان کی نہایت ہی خوب صورت چال تھی۔ اب میں اس "زین" اور مستبصرین کی تشریح کرنے بیٹھوں تو ایک مکمل مقالہ بن جائے۔ اور میں مقالہ نویسی کے لئے اس وقت تیار نہیں۔ اگر آپ کچھ بھی استبصار رکھتے ہیں تو اسی مختصر سے سمجھ سکیں گے کہ بڑے بڑے ذہین و امیر آدمی گانے، قبر اور تعزیہ کی پوجا کیوں کرتے ہیں۔ پاگلوں کو ولی اور مراقیوں کو نبی کیوں مان لیتے ہیں۔

غیبت

ایک عزیز سے خیر خیریت پوچھی۔ باتوں باتوں میں ان کی شادی کا ذکر آ گیا۔ انہوں نے اپنی اہلیہ محترمہ کی سعادت مندی اور اخلاق شرافت کا ذکر کیا اور ساس بہو کے باہمی خوشگوار تعلقات پر دلی اطمینان کا اظہار کیا اور کہا

"شادی کے جلدی ہی بعد میری والدہ گھر کا سب کچھ میری اہلیہ کے سپرد کر کے خود سراپا عبادت بن گئیں۔ کسی نسوانی بدعت، رسم و رواج میں شامل نہیں ہوتیں۔ نماز، قرآن اور ایسے ہی پاکیزہ مشاغل میں معروف رہتی ہیں۔ محلے کی عورتیں آتی ہیں۔ اور کوئی کسی کی غیبت کے لئے زبان کھولنا چاہے تو والدہ انہیں نہایت نرمی سے روک دیتی ہیں اور کہتی ہیں۔ ہم نے جو کچھ پڑھا ہے۔ اس کو ضائع کیوں کریں۔ علم تو عمل کے لئے ہے۔"

عاجز راقم پر اس نیک خاتون کی اس نیک عادت کا بہت اثر ہوا کاش ہمارے گھروں میں صرف اتنی ہی بات آ جائے کہ غیبت کے لئے زبان نہ کھولی جائے تو بے شمار فتنوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

قومی خدمت

میرے ایک محترم نے ایک میٹنگ میں قومی خدمت کے تذکرے میں اپنا ایک واقعہ سنایا ـــــ انہی کی زبانی سنئے

"ادارۃ الاصلاح" کی رکنیت کے زمانے میں میں نے آسٹریلین مسجد کے نمازیوں کے جوتوں کی حفاظت اپنے ذمے لے لی۔ اس کام کی ٹریننگ حاصل کرنے کے لئے میں نے گوردوارے کے محافظ نعلین سکھوں کی شاگردی اختیار کی۔ لکڑی کے خانے بنوائے۔ اور متعلقہ معلومات حاصل کر کے اس کام کو خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ میں اس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ میں اپنی ملازمت کے دوران میں انگریز کی اونچی سے اونچی کرسی پر بیٹھا ہوں لیکن مجھے وہ لذت اور طمانیت حاصل نہیں ہوئی

جو اپنی قوم کی جوتیوں کی حفاظت کرنے میں ملی :

معیشۃ ضنکا ایک عزیز نے سوال کیا کہ قرآن میں کئی جگہ کفار کی دولت مندی کا ذکر ہے کہ جو لوگ صرف دنیا کے طالب ہیں۔ ہم (خدا) ان کو آخرت سے محروم کر دیتے ہیں اور دنیا میں فراوانی دیتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ایک جگہ یہ بھی ارشاد ہے کہ "جو لوگ ہمارے ذکر سے منہ موڑتے ہیں، ان کی معیشت تنگ ہو جاتی ہے" بظاہر اس میں تضاد دکھائی دیتا ہے۔ (ومن اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکا۔ طہٰ رکوع ۔ ولو لا ان یکون الناس امۃ واحدۃ لجعلنا لمن یکفر بالرحمٰن لبیوتہم سقفا من فضۃ ومعارج علیہا یظہرون ... الخ ز ف رکوع ۳)

میں نے عرض کیا ۔۔۔۔ دولت سے تنگی معیشت دور نہیں ہوتی۔ اصل غنا، غنائے نفس ہے جو ہفت اقلیم کی سلطانی سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔ وہ تو صرف تعلق باللہ ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ اس وقت مجھے ایک لاکھ پتی دوست کا تازہ خط یاد آرہا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:

"پرمٹ، تبادلہ، قبضہ، کرایہ کی آمدنی وغیرہ سب معاملات قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے بلائے جان بن گئے ہیں۔ میری تو کمر ٹوٹ گئی ہے۔ ہر وقت موت موت پکارتا ہوں۔ الخ"

اسی طرح ایک اور دوست جو زمینوں اور مکانوں کے مالک، متعدد جوان اور کماؤ بیٹوں کے باپ ہیں۔ مجھے متعدد مرتبہ کہہ چکے ہیں۔

"بھائی! تم بڑے خوش قسمت ہو کہ تمہارا کوئی مکان اور جائداد نہیں۔ میری زندگی ان چیزوں نے بے حد تلخ بنا رکھی ہے۔ میں ایک غریب باپ کا بیٹا ہوں، میں نے بڑی ہی جاں کاہی سے جائداد بنائی اور اب اس کی حفاظت اور رکھ رکھاؤ اور زیادہ جاں کاہی کا موجب ہو رہا ہے۔ میرے اور میرے خدا کے درمیان یہ سب کچھ ایک سنگین دیوار کی طرح ہے۔ اب میری سمجھ میں یہ بات آئی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں عالی شان بلڈنگیں نہ بنوائیں اور کیوں اعلیٰ فرنیچر مہیا نہ کیا حالانکہ وہ سب کچھ کر سکتے تھے۔ اب میں نہ اس کو چھوڑنے پر قادر ہوں، اور نہ اس کے مضرات سے بچنے کی سکت رکھتا ہوں"

۔۔۔۔ یہ دو قریبی نمونے کے طور پر میں نے پیش کئے، جن کو میرے مخاطب عزیز جانتے ہیں۔ اور یہ لوگ دین سے بھی ایک حد تک تعلق رکھتے ہیں ان کا یہ حال ہے، اور جو خالص دنیا پرست ہوں۔ ان کی تو کچھ نہ پوچھو۔ میں نے عمر بھر میں ایک بھی دولت مند مطمئن اور غنی بالنفس نہیں پایا۔ نادان غریب لوگ ان کی ظاہری ٹیپ ٹاپ دیکھ کر ان کو خوش قسمت سمجھ بیٹھے ہیں۔ جیسے قارون کے زمانے کے جہلا نے حسرت کی تھی کہ "کاش ہم بھی قارون ایسے ہوتے" لیکن جب قارون کا انجام انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تو ہوش ٹھکانے آگئے اور خدا کا شکر بجالائے۔ اور اپنی غریبی میں اللہ کا احسان دکھائی دینے لگا ۔۔۔۔ میرے ایک شناسا بہت بڑے سرکاری عہدے پر فائز اور دنیا وی سامان، مال و اولاد وغیرہ کے لحاظ سے کافی خوش نصیب ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد میں بیسیوں مرتبہ ان سے ملا ایک دفعہ بھی ان کی زبان سے کلمہ شکر نہیں سنا۔ حالانکہ دینی ذوق کے آدمی ہیں ۔۔۔۔ اس کے برعکس کئی غریب دیکھے جن کے اندر سچا دینی ذوق اور

اپنی حالت پر اطمینان پایا۔

اولاد کی حسرت مجھے رخ ب صاحب نے ایک دن کہا ـــــ "آپ اولاد ذکور سے محروم ہیں۔ آپ کو اس کا خیال تو آتا ہوگا" اس سے ان کی مراد تھی کہ مجھے یہ محرومی دکھ بن کر ستاتی ہوگی۔ میں نے کہا ـــــ "شروع شروع میں تھوڑا تھوڑا اثر ہوتا تھا۔ لیکن جیسے جیسے دنیا کا تجربہ اور قرآن کی تاثیر دل پر بڑھتی گئی۔ اب میں بفضلہ تعالیٰ اس بارے میں بالکل مطمئن ہوں بلکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت و رحمت ہی سمجھتا ہوں۔ میرے سامنے کئی دوست اور رشتہ دار بیٹوں کے باپ ہیں۔ جن کی زندگیاں ان بیٹوں نے اجیرن کر رکھی ہیں۔ ہمارے شہر کے ایک مشہور سیٹھ کو بیٹے نے جائداد کی خاطر ڈاکٹر سے مل کر زہر دلوا دیا تھا۔ ایک رشتے کے بھائی کا ذکر بھی میں نے سنایا، جس کی موت کی بظاہر وجہ بیٹوں کی ناخلفی ہوئی۔ ایسے ایسے کئی واقعات سلاطین کے تاریخی حالات اور عوامی دنیا میں مشاہدے میں آتے رہتے ہیں۔ اور پھر یہ آیت تو مجھے بالکل ہی مطمئن کر دیتی ہے

"یھب لمن یشاء اناثا و یھب لمن یشاء الذکور او یزوجھم ذکرانا و اناثا و یجعل من یشاء عقیما انہ علیم قدیر"

(سورہ شوریٰ) ـــــ "اللہ تعالیٰ جسے چاہیں بیٹیاں دیں، جسے چاہیں بیٹے دیں یا بیٹے بیٹیاں ملا کر دیں اور جسے چاہیں بے اولاد رکھیں وہ (اللہ تو) بڑے علم و قدرت والے ہیں"

اس کے بعد کسی کو اعتراض کی کیا گنجائش ہے۔

اس موقع پر مجھے میاں مولا بخشؒ امرت سری کا ایک لطیفہ یاد آگیا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ "عمر تریسٹھ سال تک اچھی اور اولاد لڑکیاں بہتر۔ اگر اس سے زیادہ عمر اور اولاد ذکور کوئی بڑی اہم نعمت ہوتے تو اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبرؐ کو ان سے خالی نہ رکھتے"

میاں صاحب کی عمر ۸۰ سال سے متجاوز ہو چکی تھی اور اپنے بعض بیٹوں سے ناخوش رہتے تھے۔ غالباً اسی تجربے نے یہ نکتہ سمجھایا تھا۔ اور خواجہ احمد الدینؒ آیہ "لیس الذکر کالانثیٰ" سے اسی قسم کا استدلال فرمایا کرتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

شعری بدہضمی معاف فرمائیے۔ دینیات کے بعد اب میرے لئے دنیا میں دو ہی لذتیں باقی رہ گئی ہیں۔

۱ـــ بہت میٹھی چائے ـــــ ۲۔ غیر مولویانہ قسم کے شعر

جب شعر اور چائے کا لطف حاصل کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاؤں گا تو سمجھ لیجئے کہ دنیا سے میرا دانہ پانی اٹھ گیا۔ چنانچہ اسی مقصد کے لئے اتوار کی رات ہم تین چار شخص "پاسبان عقل" سے الگ ہو کر

"لیکن کبھی کبھی اسے دل کو تنہا بھی چھوڑ دے"

کے معتقد اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اور گھنٹوں بے تکلف صحبت رہتی ہے۔ ہزاروں نہیں تو سینکڑوں تک تو تازہ اور باسی شعروں کی تعداد پہنچ ہی جاتی ہوگی۔ ہمارے ایک شاعر تو ایسے ہیں کہ بخار چڑھا ہوا ہو، کوئی قدردان شعر مل جائے تو خدا کے فضل سے

جیسے جیسے شعر سناتے جائیں گے، بخار ہلکا ہوتا جائے گا۔ گزشتہ رات ایسی مجلس تھی، لیکن بدقسمتی سے شروع ہی مجھے نیند کی جمائیاں ستانے لگیں۔ کوئی دو ڈیڑھ گھنٹہ تک اضافتاً شعر سننا پڑے۔ لیکن اس اضافتاً سننے مجھے رات بھر درد سر میں مبتلا رکھا۔ حالاں کہ گزشتہ صحبتوں کی نسبت بہت کم شعر سُنے۔ پھر بھی ہضم نہ ہو سکے۔ صبح کو بھی درد سر لئے ہوئے سائیکل پر شہر سے چھاؤنی کی طرف آرہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ ہماری قوم میں کیسے کیسے "ذہین وفطین" لوگ موجود ہیں۔

انڈے کی قوت

ایسے بزرگ اب بھی موجود ہیں جو یقین رکھتے ہیں کہ اگر ریلوے لائن پر مرغی کا انڈا رکھ دیا جائے تو انجن الٹ جائے گا اور ساتھ ہی تمام ڈبے الٹ جائیں گے۔ کبھی کبھی ان کے دل میں یہ امنگ بھی پیدا ہوتی ہے کہ انڈا لائن پر رکھ کر ایک طرف چھپ جائیں، پھر ریل کے الٹنے کا تماشا دیکھیں۔ ہزاروں جانوں کی موت اور لاکھوں روپیہ کا نقصان اس تماشے کے سامنے ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

داستان امیر حمزہ

مجھے خیال آیا کہ پنجابی کا مشہور شاعر کرم امرت سری جو اپنی عمر سّو سال کے قریب بتاتا ہے اور اب بھی کبھی کبھی لاہور کے نلکوں والے تالاب اور شاہی محلے کے علاقے میں آہستہ آہستہ چلتا پھرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ ہم عنفوان شباب میں تکیہ شاکر شاہ امرت سر میں روزانہ جمع ہوتے۔ اور ایک سائیں صاحب (نام مجھے بھول گیا) باقاعدہ داستان امیر حمزہ جزدان سے نکال کر رحل پر رکھ کر سنایا کرتے اور سامعین بانکین باقاعدگی سے حاضر ہوتے اور پوری توجہ سے سنتے۔ پھر جب مہینوں کے بعد کتاب ختم ہوجاتی تو باقاعدہ اس کا ختم کیا جاتا، شیرینی تقسیم کی جاتی۔ اگلے دن از سرِ نو "تلاوت" شروع ہوجاتی۔

میں نے کہنہ سال شاعر سے پوچھا

"کیا سامعین اس قصے کو سچ سمجھتے تھے؟"

اس نے کہا ـــــ "ہاں ہاں! میرے سوا سب سچ یقین کرتے تھے"

مجھے اس "میرے سوا" میں کچھ شاعرانہ مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔

خیر ہوگا ـــــ میں سائیکل پر سوار چھاؤنی کا سفر کر رہا ہوں۔ اور میرا درد زدہ سر اپنے طویل سفر میں مصروف ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس سیرِ تخیل میں درد ہلکا ہو رہا ہے۔ اس میں کچھ دخل راہ میں ایک مہربان کی نشاط انگیز چائے کا بھی ہے۔ جنھوں نے میری قلتِ وقت اور متکررانکار کے باوجود مجھے مرصع و مسجع چائے پینے پر مجبور کر دیا۔ اللہ تعالٰی ایسے لوگوں کی دنیا و آخرت ہری رکھے جو کسی کے انکار و فرصت کی پروا کئے بغیر چائے پلا کر ہی چھوڑتے ہیں۔

ہاں تو میری تخیلی سیر میں آپ بھی میرے ہمراہ ہو جائیے۔ مجھے خیال آیا ـــــ میری قوم میں کروڑوں مرد اور عورتیں ایسے موجود ہیں

جو طوطا کہانی، قصہ چہار درویش، قصہ حاتم طائی، طلسم ہوش ربا، فانوس خیال وغیرہ کی قسم کی کتابوں کو بالکل سچ سمجھے ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں جو چیز تحریر میں آگئی بس وہ بالکل صحیح ہے۔ اور داستان امیر حمزہ کو تو وہ اپنی خاص مذہبی قسم کی چیز سمجھتے ہیں۔ جس میں تاریخ اور تقدس دونوں ہی بدرجہ اتم بھرے ہوتے ہیں ــــــ پھر اگر ان جنتیوں کے سامنے منبر پر کھڑے ہو کر کوئی صاحب ریش دراز، دیودیری، تحت الثریٰ اور فوق السماء کی کوئی بات سنا دے اور ساتھ ہی اس کے پہلے "قال رسول اللہ" بھی کہہ دے تو کون شامت کا مارا اس میں شک لاکر دوزخ میں چھلانگ لگا سکتا ہے۔

وہ بزرگ جو داستان امیر حمزہ کو "اسلام" سمجھتے ہیں۔ وہ "قال رسول اللہ" والی بات کو اسلام سے بھی اوپر سمجھتے ہوں گے۔ یہ لوگ سب کے سب نادان نہیں ہوتے۔ ان میں بڑے بڑے کایاں[1] قسم کے آدمی بھی ہوتے ہیں، صنعت، تجارت، حرفت، تصوف، فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ علوم و فنون سے واقف ہوتے ہیں۔ بفتوائے قرآن "کانو مستبصرین" میں شمار ہوتے ہیں۔ لیکن اس "آبائی میراث" کو چھوڑنے کی ہمت نہیں رکھتے۔

سچ فرمایا ہے: "وجدنا[2] علیہ آباءنا"

مشکلاتِ تبلیغ اب میں سوچ رہا ہوں کہ جو لوگ قوم کو خالص قرآنی اسلام کے رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں۔ ان کے سامنے کتنا بڑا اور کیسا مشکل کام ہے۔ جو بزرگ طوطا کہانی کو موضوع ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ان کو حدیث و فقہ کے اصل مقام سے متعارف کرانے کے لئے کتنی مدت، کتنا صبر اور کتنی سعی درکار ہے۔ جن کو سنگ و خشت کی عبادت میں مزا ملتا ہے اور مرادیں بھی حاصل ہوتی ہیں۔ اور اس کے لئے وہ طویل سفر اور کثیر خرچ بھی برداشت کرتے ہیں وہ آپ کے نظر نہ آنے والے خدا سے کس طرح مطمئن ہوں گے

خون کھول اٹھا میں ایک مقامی بنک میں پہلی دفعہ گیا، ایک ملازم کے نام تعارفی رقعہ میرے پاس تھا۔ ان صاحب کو ملا۔ اور ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ انہوں نے مجھ سے مشغلہ وغیرہ پوچھا۔

میں نے کہا ــــ "تبلیغ"

انہوں نے کہا ــــ "کچھ اثر بھی ہوتا ہے یا نہیں؟"

میں نے کہا ــــ "بہت کم ــــ عام حالات یہ ہیں کہ میں برسوں سے کہہ رہا ہوں" اکیلے خدا کو پکارو، اسی سے مانگو، اسی کے سامنے جھکو۔ لیکن جب اس قسم کا وعظ کہہ کر منبر سے اترتا ہوں تو بسا اوقات کان میں آواز آتی ہے: "یا رسول اللہ ــــ مولا علی مدد"

بس میرے منہ سے یہ بات نکلی ہی تھی کہ سامنے کرسی پر بیٹھے ہوئے ایک نوجوان کلرک غضب آلود لہجے میں فرمانے لگے۔

"یا رسول اللہ کہنے میں کیا حرج ہے؟"

---

[1] بڑے ہشیار اور چالاک　　[2] باپ دادا سے ہی مانتے چلے آتے ہیں

میں نے عرض کیا ــــــ "جب آپ سکون و اطمینان سے پوچھیں گے، تب بتاؤں گا"

دوسرے صاحب جو مجھ سے باتیں کر رہے تھے۔ آن سے مخاطب ہو کر نرمی سے سمجھانے لگے ــــــ انہوں نے کہا

"بس بس! میرا خون کھول رہا ہے"

ہم دونوں نے خاموشی اختیار کی ــــــ میرے دل میں خیال آیا، یہ شخص ہم کو پیغمبر اور اولیاء کا منکر سمجھتا ہے۔ اور خود ان کا مومن و معتقد بنتا ہے۔ میں اسے کہوں کہ آپ جن کو منوانے کے لئے اس طرح اپنا خون کھولا رہے ہیں۔ وہ تو دشمنوں کو بھی دعائیں دیا کرتے تھے۔ نظام الدین اولیاء دہلویؒ کو ایک دفعہ ایک جوالقی نے سر بزم گالیاں دیں۔ آپ خاموش رہے۔ پھر اس نے کچھ طلب کیا، آپ نے دے کر رخصت کیا۔ حاضرین نے اظہار تعجب کیا تو فرمایا

"بہت سے آدمی ہمارے پاس آتے ہیں اور چیزیں لاتے ہیں۔ ایسے شخص کو بھی آنا چاہیئے جو مجھ کو برا کہے"

میرے ذہن میں بزرگوں کی اس قسم کی مثالیں تو آئیں، لیکن میں کھولتے ہوئے خون کو اس کا اہل نہ پاکر خاموش رہا

فذکر ان نفعت الذکریٰ

جہاں پہلے ہی جی متلا رہا ہو، وہاں مقوی و لذیذ غذا دینا نادانی ہے۔

ذرہ بھر نیکی اور ذرہ بھر بدی

میں ایک مضمون پر نظر ثانی کر رہا تھا۔ خ۔ب صاحب پاس آ بیٹھے۔ باتوں باتوں میں میں نے کہا "میں سوچتا ہوں کہ یہ ہماری مضمون بازی کہیں سنت انبیاء کے خلاف تو نہیں؟"

خ۔ب ــــــ "ہر جگہ تو آدمی پہنچ نہیں سکتا۔ یہ ایک اچھا ذریعہ ہے تبلیغ کا"

میں ــــــ "اگر انبیاء اس زمانے میں ہوتے تو اس سے فائدہ اٹھاتے؟"

خ۔ب ــــــ "ضرور"

میں ــــــ "اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ریڈیو ہوتا تو آپؐ اس کے ذریعے تبلیغ کرتے؟"

خ۔ب ــــــ "بے شک کرتے"

میں ــــــ "میرے خیال میں تحریر کی نسبت تقریر کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔ دیکھئے مولانا الیاسؒ کی تبلیغی جماعت کے رکن تجارتوں اور ملازمتوں میں سے وقت نکال کر کہاں کہاں پہنچتے ہیں"

خ۔ب ــــــ "پرسوں شہر میں ایک خوش پوش آدمی اس جماعت کا رکن ملا۔ آگے بڑھ کر کہنے لگا "السلام علیکم" میں نے وعلیکم السلام کہا۔ اس نے آہستہ سے کہا

"بعض لوگ "سام لیکم" کہتے ہیں صحیح لفظ بولنا چاہیئے" اتنا کہہ کر رخصت ہو گیا"

میں ـــــ " ذرے ذرے کا بدلہ ملنا ضرور ہے ۔ اُس کو اس کا ثواب ضرور ملے گا ـــــ مجھے ایک دفعہ سیر کرتے ہوئے ایک کمہار ملا تھا پاس آکر اس نے کہا ۔ نماز پڑھا کرو ۔ سچ بولا کرو ۔ وغیرہ ذالک ۔ یعنی راہ چلتے ہیں وہ تبلیغ کرتا جاتا تھا ـــــ مشرقی پنجاب میں میں صبح کو نہانے کے لئے باہر کھیتوں میں نکل جاتا ۔ کسانوں کو دیکھتا کہ بیلوں کو ہانک رہے ہیں اور قدم قدم پر گالیاں دیتے جاتے ہیں ـــــ " او تو مرے " ـــــ " او تیرے بیچنے والے کی ایسی تیسی " وغیرہ ذالک ۔ میں قریب ہو کر کہتا " اگر تم گالیوں کی بجائے یوں کہو " او تیرا بھلا ہو " ـــــ " او تیری کمائی میں برکت " تو تم کو ثواب ہوگا ۔ تم مسلمان ہو اور یہ بھی نہیں جانتے کہ دو فرشتے نیکی بدی لکھنے والے ہر ہر بات کو لکھتے ہوں گے ۔ اسی طرح عمر بھر کی گالیاں جب قیامت میں تمہارے سامنے آئیں گی ۔ تو کتنا انبار ہوگا اور یہ ایسا گناہ ہے جس سے فائدہ کچھ نہیں ـــــ اس کی بجائے دعائیہ کلمات کہتے رہو تو کتنا فائدہ ہو اور کیسی نیک عادت بن جائے "

میری اس گذارش کا عموماً اچھا ہی اثر ہوتا ۔ کم از کم اس وقت تو دشنام کا فوارہ بند ہو جاتا ۔

غ ۔ ب ـــــ " میرے پردادا صاحب کا حکم تھا کہ ان کے کھیت میں کوئی شخص بیل کو یا کسی کو بھی گالی نہ دے ۔ صبح کو جب کام کرنے والے آتے تو سب دس دس بار قل شریف پڑھتے پھر کام کو ہاتھ لگاتے ۔ وہ آداب شریعت کی سختی سے پابندی کرتے اور کراتے تھے ۔ اس کا نتیجہ تھا کہ ان کی زندگی برکتوں سے بھری ہوئی تھی "

غ ب صاحب نے اور بھی کئی ایسی باتیں سنائیں ۔ آج کل کے پڑھے ہوئے ملحد اور کٹر جاہل ان نعمتوں سے محروم ہیں ۔ وہ لوگ صرف لفظوں کے پجاری نہیں تھے ۔ ان کے اندر اخلاص و تقویٰ بھی ہوتا تھا جو ان کی ساری زندگی پر حاوی ہوتا تھا ۔ سمجھنے کی بات ہے کہ جو منہ سے لفظ بولنے میں احتیاط کرے گا ۔ وہ ہاتھ پاؤں سے برائی کرتے ہوئے خدا سے کیوں نہ ڈرے گا ۔ پھر کیا ایسے لوگوں کے اجر اللہ تعالیٰ ضائع کر دیں گے " ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین "

(او امکا)

۳۰ مارچ

۳۰ ۔ مارچ اتوار کا ایک دن اللہ کے لئے نکالئے ۔ یہ دن موسم اور مہلت دونوں لحاظ سے مناسب ہے ـــــ آپ کی آمد کی اطلاع کم از کم ۲۲ مارچ تک یعنی یوم مشورت سے آٹھ دن پہلے دار القرآن میں پہنچ جانی چاہئے ۔ آپ اپنے ساتھ عزم تبلیغ اور مفید مشورے لے کر تشریف لائیں ۔

یہ نکتہ نگاہ میں رکھئے کہ امت مسلمہ کی قرآنی تحریک کا مستقبل بہت کچھ اسی دن کے فیصلوں پر منحصر ہے ـــــ ان فیصلوں پر جو آپ کے دل و دماغ سے نکلیں گے ـــــ بستر ہمراہ لائیں ۔

استفسارات

ایک صاحب لکھتے ہیں :-

دعا ماہنامہ البیان لاہور کی ماہ رواں (جنوری) کی اشاعت میں "سرِ بازار" کے زیر عنوان محمد جان صاحب نے اپنی مجلس کا ایک واقعہ بابت "دعا" تحریر فرمایا ہے جس میں مسئلہ زیر بحث "کسی متوفی کے لئے دعا کی جائے تو کارگر ثابت ہو سکتی ہے" پر اختصاراً اپنے عندیہ کا اظہار کیا ہے۔

قبلہ محمد جان صاحب کے جواب سے میری تشفی نہیں ہوئی۔ مجھے اپنی بے بضاعتی علم کا اعتراف ہے۔ اس کے باوجود جہاں تک میں سمجھتا ہوں، متوفی کے لئے دعا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دعا کا تعلق جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے لوگوں سے ہے نہ کہ ان سے جن کے عمل کا سلسلہ منقطع ہو چکا۔ ایک شخص اچھے بُرے عمل کر کے مرجاتا ہے اگر اس کی نیکیاں گناہوں کے مقابلہ میں صفر ہیں۔ اس کے اعزہ اقارب شب و روز اس کی بخشش کی دعائیں مانگتے اور منگواتے ہیں تو گیا دن رات کی دعائیں سن کر (گارنٹی نہ ہوتے ہوئے بھی) خدا اگر چاہے تو اس کے گناہوں کو معاف کر دے گا۔ خدا خدا نہ ہوا (نعوذ باللہ) مذاق ہوا۔ اس کا ضابطہ آئین، آئین نہ ہوا۔ ایک تماشہ ہوا۔ مجھے خدا کی قدرت اور اس کے اختیار سے انکار نہیں۔ مگر وہ ایسا کیوں کرنے لگا۔ اس نے جب انسان کو عقل، شعور اور تمیز خیر و شر عطا کر دی ہے اور ایک واضح قانون اس کے ہاتھ میں دے کر ہدایت کر دی ہے کہ جو اس قانون کی پیروی کرے گا۔ وہ نتیجۃً اعلیٰ ثمرات کا مستحق ہوگا اور جو خلاف ورزی کرے گا وہ دردناک عذاب میں مبتلا ہوگا۔ میں نہیں سمجھ سکتا پھر اس دعا میں مستحسن کا پہلو کیسے نکلتا ہے۔ مگر ہاں ایک مقام پر جب کہ متوفی کے قریبی رشتہ دار اس نقصان پر خدا کے حضور اپنے لئے صبر و استقامت کی دعا کریں۔

جواب ــــــ آپ کے دو فقرے الگ الگ توجہ کے مستحق ہیں۔

"اگر اس (متوفی) کی نیکیاں گناہوں کے مقابلے میں صفر ہیں" الخ ــــــ اس کے بعد آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ حرف بحرف صحیح ہے۔ واقعی فرعون کا جنازہ سامنے رکھ کر تمام دنیا کے صلحاء و ابرار اس کے حق میں دعائے مغفرت کریں تو اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا، بلکہ خطرہ ہے کہ خود زیر عتاب نہ آ جائیں ــــــ اور ضلالت کی اس حالت کو پہنچے ہوتے زندہ انسان بھی مُردہ کے حکم میں آ جاتے ہیں

قرآن نے "ما یستوی الاحیاء ولا الاموات" کہہ کر ایسے ہی مردے مراد لئے ہیں۔ پسر نوح اور قوم لوط اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ نوح و ابراہیم ایسے جلیل القدر پیغمبر کوشش کے باوجود ان کے گناہ نہ بخشوا سکے ـــــ آپ کا دوسرا فقرہ یہ ہے۔

"دعا کا تعلق جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے لوگوں سے ہے" ـــــ اس سے اختلاف کی گنجائش ہے۔ اوپر آپ دیکھ چکے ہیں کہ بعض جیتے جاگتے بھی فقدان استعداد کے سبب کسی کی دعا سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے، اس لئے کہ وہ جسماً زندہ ہیں اور روحاً یا دیناً مردہ ہیں۔ اسی طرح بعض لوگ مردہ ہو کر بھی زندہ رہتے ہیں۔ اگرچہ وہ زندگی ہمارے شعور سے بالاتر ہے۔ ان کو دعا سے فائدہ پہنچ سکتا ہے اور وہ لوگ جسماً مردہ لیکن روحاً یا دیناً زندہ بلکہ زندہ تر ہیں ـــــ ابراہیم علیہ السلام باپ کے حق میں مغفرت مانگنے سے اسی وجہ سے ٹل گئے تھے کہ وہ ہر لحاظ سے مر چکا تھا۔ پیغمبر قرآن صلعم کو منافقین کے لئے مغفرت طلبی سے سخت تاکید کے ساتھ روکا ہے۔ اس لئے کہ وہ بھی صحیح معنی میں مردہ تھے۔ اس کے برعکس نوح علیہ السلام اپنے والدین کے حق میں دعائے مغفرت مانگتے ہیں اور قرآن مجید سے ان کے والدین کی زندگی (خاص طور پر) اس دعا کے وقت ثابت نہیں ہوتی۔ یہ دعا طوفان کے بعد کی گئی ہے۔ "رب اغفر لی ولوالدی الخ" (سورہ نوح)۔ ایک اور دعا سنئے۔ "ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان" (سورہ حشر) "اے ہمارے رب ہمیں بخش اور ہمارے بھائیوں کو بخش جو ہم سے پہلے ایمان لائے"۔ اس میں عاجز راقم کے خیال میں زندہ و مردہ کی قید نہیں ہے بلکہ دونوں کو حاوی ہے اور سورہ توبہ کی یہ آیت تو میرے نزدیک نص ہے۔

"لا تصل علی احد منہم مات ابدا ولا تقم علی قبرہ" ـــــ "منافقوں میں سے کوئی مر جائے تو اس پر ہرگز نماز نہ پڑھ اور اس کی قبر پر قیام نہ کر" ـــــ یہ نماز اور قیام مردہ منافقوں کے حق میں ممنوع ہوا تو وہ مردہ مومنوں کے لئے جائز ٹھہرا۔ اور جب جائز ٹھہرا تو خدا کا جائز ٹھہرایا ہوا فعل لازماً مفید بھی ہونا چاہئیے۔ کیونکہ ادھر سے لغو کی اجازت تو ملتی ہی نہیں۔ ایک اور طریق سے سمجھئے۔ اناج کا دانہ جس کے اندر صلاحیت موجود ہے۔ زمین کے اوپر ہے تو غذائیت بخشتا ہے، زیر زمین دفن ہے تو پانی اور مٹی سے اثر قبول کر کے زندہ تر ہو جاتا ہے۔ اور اگر کسی وجہ سے اس کی صلاحیت ختم ہو چکی ہے تو نہ وہ غذا کے کام کا نہ دفن ہونے کے بعد نشو پذیر ہو سکتا ہے۔ یہی فرق مومن اور کافر میں ہے۔ مومن مرتا نہیں بلکہ حیات طیبہ پاتا ہے اور کافر موت و حیات کے درمیان لٹکتا رہتا ہے۔ "لا یموت فیہا ولا یحییٰ" ـــــ قرآن نے ہم کو "سلام علی المرسلین" اور "ترکنا علیہ فی الآخرین" کہہ کر انبیا کے حق میں دعا کی تعلیم دی ہے جو بے نتیجہ نہیں ہو سکتی۔ اور اگر آپ عقلی دلیل مانگیں تو زندوں کے ساتھ دعا مغفرت کا کون سا عقلی تعلق ہے۔ آپ کے خیال میں اگر ہے تو وہی تعلق وہاں بھی سمجھئے۔ جبکہ بحکم قرآن وہاں حقیقی زندگی حاصل ہوتی ہے۔ "ان دار الآخرۃ لہی الحیوان" ـــــ آخرت کا گھر ہی تو حقیقی زندگی ہے (عنکبوت رکوع ۷) آپ کے استفسار میں بعض باتیں تنقید طلب ہیں جن کو ہم نے بخوف طوالت چھوڑ دیا ہے۔

عصمت انبیاء | ایک صاحب لاہور ٹمپل روڈ سے لکھتے ہیں (حاشیے کی صورت میں ساتھ ہی ساتھ جواب عرض ہے)

"البیان بابت ماہ فروری ۱۹۵۲ء میں استفسارات کے تحت عصمت انبیاء کے متعلق ادارہ البیان نے لکھا ہے کہ بحیثیت رسالت انبیاء معصوم ہیں لیکن بحیثیت بشریت معصوم نہیں۔ اور لفظ امین پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امین وہ ہے جو خیانت کا مرتکب نہیں ہوتا۔ اس لئے تمام انبیاء و رسل پیغام الٰہی بے کم و کاست لوگوں تک پہنچاتے رہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بلفظہٖ پہنچاتے رہے۔ اگر ایسا نہ کرتے تو غلطی کا امکان ہے۔ اور اس لئے انبیاء معصوم عن الخطا نہ ہوتے۔ مگر یہ تو کوئی بڑی بات[1] نہیں۔ ایک چٹھی رساں بھی اس معنی میں امین ہی ہوتا ہے۔ قرآن میں واشگاف الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے کہ "تجھ سے پہلے نہ کوئی رسول اور نہ نبی ایسا گزرا ہے کہ اس نے تمنا کی ہو اور شیطان نے اس کی تمنا میں القا نہ کیا ہو" مفہوم بالکل واضح[2] ہے۔ اور آیات میں نبی اور رسول ہی کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس لئے یہ کس طرح دعویٰ[3] کیا جا سکتا ہے کہ تمام نبی اور رسول جو بھی آں حضرتؐ سے بیشتر گذرے معصوم تھے۔ امید ہے کہ محترم مدیر کچھ اس کی بھی توجیہہ[4] بحوالہ آیات قرآن فرمائیں گے۔ البتہ قرآن سے انہی آیات میں بتایا گیا ہے کہ ایسا القاء شیطانی جو انبیاء

جوابات: — [1] اس خواہ مخواہ کی بڑی بات کے شوق نے قرآنی آیات کی تفسیر کو پر شکوہ اور "بڑی بات" بنانے کے لئے وہ وہ طوفان کھڑے کئے کہ الامان والحفیظ۔ میں پوچھتا ہوں "بشر مثلکم" کہنا کون سی "بڑی بات" ہے۔ پھر یہ کیوں کہا — مچھر اور مکھی کی مثال دینا کہاں کی بڑی بات ہے، پھر یہ مثالیں کیوں دیں؟ ہواؤں، بارشوں، پہاڑوں، سمندروں اور عام کھانے پینے کی چیزوں میں غور و فکر کرنے کی دعوت کیوں دی، یہ کون سی بڑی باتیں ہیں۔ اس "بڑی بات" کے خبط نے قرآن، پیغمبر اور اسلام سبھی ہماری فکر و عمل کی دنیا سے اٹھا کر ایسے اسرار و رموز کے عالم میں پہنچا دیا کہ بس وہاں کے فروغ تجلی سے حضرت جبریل کے بھی پر جلتے ہیں۔ اگر یہ دعوت کوئی ایسی ہی بڑی بات "تھی تو ہم چھوٹے لوگوں میں کیوں بھیجی گئی۔ تمام تصوف، باطنیات اور توہمات کے سرچشمے اسی "بڑی بات" سے پھوٹے ہیں جو سمٹنے ہی میں نہیں آتی — پیغمبر چٹھی رساں کی مانند کیسے بن گیا۔ جب کہ وہ براہ راست خدا کا مخاطب ہے اور پیام الٰہی پر سب سے پہلے خود بھی عمل کرنے کا ایسا ہی مکلف ہے جیسے اس کے مخاطبین۔ کیا خدا کا قاصد اور بندوں کا قاصد یکساں ہوتے ہیں؛ جب کہ شاہی قاصد اور عوامی قاصد میں بھی عظیم فرق ہوتا ہے۔

[2] اس "واضح" کے سمجھنے میں ائمہ تفسیر نے وہ چکر کاٹے ہیں کہ ان سب کو جمع کر دیا جائے تو ایک مستقل تصنیف بن جائے۔ اور اس کے پڑھنے والے کو پھر بھی سمجھ میں نہ آئے کہ آیت کیا کہنا چاہتی ہے۔

[3] یہ دعوے کس نے کیا ہے؟

[4] آپ نے اس سے آگے جو توجیہہ خود بیان فرمادی ہے، مختصراً وہی ٹھیک ہے۔ اس کی ذرا سی تفصیل یوں ہو سکتی ہے۔ جذبات و خواہشات سے کوئی بشر خالی نہیں اور نہ ہونا چاہئیے۔ البتہ خالص جذبات و خواہشات میں دخل شیطانی ضرور ہو جاتا ہے۔ رسل و انبیاء وحی کی تبلیغ کرتے تھے اور عقل و حکمت سے بھی کام لیتے تھے اور ہر رسول و نبی کے دل میں قوم کو خوش کرنے کی خواہش بھی

رسل سابقہ کو ہوا وہ بذریعہ محکمات قرآن قرآن میں محو کیا گیا ہے۔ اور یہ کہ قرآن ہی صرف ایک ایسی کتاب ہے جس میں القائے شیطانی کا دخل نہیں اور نہ باطل کا۔ اور یہ کہ جو بھی آیات آنحضرت پر وحیاً نازل ہوئیں اس میں کذب کی آمیزش آں حضرت کی طرف سے نہیں ہوئی اور مازاغ البصر وما طغیٰ[ش] ۔ توراۃ وانجیل اور صحف انبیاء میں بھی اسرائیل کو خدا کے بیٹے بلکہ اکلوتے کہا گیا ہے۔ انجیل میں مسیح ایک کنعانی عورت کو مخاطب کرتے ہوئے غیر بنی اسرائیل کو کُتے اور بنی اسرائیل کو بیٹے کہتے ہیں۔ قرآن اس القائے شیطانی کو محو فرماتا ہے کہ یہ نہ بیٹے ہیں اور نہ پیارے بلکہ ایسی ہی مخلوق ہیں جیسے اور۔ ایسی مثالیں اور بھی ہیں۔ مگر ایک ہی اس دعوے کے خلاف کافی ہے کہ انبیاء بحیثیت رسول معصوم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کتب سابقہ میں سے ایک بھی محفوظ کلام نہیں۔ اور قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ[ٹ] لیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے محترم مدیر نے وحی اور مہبط وحی کو ایک ہی تصور کیا ہے۔ بلاشبہ وحی میں غلطی نہیں۔ لیکن قلب انسانی جس پر وحی وارد ہوتی ہے اور شے ہے۔ وہ اس میں تمنائی میزش کر سکتا ہے اور کرتا رہا[ث] ۔ اگر محترم مدیر اس موضوع پر مزید بحث کریں گے تو ممکن ہے کہ میرے شبہات کا بھی ازالہ ہو جائے۔ امید ہے کہ محترم مدیر اس امر پر بھی بحث کریں گے کہ جب کسی نبی

پیدا ہوتی تھی اور قانون الٰہی کے مطابق خواہش ذہن شیطانی سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ ایسی خواہشات سے پیدا شدہ کئی ایک رسمیں رسل و انبیاء کے نام پر جاری تھیں (بائیبل پڑھ کر دیکھئے) اہل علم کلام الٰہی کے مقابلے میں ایسی لغو رسموں کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ لیکن انسان پرست مقلد، بادہ ہات غافل اور سخت دل کے لوگ (فی قلوبہم مرض والقاسیۃ قلوبہم۔ یہ اگلی آیت کے لفظ ہیں) جو اللہ کی اطاعت کی قدر نہیں کرتے اور دوسروں کے مقامی یا ہنگامی ایسے رسم ورواج کی وجہ سے فتنے میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور وحی کے مطابق اصلاح کرنے والوں کو کہتے ہیں کہ انہوں نے نبیوں کے حکموں کو توڑ دیا (مسیح پر علماء یہود یہی فتویٰ لگاتے تھے) حالانکہ ایسے لوگ خود بندوں کی سندوں سے آیات الٰہی کو منسوخ کرتے ہیں۔ یہ آیت سورہ حج میں آئی ہے۔ اس کی مقامی مصلحت یہ بھی ہے کہ حج اور کئی دوسرے تعامل ایسی لایعنی رسموں کا مجموعہ بن چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ابدی دستور العمل قرآن مجید میں ایسے شیطانی القاء ہمیشہ کے لئے منسوخ کر دئے اور اپنی آیات کو محکم بنا دیا (فینسخ اللہ ما یلقی الشیطان ثم یحکم اللہ آیاتہ ۔ حج ۵۲)

[ش] اس آیت کا زیر بحث مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اس میں علماء ظاہر و باطن عموماً کسی مبین نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔

[ٹ] ہاں آپ ٹھیک فرماتے ہیں جزاکم اللہ احسن الجزاء۔

[ث] اس کا مطلب میں نہیں سمجھا۔

[ج] ہاں ٹھیک ہے۔ اگر قلب کے غلطی میں پڑنے کا امکان نہ ہوتا تو وحی لے وقت پہرے کیوں لگائے جاتے (یسلک من بین یدیہ ومن خلفہ رصدا ... الخ) اگر الٰہی پہروں کے باوجود نفس وحی یا متن وحی میں میاں شیطان آگھستے ہیں تو پہروں کی یا پہرے لگانے والے کی کمزوری ماننی پڑے گی (معاذ اللہ)

یا رسول پر وحی نازل ہوتی ہے تو کیا وہ اس حالت میں بشریت سے علیحدہ کچھ اور ہو جاتا یا بشر رہتا ہوا معصوم ہوتا[۹]۔ آنحضرت صلعم کے بارے میں محترم مدیر نے جن آیات کا حوالہ دیا ہے وہ اس پیشگوئی کی طرف اشارہ ہے کہ مثیلِ موسیٰ جو کچھ اللہ کے نام سے کہے گا پورا ہو کر رہے گا اور یہ کہ اگر کوئی شخص خواہ نبی ہی کیوں نہ ہو یہ دعوے کرے کہ وہ مثیلِ موسیٰ ہے اور نہ ہو تو مارا جائے گا۔ یہ طویل بحث[۱۰] ہے اس میں سر دست جانے کی ضرورت نہیں۔ بحث طلب صرف عصمتِ انبیاء ہے۔

۹ے بشر ہر حالت میں بشر ہی رہتا ہے، اس کے اندر خون گردش کرتا رہتا ہے۔ آگ اس کو جلا سکتی ہے۔ سوئی چبھ سکتی ہے، چوٹ لگ سکتی ہے۔ لیکن وحی کے وقت تبتّل نام کی کیفیت غیر اختیاری طور پر تصرفِ الٰہی پیدا کی جاتی ہے ——— اس کی ادنےٰ مثالیں، شعر، فلسفہ، موسیقی، عشقِ مجازی وغیرہ کے استغراق وانہماک سے مل سکتی ہے۔ فکرِ شعر یا غلبہ خیالِ معشوق کے وقت شاعر یا عاشق کے پاس کوئی شخص بات کر رہا ہو تو اُسے کچھ علم نہیں ہوتا۔ نیوٹن کے پاس سے اس کا دوست بیٹھ کر اس کی روٹی چٹ کر کے واپس بھی چلا گیا۔ اور اس کو کوئی علم نہ ہؤا، برتن خالی دیکھ کر اس نے کہا "او ہو میں روٹی کھا چکا ہوں اور مجھے یاد نہیں رہا"۔ یہاں تک کہ دوسرے دن اس کے دوست نے اس کو اصل واقعہ کی اطلاع دی ——— استغراقِ وحی کے مقابلے میں یہ نہایت ادنیٰ قسم کے استغراقات ہیں۔

۱۰ے میں آپ کا شکر گذار ہوں کہ آپ اس طویل بحث میں جانے کی سر دست ضرورت نہیں سمجھتے۔ اور میں ہمیشہ ہی اس سے بچنا چاہتا ہوں۔ مجھے کوئی وثوق نہیں کہ میرے معروضات سے آپ کی تسلی ہوئی ہو۔ لیکن میں معذور ہوں میرے علم واطلاع کی رسائی یہیں تک ہے۔ اس سے زیادہ نہ میں کچھ عرض کر سکتا ہوں اور نہ مزید زحمت دہی اور زحمت برداری کی جرأت رکھتا ہوں۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔ (مدیر)

قمر امرتسری

بچوں کے لئے

کل شام دوکان سے فارغ ہوکر گھر پہنچا تو ننی شائستہ کونے میں بیٹھی بسور رہی تھی۔ میں نے بسورنے کا سبب پوچھا تو کھل کر رونے لگی اور روتی ہی چلی گئی ــــ میں نے دوسرے کمرے سے افتخار اور پروین کو آواز دے کر بلایا اور پوچھا کہ شائستہ کو کیا ہوا ہے۔ اسے کس نے مارا ہے کہ یوں پڑی رو رہی ہے۔ افتخار نے جواب دیا: ماموں جان مارا تو کسی نے نہیں، بات یہ ہے کہ جو دبلی سی کالی بلی ہمارے ہاں آتی ہے نا ــــ وہ شائستہ کا سفید چوزہ پکڑ کرلے گئی ہے۔ اسے بہت سمجھایا ہے کہ تمہیں اور چوزہ لا دیں گے۔ امی نے پیسے بھی دئے میں مگر یہ روتے ہی جارہی ہے۔

یہ سُن کر میں نے شائستہ کو پاس بٹھالیا۔ پیار دلاسا دے کر چپ کرایا اور وعدہ کیا کہ چوزے کے بدلے میں تمہیں بڑی سی مرغی لا دوں گا وہ انڈے بھی دے گی اور تم مزے سے کھانا۔ یہ باتیں سُن کر جب شائستہ ذرا بہلی۔ تو کہنے لگی ماموں جان یہ کالی بلی بہت خراب ہے۔ اس سے سب مرغے مرغیاں اور بطخیں بہت ڈرتی ہیں۔ ہماری بلی اس سے بہت بڑی اور خوب موٹی تازی ہے۔ مگر کیا مجال کسی کو کچھ کہے بلکہ مرغیاں اور بطخیں اسے مارنے دوڑتی ہیں تو وہ بھاگ جاتی ہے مگر یہ دبلی سی کالی بلی پتہ نہیں کیا بلا ہے کہ جب صحن میں آتی ہے تو سب مرغیاں اور بطخیں شور مچانے لگتی ہیں اور اس کے سامنے سے بھاگ کر چھپ جاتی ہیں۔ پھر بھی جب اس کا داؤ چلے۔ ایک آدھ چوزا اٹھائے جاتی ہے۔ کم بخت نے اسی طرح پڑوس والوں کے سب چوزے چٹ کرلئے۔ کتنی ظالم بلی ہے۔ ہماری بھی تو بلی ہے کیسی خوب صورت اور کتنی بھلی مانس ہے۔

میں شائستہ کی یہ باتیں سن کر افتخار کی طرف مخاطب ہوا ــــ سنتے ہو افتخار شائستہ کیا کہہ رہی ہے "ہماری بلی بہت اچھی ہے اسے مرغے مرغیاں مارنے دوڑتی ہیں تو وہ بھاگ جاتی ہے" کیا خیال ہے تمہارا؟ ــــ ہاں ماموں جان یہ بلی بہت شریف ہے۔ وہ تو گھر کے چوہوں کو بھی کچھ نہیں کہتی۔

میں ـــــ دیکھو افتخار شائستہ چھوٹی ہے۔ وہ اس کو نہیں سمجھ سکتی تم اور پروین میری بات غور سے سنو۔ تم اپنی بلی کی تعریف کر رہے ہو تمہارے نزدیک وہ بہت شریف اور اچھی بلی ہے۔ مگر بلیوں کی برادری میں اس کی کوئی عزت نہیں۔ وہ تمہارے گھر میں رہ کر بلی نہیں رہی پالتو مرغی بن گئی ہے بلکہ اس سے بھی بدتر ـــــ بلی کے لئے بلی کی حیثیت سے یہ لازمی ہے کہ اس میں "بلی پن" موجود ہو۔ چوہے مرغیاں اور بطخیں اس کی شکل دیکھ کر ڈریں نہ کہ وہ الٹا ان سے بھاگے۔ تمہاری بلی مفت کی روٹیاں کھا کر اور دودھ پی پی کر موٹی اور سست ہو گئی ہے اس کی ہمت پست ہو چکی ہے۔ اس کی دہشت جاتی رہی ہے۔ اسی طرح جو انسان عیش و آرام میں پڑ کر سست ہو جاتا ہے۔ اس کی کوئی عزت نہیں رہتی۔ اس کی تمام قابلیتیں جو اس کے اندر موجود ہوتی ہیں، دب جاتی ہیں۔ اور خواہ وہ کتنے ہی بڑے خاندان کا کیوں نہ ہو آخر کار ذلیل ہو جاتا ہے۔ اور اپنی کم ہمتی اور سستی سے بڑوں کا نام بھی ڈبو دیتا ہے۔ جن لوگوں کو وہ کل چھوٹے سمجھتا تھا وہ اپنی ہمت و محنت اور کوشش سے آگے نکل گئے ہیں۔ لوگ ان کی عزت کرتے ہیں اور اس کے پاس سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ان کے بزرگوں کا مقابلہ اپنے بزرگوں سے کر کے اپنے کو بڑا ثابت کرے۔ انسان کی بڑائی کا دارومدار اس کی اپنی قابلیت ہمت اور محنت پر ہے۔ اس کی عزت اسی طرح قائم رہ سکتی ہے کہ وہ اپنی عزت بڑھانے کے لئے کوشش کرتا رہے۔

اگر وہ اچھے سے اچھا کھا کر اور اچھے سے اچھا پہن کر بے کار بیٹھا رہا۔ تو ایک دن تمہاری شریف بلی کی طرح اسے اپنے سے کم درجے کے لوگوں سے آنکھ چرانا پڑے گی۔ یہ تو ایک شخص کا حال ہے۔ جب یہ سستی اور آرام پسندی کا مرض کسی قوم کو لگ جائے تو وہ قوم بہت جلد دنیا کی دوسری قوموں میں ذلیل و خوار ہو کے رہ جاتی ہے۔ مسلمانوں میں جب تک دبلی کالی بلی کا جذبہ موجود تھا۔ انہوں نے تھوڑی سی تعداد میں جدھر منہ کیا۔ دنیا کی قومیں ان کے سامنے سے مرغیوں اور بطخوں کی طرح بھاگ نکلیں اور جب وہ دنیا کے بڑے بڑے ملکوں کے حاکم ہوتے تو عیش و آرام میں پڑ کر موٹے ہو گئے۔ پھر کیا تھا وہی قومیں جو ابھی ان سے آنکھ ملانے کی جرأت نہ رکھتی تھیں۔ ان پر لپکیں اور وہ ان سے اس طرح بھاگنے لگے جس طرح تمہاری خوب صورت موٹی بلی مرغیوں اور بطخوں سے بھاگتی ہے۔ دنیا میں عزت کے ساتھ رہنے کے لئے بلی کا بلی ہونا ضروری ہے ورنہ بجائے اس کے کہ وہ مرغیوں کو مارے مرغیاں اسے مارنے لگیں گی۔ ہماری کم ہمتی اور کاہلی نے ہمیں بہت دیر غیر کا غلام رکھا ہے مگر آج ہم پھر آزاد ہیں اگر ہم پھر عیش و آرام میں پڑ کر موٹے اور سست ہو گئے اور اپنے پنجوں کی تیزی کھو دی تو قدرت کا قانون ہم سے رعایت نہ کرے گا۔ اور مرغیاں ہم پر ضرور لپکیں گی"

بچوں کے لئے

لطائف

بچّوں کی دعا

کچھ لوگ بارش کے لئے دعا مانگنے شہر سے باہر میدان کو جا رہے تھے۔ بہت سے بچے بھی ان کے ساتھ تھے۔ ایک ظریف نے انہیں جاتے ہوئے دیکھا تو پوچھا۔ میاں کہاں جا رہے ہو۔ انہوں نے جواب دیا۔ بارش کے لئے دعا مانگنے۔ ظریف نے کہا۔ یہ بچے ساتھ کس لئے ہیں۔ کہنے لگے۔ بچوں کی دعا جلد قبول ہوتی ہے اس لئے انہیں بھی ساتھ لے جا رہے ہیں۔ ظریف نے کہا۔ اگر بچوں کی دعا قبول ہو تو سکول ماسٹر ایک بھی زندہ نہ بچے۔

حساب فہم لڑکا

ایک آدمی کا لڑکا مدرسے میں علم حساب پڑھتا تھا۔ ایک روز باپ نے بیٹے سے کہا۔ جاؤ بیٹا بازار سے بیس گز رسہ خرید لاؤ۔ لڑکا تھوڑی دور جاکر واپس آیا اور پوچھا۔ رسّے کا طول بیس گز یا عرض۔ باپ کو بہت غصہ آیا اور بولا۔ تمہاری بے وقوفی کا طول اور عرض بیس گز ہے۔ جاؤ دکان دار سے بیس گز رسہ مانگو وہ خود دے دے گا۔

مہربان باپ

ایک دن پہلے استاد نے شاگردوں کو پڑھایا تھا کہ حاکم کو چاہیئے کہ اپنی رعایا سے اس طرح کا سلوک کرے جس طرح مہربان باپ اپنے بچوں سے کرتا ہے۔ دوسرے دن ایک شاگرد کو مخاطب کرکے استاد نے

نے پوچھا۔ بتاؤ بادشاہ کو رعایا سے کیسا سلوک کرنا چاہیئے۔ لڑکے نے کہا۔ مجھے معلوم نہیں۔ استاد نے پھر کہا بادشاہ کو کس کی مثال رعایا سے سلوک کرنا چاہیئے۔ لڑکے نے کہا۔ میں نے عرض کیا ہے مجھے معلوم نہیں۔ استاد سٹپٹایا اور کہنے لگا۔ ایسے آسان سوال کا جواب تمہیں نہیں آتا۔ سنو میں حاکم ہوں اور تم گدھے کے بچے رعایا ہو، مجھے تم سے کیسا سلوک کرنا چاہیئے۔ لڑکے نے فوراً جواب دیا۔ مہربان باپ کی طرح۔

ماں کا ناچ

ایک جنگل میں گدھا اور اونٹ اکٹھے چگ رہے تھے یکایک گدھا بلند آواز سے بولنے لگا۔ اونٹ نے کہا بھائی شور مت مچاؤ اگر کسی نے آواز سن لی تو دونوں پر آفت آ جائے گی۔ گدھے نے جواب دیا کہ یہ میرے بس کی بات نہیں جب مجھے اپنے باپ کا گانا یاد آتا ہے تو میں بھی گانے لگتا ہوں۔ ادھر یہ باتیں ہو رہی تھیں اور ادھر جنگل کے ایک کونے سے ایک قافلہ گزر رہا تھا۔ قافلے والوں نے جب گدھے کی آواز سنی تو ان میں سے کچھ آدمی آواز کے رخ پر آتے اور اونٹ اور گدھے کو پکڑ لے گئے۔ انہوں نے دونوں پر بہت سا بوجھ لاد دیا گدھا بوجھ کی تاب نہ لا کر بیمار ہو گیا انہوں نے گدھے کو اٹھا کر اونٹ پر لاد دیا۔ اونٹ اس مصیبت سے بہت گھبرایا اور اسے گدھے کی حرکت پر بہت غصہ آیا۔ راستے میں ایک جگہ ڈھلوان تھی۔ اس جگہ پہنچ کر اونٹ نے ناچنا شروع کر دیا۔ گدھے نے کہا۔ بھائی خدا کے لئے ایسا نہ کرو میں گر جاؤں گا۔ اونٹ نے کہا اس پر میرا اختیار نہیں۔ جب مجھے اپنی ماں کا ناچ یاد آتا ہے تو میں اپنے آپ کو روک نہیں سکتا۔ گدھا اونٹ کی پیٹھ سے گرا اور اس کی ہڈی پسلی چور ہو گئی۔

حسابِ دوستاں

آمدن از یکم فروری ۱۹۵۲ء تا ۲۹ فروری ۱۹۵۲ء

اسمائے گرامی	رسید نمبر	روپے آنے پائی
جناب حکیم محمود علی صاحب	۵۱۸ / ۱-۲-۵۲	۲۰----۰
" مولوی محمد ابراہیم صاحب	۵۱۹ / ۲-۲-۵۲، ۵۳۳ / ۱۶-۲-۵۲، ۵۴۰ / ۲۶-۲-۵۲	۲۵----۰
" عرشی صاحب	۵۲۰ / ۳-۲-۵۲	۵----۰
" مرزا محمد خلیل صاحب	۵۲۱ / ۳-۲-۵۲	۱۰----۰
" توفیق یعقوب صاحب	۵۲۲ / ۳-۲-۵۲	۵----۰
" محمد یوسف خاں صاحب	۵۲۳ / ۵-۲-۵۲	۵----۰
" بن یمین خاں صاحب	۵۲۴ / ۵-۲-۵۲	۲----۰
" محمد ایوب خاں صاحب	۵۲۵ / ۵-۲-۵۲	۳۰----۰
" سید محمد صبیح صاحب کراچی (معرفت حفیظ صاحب)	۵۲۶ / ۸-۲-۵۲	۵----۰
" مرزا رمضان بیگ صاحب "	"	۵----۰
" عبدالحمید صوفی صاحب "	"	۵----۰
" محمد ملوک خاں صاحب کراچی "	"	۱۰----۰
" خواجہ عبدالرحیم نیاٹک "	"	۵----۰
" حنیف بیگ صاحب "	"	۵----۰
" خواجہ غلام محمد صاحب پشاور "	"	۵----۰
" ڈاکٹر عبدالغفور صاحب قریشی "	۵۲۷ / ۸-۲-۵۲	۱۵----۰
" " میر حبیب اللہ صاحب	۵۲۸ / ۸-۲-۵۲	۲۰
" " کیپٹن منظور احمد صاحب	۵۲۹ / ۱۵-۲-۵۲	۱۰----۰
ایک بزرگ (کراچی)	۵۳۰ / ۱۵-۲-۵۲	۱۱۰----۰
جناب سید تقی حیدر صاحب منٹگمری	۵۳۱	۱۰----۰
" عبدالعزیز صاحب ناظم	۵۳۲ / ۱۶-۲-۵۲	۵----۰
" حافظ سردار بیگ صاحب	۵۳۴ / ۲۲-۲-۵۲	۵----۰
جناب فقیر محمد صاحب	۵۳۵ / ۲۲-۲-۵۲	۰-۸-۰
" سید یحییٰ صاحب کراچی	۵۳۶ / ۲۲-۲-۵۲	۵----۰
" ماسٹر محمد سعید خاں صاحب کراچی	۵۳۷ / ۲۲-۲-۵۲	۵---۰
" محمد شریف صاحب لورا	۵۳۸ / ۲۳-۲-۵۲	۵---۰
" اسلم	۵۳۹ / ۲۳-۲-۵۲	۵---۰
" محمد رفیع صاحب	۵۴۱ / ۲۹-۲-۵۲	۱---۰
" مختار احمد صاحب گجرات	۵۴۲ / ۲۹-۲-۵۲	۱۵---۰
" خان محمد اشرف خاں	۵۴۳ / ۲۹-۲-۵۲	۵---۰
" معرفت خاں عبداللہ خاں گوجرہ	۵۴۴ / ۲۹-۲-۵۲	۵---۰
میزان =		۳۶۳-۸-۰
بقایا سابقہ =		۱۸-۱۰-۰
میزان کل =		۳۸۲-۲-۰

خرچ از یکم فروری تا ۲۹ فروری ۱۹۵۲ء

کتابت البیان بابت ماہ فروری ۵۲ء	۹۱-۸-۰
چھپائی " " "	۳۶---۰
کاغذ برائے البیان " "	۳۳---۰
فولڈ و ریپ " " "	۵-۱۰-۰
ٹکٹ برائے " " "	۳-۴-۰
بقایا تنخواہ حافظ صاحب	۱۸---۰
متفرق	۶-۱۳-۹
کل میزان خرچ =	۱۹۴-۳-۹

کل آمدن =	۳۸۲-۲-۰
کل خرچ =	۱۹۴-۳-۹
بقایا =	۱۸۷-۱۴-۳

(اسلم)

جملہ خط و کتابت

دار القرآن۔ نسبت روڈ۔ لاہور

ترسیل زر

ڈاکٹر میر حبیب اللہ صاحب۔ ۹ جہانگیر سٹریٹ

مصری شاہ

لاہور

قمرالدین قمؔر پرنٹر و پبلشر نے
دوآبہ پرنٹنگ پریس لاھور میں چھپوا کر
دفتر "البیان"، دارالقرآن (گیتا بھون) لاھور سے
شائع کیا

لمحۂ فکریہ آج یا دس سال بعد یا پچاس سال بعد آخر کبھی نہ کبھی مسلم مفکرین کو فیصلہ کرنا ہی پڑے گا کہ ہمارا دین کیا ہے؟ اور وہ کہاں ہے؟ اور ہم جو روزانہ نمازیں ادا کرتے ہیں، ہر سال بڑی شان سے حج کرتے ہیں۔ باقاعدہ رمضان کے روزے بھی رکھتے ہیں صدقات و خیرات بھی حسب توفیق دیتے ہی رہتے ہیں۔ اور ہم میں سے کسی عالم و عامی کو کلمۂ توحید سے انکار نہیں۔ یعنی قصرِ اسلام کے پانچوں ستون اپنی اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ پھر یہ عمارت کیوں گرتی ہی گرتی چلی جا رہی ہے۔ دنیا کا کوئی گوشہ بھی تو ایسا نہیں جہاں ہم اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔ ہم ان قزاقوں سے سہارا لینے پر مجبور ہیں جو روز اول ہی سے ہر جگہ اسلام دشمنی کا بھرپور پارٹ ادا کرتے رہے ہیں۔ اب تک ان کا یہی وتیرہ ہے۔ کبھی عربوں پر دوستی کے پردے میں ہلاکت برسائی جاتی ہے اور کبھی ترکوں کے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچی جاتی ہے۔ کبھی ایرانیوں کے خون سے اپنی کھیتی کو سیراب کیا جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہند و پاک کے مسلمانوں کی رگ گردن پر چھری چلائی جاتی ہے۔ وقس علیٰ ہذا — ہماری تعداد کم نہیں ہمارے خطہ ہائے ارض کم نہیں۔ ہمارے وسائل بھی کم نہیں۔ پھر بات کیا ہے کہ صدیوں پر صدیاں گزرتی جا رہی ہیں ہمارے ملی امراض کو کوئی دوا و دعا کارگر نہیں ہوتی۔ کیا یہ بات سوچنے کی نہیں؟ کیا ہم ہمیشہ یوں ہی پامال اغیار رہیں گے؟ کیا ہماری کوئی نسل بھی اپنے مریضانہ ماحول سے الگ ہو کر اسباب مرض اور علاج مرض پر غور نہیں کرے گی؟ اتنی بڑی قوم۔ اتنے عظیم اور شاندار ماضی کی مالک قوم۔ بے نظیر ثقافت اور بے مثال معاشرے کی خالق قوم کیا اسی طرح صفحۂ ہستی سے مٹتی مٹتی مٹ جائے گی؟ (خدا وہ دن نہ لائے) کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ اور آنے والے زمانے کی تواریخ میں صرف یادگار رہ جائے کہ گذشتہ زمانوں میں مسلم نام کی ایک قوم ہوا کرتی تھی؟

کیا ان سوالات پر کبھی غور نہیں کیا جائے گا؟ میں سمجھتا ہوں کہ غور شروع ہو چکا ہے۔ اگرچہ ابھی بالکل ابتدائی منزل میں ہے مسلمانوں کا ایک طبقہ یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ وہ کون سا گھن ہے جو ہمیں اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے — وہ دوسری اقوام عالم کو دیکھتے ہیں تو وہ رفتارِ ارتقا میں بہت آگے نکلی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ حالانکہ ہمارے نزدیک وہ مغضوب و ضال اور مشرک و نجس ہیں، اور ہم خدا کی خاص قوم، ختم نبوت کے وارث۔ آخری وحی کے محافظ۔ سب امتوں سے افضل و اعلیٰ حضرت رَحْمَةٌ لِّلْعَالَمِينَ کی پیاری امت — پھر یہ کیا ہے کہ تریاق کے بیج کو زہر کا پھل لگ رہا ہے۔ اور حنظل سے انگور پیدا

ہو رہے ہیں ۔ یہ سوچنا ہی پڑے گا کہ کہیں سے ہماری کوئی کل ڈھیلی تو نہیں ہو گئی۔ اور یہ یاد رہے کہ اس سوچ اور فیصلے میں جتنی تاخیر ہو گی۔ اتنا ہی ہم خسرانِ مبین کی طرف آگے ہی آگے بڑھتے جائیں گے ۔ ہمیں سوچنا ہو گا کہ مشرک و کافر دشمن، ہر لحاظ سے ہم مومنوں اور توحید پرستوں سے فائق کیوں ہے ۔ اخلاق و علم میں، تجارت و حکومت میں ۔ ایجاد و تحقیق میں اور صحت و طاقت میں اسی کا پلہ بھاری ہے اور ہم جو "خیر امت" اور "امت وسطیٰ" کہلا رہے ہیں ۔ پرلے سرے کے بداخلاق بدمعاملہ، مفلس و قلاش، مظلوم و محکوم ۔ بلکہ دبے اور نحیف و نزار ہوتے جا رہے ہیں ۔ آخر اس کا کہیں یہ مطلب تو نہیں کہ ایمان و توحید کے جو ثمرات ہوا کرتے ہیں وہ ہمیں مل رہے ہیں اور شرک و کفر کے ثمرات وہی خوش حالیاں اور خوش بختیاں ہیں جو غیر مسلموں کو مل رہی ہیں ۔ لیکن یہ کس طرح ممکن ہے کیونکہ ایمان و توحید کے پہلے داعیوں (صحابہ رضوان علیہم) کو وہ سب نعمتیں چند برسوں میں حاصل ہو گئی تھیں جن کو ہم صدیوں سے ترس رہے ہیں اور نہیں پاتے ۔ بس یہ سوال ہے حل طلب جس کو آج حل کریں یا کسی آئندہ زمانے میں اس کو حل کرنے کیلئے ہمارا کوئی قدم بھی نہیں اٹھ سکتا ۔ یعنی ہماری منزل ہی متعین نہیں ہو سکتی اور جب کسی قوم کی منزل متعین نہ ہو تو اس کی ساری دوڑ دھوپ بے معنی ہے ۔

اس دنیا میں یہ کوئی ناممکن تو نہیں کہ کوئی نادان پیتل کو سونا سمجھ کر سنبھالے سنبھالے پھرے ۔ اور اگر کبھی کسی صراف کو دکھا بیٹھے تو وہ اس کی حقیقت کھول دے ۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم جس چیز کو ایمان و توحید سمجھ کر گلے کا تعویذ بنائے پھرتے ہیں وہ سرے سے ایمان و توحید ہی نہ ہو ۔ ہم نے کسی اور چیز کو یہ نام دے رکھا ہو ۔ اور اب کوئی جوہر شناس ہمارے سامنے اس کے جعلی اور نقلی ہونے کا اعلان کر بیٹھے تو ہم پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں ۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ یہ کیفیت آج سے پہلے مختلف اقوام پر گذر چکی ہے ۔ مغربی اقوام بھی صدیوں اس قسم کی غلط فہمی میں مبتلا رہیں ۔ ان صدیوں کو وہی لوگ اب اپنی تاریخ میں "تاریک صدیوں" کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ ان میں بعض مصلحین پیدا ہوئے جنہوں نے ان کو غلط ایمان کی تاریکیوں سے نکالنا چاہا ۔ ان کی سخت مخالفت ہوئی ۔ لیکن آخر میدان انہی کے ہاتھ رہا اور وہ مذہب کی ظلمات سے نکل کر عقل کی روشنی میں آ گئے ۔ تنہا عقل کی روشنی ان کو جہاں تک لے جا سکتی تھی وہ وہاں پہنچ گئے ۔ انہوں نے مذہب کے آسیب سے پیچھا چھڑا کر اطمینان کا سانس لیا اگرچہ مجرد عقل بھی ایک آسیب ہی ہے لیکن مذہب کے جن کے مقابلے میں پھر بھی کم موذی ہے ۔ بہرحال ہمیں تاریخ اور حالات کا معائنہ کر کے کسی فیصلے پر پہنچنا ہو گا اور سوچنا ہو گا ۔

۱ ۔ مذہب نے آج تک نوع انسان کی کیا خدمت انجام دی؟

۲ ۔ جب جب انسان نے مذہب کو چھوڑا وہ مذہبی ہونے کے مقابلے میں کیسا رہا ؟

۳ ۔ موجودہ مذہبی اور غیر مذہبی اقوام میں مقابلہ کہ ان میں سے کون فائق و فاتح ہیں اور کون ذلیل و مغلوب اور کیوں ؟

۴۔ اور کیا بانیان مذاہب کی غرض و غایت یہی رسوم و اعمال تھے جو آج مذہبی اقوام نے اختیار کر رکھے ہیں یا کچھ اور؟

۵۔ پھر لادینی پر تنقیدی نظر ڈالنا ہوگی کہ وہ مذہب پرستی سے بہتر اور ترقی یافتہ ہونے کے باوجود انسانیت کے دکھوں کا مداوا تلاش کرنے میں کامیاب ہو سکی ہے یا نہیں؟

۶۔ اگر نہیں ہوئی (جیسا کہ ظاہر ہے) تو کیا انسانیت کے دکھوں کا کوئی مداوا نہیں؟ اور ایسی صورت میں ــــ شوپن ہاور (جرمنی فلسفی) کے الفاظ میں، خاتمہ نسل کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ فطرت بے مقصد چل رہی ہے یا اگر اس کا کوئی مقصد ہے تو وہ اس کے حصول میں سخت ناکام رہی ہے۔

اس کے بعد دوسری صورت سامنے آتی ہے کہ دکھوں کا مداوا تو ہے اور ہونا ہی چاہیئے۔ اتنا عظیم کارخانہ بے مقصد اور کھوکھلا نہیں ہو سکتا۔ پھر وہ مداوا کہاں ہے۔ نہ روس کے کیمونزم کے پاس اور نہ برطانیہ اور امریکہ کی جمہوریت کے پاس ــــ کیا ہمارے صوفیہ کرام اس کی نشان دہی اپنے مکتوبات و ملفوظات میں کر سکتے ہیں؟ کیا ہمارے فقہائے عظام اپنی کتابوں سے کوئی نسخہ تلاش کر کے دے سکتے ہیں؟ کیا ہمارے بزرگ محدثین حدیث کے ذخیروں سے کوئی ایک متفقہ لائحہ پیش کر سکتے ہیں؟ پھر کیا یہ سب لوگ کسی ایک بات پر اس طور سے جمع ہو سکتے ہیں کہ

" کبھی یہ لو دو اور دو چار "

اس کے قیامت تک نہ پانچ ہوں گے اور نہ تین ــــ ہماری تیرہ سے زیادہ صدیوں نے بتایا کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکا۔ اس سے امید پڑتی ہے کہ آئندہ بھی نہیں ہوگا ــــ اب رہ جاتا ہے۔

ایک قرآن

وہ اپنے آپ کو بار بار قطعی۔ یقینی۔ حق۔ نور۔ برہان۔ بصیرت، ہدایت، رحمت، امن و سلامتی کی طرف ہادی صراط مستقیم کا علمبردار۔ بے نظیر و بے مثال۔ لازوال۔ کامل و کافی۔ واضح و مبین۔ سہل و میسّر، مجرب و مصدق اور نجانے کیا کیا کہہ رہا ہے۔ یہ وہ دعاوی ہیں جن کا عشر عشیر بھی دنیا کی کسی مذہبی۔ اخلاقی اور قانونی کتاب میں نہیں ملتا۔ قرآن نے صرف دعوی ہی نہیں کئے بار بار قوموں کے حالات بیان کر کے اپنے اندر بیان کردہ صداقتوں کے تجربی ثبوت بھی پیش کئے ہیں۔

آنے والے زمانے کے مسلمانوں کو سوچنا ہوگا کہ کیوں نہ ایک دفعہ تنہا قرآن کا تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے۔ اقوام مغرب مختلف نظریات زندگی کو آزما چکی ہیں اور آزما رہی ہیں اور ابھی وہ مطمئن نہیں۔ اور وہ فراخ دلی سے اعتراف کرتی ہیں کہ وہ کوہ ہمالہ کی ماؤنٹ ایورسٹ پر پہنچ جائیں تو پہنچ جائیں۔ لیکن سچی انسانیت اور عالمگیر سلامتی کے مینار پر نہیں پہنچ سکیں۔ مسلمانوں کو بھی ایک نہ ایک دن ماننا پڑے گا کہ۔

۱۔۔۔۔ حدیث کو آزما لیا

۲۔۔۔۔ فقہ کو آزما لیا

۳۔۔۔۔ تصوف کو آزما لیا

۴۔۔۔۔ قرآن کے بعد جو جو کچھ پیدا ہوا سب کو ہزار برس سے زیادہ آزما لیا لیکن کار برآری نہ ہوئی۔

آؤ ان سب کو ایک طرف حفاظت و احترام سے رکھ کر چند سال اکیلے قرآن کو آزمائیں۔ یہ سب ہماری دولتیں ہیں۔ ان کو ہم سے کوئی چھین تو نہیں لے گا۔ اور ذرا ایک طرف رکھ دینے سے ان میں کوئی سڑاند پیدا نہیں ہو جانے گی جب قرآن کے استعمال سے ہمارے اندر کچھ قوت و بصیرت پیدا ہو جائے گی تو ہم ان سے بھی مفید کام لے سکیں گے جیسے مریض شفایاب ہونے کے بعد ہر قسم کی غذا سے قوت حاصل کر سکتا ہے لیکن بحالت مرض اسے مقویات تک سے اجتناب کرنا لازم ہوتا ہے۔ یہ بات نئی نسل کے سوچنے کی ہے۔ اس کو سوچے بغیر مشکلات کا ازالہ غیر ممکن ہے۔۔۔ قرآن اور اسلام تو ختم ہو نہیں سکتا۔ اس سے دور رہنے والے ضرور ختم ہو جائیں گے اور اس سے فائدہ اٹھانے والے ایسے گوشوں سے ابھر آئیں گے جو اس وقت ہمارے خیال میں بھی نہیں اور آج سے پہلے ایسا کئی مرتبہ ہو چکا ہے۔

پچھلے دنوں اخبارات میں خبر آئی تھی۔ امریکہ نے والئی نجد و حجاز جلالۃ الملک امیر ابن سعود کی خدمت میں خاص قسم کی موٹروں کی ایک تعداد ہدیئے کے طور پر پیش کی ہے۔ ان موٹروں کے رنگ، نشست گاہیں اور پرزوں کی تعریف کرنے کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا تھا کہ یہ امیر موصوف کی ازواج کے سفر مکہ و ریاض کی سہولت کیلئے نذر کی گئی ہیں۔ پھر اس خبر میں یہ تفصیل بتانا بھی مناسب سمجھا گیا تھا کہ اس وقت ہمارے حامئ دین متین اور ناصر شرع مبین بادشاہ کے زیر استعمال چار بیویاں ہیں اور کل سو عدد خارج از استعمال ہیں وہ سب ان ہدیئے کی کاروں سے خدمت لیں گی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ والوں نے کاریں دینے کا بہانہ بنا کر اصل میں امیر موصوف کی تحسین فرمائی ہے کہ ہمارا کاریں پیش کرنا تو خیر کوئی ایسا "کار" نمایاں نہیں۔ حقیقت میں "کار" نامہ تو آپ کا ہے جس کی نظیر اس وقت سلاطین عالم میں کہیں نہیں ملتی ؏

این "کار" از تو آید و مرداں چنیں کنند

میں سوچتا ہوں کہ ٹرومین، سٹالین، چرچل وغیرہ بڑے بڑے لوگ جب یہ دیکھتے ہوں گے اس وقت دنیا بھر میں صرف ایک شخص ایسا ہے جو بیویوں کی اتنی بھیڑ کا تنہا شوہر ہے اور وہ ہے دین اسلام کا حقیقی نمائندہ۔ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کا متبرک وارث۔۔۔۔ پھر وہ اسلام کے متعلق کیا خیال کرتے ہوں گے۔ کیا اس مذہب کو دنیا میں رہنا چاہیئے یا ختم

کر دینا چاہیئے ـــــ میرا تو خیال ہے کہ یہ لوگ ختم کرنے کا عزم کر چکے ہیں۔ روس میں دہریت نے مذہب پر پل ہی چلا دیا ہے ۔ امریکہ والے دوسرے طریقے سے ختم کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کو مبتلائے عیش کر کے اور ان کی عیاشی کی حوصلہ افزائی کر کے ان کے مذہب کا خاتمہ کیا جا رہا ہے۔ ایک تازہ ترین سفرنامہ حجاز میں اس حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ صاحب سفرنامہ لکھتے ہیں۔

"ظہران کی مشہور امریکن کمپنی آرامکو میں ہزاروں امریکن موجود ہیں جو ہر وقت ریاض۔ طائف اور جدّہ میں مصروف کار نظر آتے ہیں۔۔۔ ظہران میں مجھ کو آرامکو کے متعدد ہندوستانی اور پاکستانی ملازمین کی زبانی یہ معلوم کر کے سخت رنج ہوا کہ جو عرب نوجوان اس کمپنی کے کاروبار میں کلرک یا مزدور کی حیثیت سے کام کرتے ہیں وہ شراب و خنزیر دونوں کے رسیا ہیں حتیٰ کہ بقول ایک ہندوستانی کلرک کے اگر بالکل ناپاک پانی کو کسی خالی بیئر یا وسکی کی بوتلوں میں ڈال کر اس پر کسی ولائتی شراب کا لیبل لگا دیا جائے تو یہ لوگ اس کو بھی غٹ غٹ پی جائیں گے"۔۔۔

آگے چل کر یہی صاحب لکھتے ہیں

"خوش عقیدگی کا یہ عجیب مفہوم پھیل گیا ہے کہ حاجی ارض پاک جا کر سب کچھ دیکھ آئیں اور زبان پر کچھ بھی نہ لائیں"۔

محترم مدیر "صدق جدید" نے اس سفرنامے کے اور بھی ایسے ہی اندوہناک اقتباسات دیئے ہیں اور بعد میں مشورہ دیا ہے کہ اس رپورٹ کے عربی اور انگریزی ایڈیشن شائع ہونے چاہئیں تاکہ مسلمانان عالم کو معلوم ہو جائے کہ مرکز اسلام پر کفار کی طرف سے کس قسم کی یلغاریں ہو رہی ہیں۔

غلامی پر رضامندی انگریز کی محکومیت میں ہمارے ذہن جس طرح غلام تھے بدقسمتی سے آج بھی یہ ذہنی غلامی موجود ہے۔ انگلستان کے ایک چڑیا گھر کے متعلق اطلاع وصول ہوئی تھی کہ آج سے ستر سال قبل ایک مست ہاتھی کو زنجیر میں جکڑ دیا گیا تھا۔ کوئی ساٹھ سال اس حالت میں رکھنے کے بعد جب اس کی زنجیریں کاٹ دی گئیں تو وہ یہ حس کھو چکا تھا کہ وہ اب آزاد ہے۔ وہ اسی طرح اپنی جگہ کھڑا رہتا تھا اور وہی حرکتیں کرتا تھا جو قید کے زمانے میں تھیں"۔　　(بشکریہ احسان)

راقم اس سے اور آگے جاتا ہے اور یہ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہے کہ انگریز کا غلام بننے سے بہت پہلے ہم ذہنی طور پر غلام ہو چکے تھے۔ اگر ہمارے ذہن اس وقت صحیح ہوتے تو انگریز ہم پر غالب آ ہی نہیں سکتا تھا۔ ہم نے بہت مدت سے قرآن حکیم کی آزاد فضا کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ اس کے نتیجے میں بے شمار قسم کی مذہبی، تقلیدی، وہمی۔ رسمی۔ رواجی غلامیوں کے پھندے ہمارے گلے میں پڑ چکے تھے۔ قرآن پر چلنے والی قوم تو کبھی مغلوب و مفتوح ہو ہی نہیں سکتی ـــــــــــ

(اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۔ اگر تم مومن ہو تو غلبہ تمہاری سرنوشت میں لکھا جا چکا ہے) اب ان قسم قسم کی غلامیوں میں عمریں بسر کرتے کرتے ہمیں ان سے ایسا ہی عشق ہو چکا ہے جیسے افیونی کو افیون سے۔ وہ اسے مضر و مہلک جانتے

ہوئے بھی اسے چھوڑنے پر قادر نہیں ہوتا۔ ہم قرآن کو چھوڑنے اور حضرت فلاں حضرت فلاں کے مذہب کو قبول کرنے کی پاداش میں ہلاکتوں پر ہلاکتیں برداشت کئے جارہے ہیں لیکن اس کو ترک کرنے کا خیال تو بڑی چیز ہے کسی کی زبان سے یہ سننا بھی برداشت نہیں کرتے کہ ہم مذہب کے افیمونی ہو چکے ہیں۔

راقم اوپر کی سطور قلم بند کر چکا تھا کہ پاس پڑے ہوئے "صدق جدید" کے پرچوں میں ایک ورق پر نظر جا پڑی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ریاض طائف اور جدہ تو پیچھے رہ گئے۔ پہنچنے والے خاص قلب اسلام میں پہنچ کر پورے پیکر ملت کے رگ و ریشے میں انجکشن کر رہے ہیں۔ سنئے اس مملکت کا حال جہاں حقہ اور سگرٹ تک ممنوع ہونے کا پروپیگنڈا کیا جاتا ہے۔

مشہور انگریزی مضمون نگار سید اقبال علی شاہ ٹائمز (لندن) میں لکھتے ہیں۔

"خاص شہر مکہ میں دکانیں امریکی مال سے پٹی ہوئی پڑی ہیں۔ امریکی ریڈیو، امریکی بجلی کا سامان، امریکن ٹین کے ڈبوں میں بند غذائیں۔ میں نے تو اپنے قیام بھر کوئی موٹر بھی پرانی نہیں دیکھی بلکہ جدہ میں بھی جدید ترین ساخت اور نمونے کی گاڑیاں رواں دواں پائیں ..... کیلیفورنیا ہی والے علاقے میں امریکی آبادی ۴ ہزار کی ہے۔ اب امریکی اتحاد تو سعودی قلمرو میں روز افزوں ہی ہے لیکن برطانوی عملہ دخل بھی غیر موجود نہیں ..... سعودی سپاہ کو فوجی ٹریننگ بھی برطانیہ کا ایک ملٹری مشن دے رہا ہے۔"

اس اقتباس کے بعد صاحب صدق لکھتے ہیں:۔

"صاحب" کے قدم جہاں بھی کہیں گئے وہاں ناچ، رنگ، شراب، سود خواری، حرام کاری بغرض فسق و فجور کی کوئی سی بھی قسم اٹھا رہے گی؟

تو جدھر جائیگا فتنہ کوئی برپا ہوگا

چہ جائیکہ جہاں ان کی اتنی بڑی تعداد جمع ہو جائے اور وہ بھی غلبہ و اقتدار کے ساتھ ایک نیم حاکمانہ حیثیت سے!"

وہ مشہور حدیث (اخرجوا الیہود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب یہود و نصاریٰ کو پورے عرب سے نکال باہر کرو) جوان قوموں کو عرب سے باہر نکالنے کی ذمہ دار تھی آج اس مملکت کے ہاتھوں اس سرزمین سے خود ہی نکل جانے پر مجبور ہوگئی۔ کوئی صاحب یہ سوچنے کی تکلیف گوارا نہیں فرماتے کہ جہاں مسلمانی "اپنی اصلی شکل میں موجود ہو وہاں فسق و فجور کے پاؤں جم نہیں سکتے۔ ہندو پاکستان ہو یا مکہ و طائف، معاف فرمائیے ہم ہر جگہ نام کے مسلمان ہیں کام کے نہیں۔

۱۔۔۔ البیان کی ظاہری شکل وصورت۔ سائز ٹائٹل وغیرہ کے متعلق۔
۲۔۔۔ مضامین کے متعلق۔
۳۔۔۔ موجودہ صورت میں کیا خامیاں ہیں جن کو دور کرنا مناسب ہے۔
۴۔۔۔ کیا خوبیاں ہونی چاہئیں جو اس وقت نہیں ہیں۔
۵۔۔۔ ماہانہ اشاعت ہی ٹھیک ہے یا دو ماہی سہ ماہی کردی جائے اور موجودہ قیمت ٹھیک ہے یا اس میں تبدیلی کی جائے

مستقل لکھنے والے | مولانا سید محمد جعفر شاہ صاحب نے "مستقل لکھنے والے" کے عنوان سے ایک مضمون لکھ کر یوں سمجھئے کہ مصرع طرح دیدیا۔ اب جس کا جی چاہے اس پر طبع آزمائی کرے۔ چنانچہ شاہ صاحب محترم کے بعد ڈاکٹر برق صاحب نے اس "مصرع" کو تضمین کیا یا اس پر گرہ لگائی جس کو آپ زیرِ نظر رسالے میں دیکھیں گے۔ اگر اجازت ہو تو ہم بھی اس کے متعلق اپنا مافی الضمیر عرض کردیں۔ جب ہم نے یہ عنوان تجویز کیا اور اس کے نیچے اپنے محترم مخدوموں کے اسماء گرامی لکھے تو اس وقت ہمارے سامنے دو قسم کے اصحاب تھے۔

۱۔۔۔ وہ اصحاب جو البیان کے قدیم دور میں باقاعدہ قلمی اعانت فرماتے رہے ہیں قلبی لگاؤ کے لحاظ سے ان کا تعلق البیان سے اتنا ہی ہے جتنا ہمارا۔ بلکہ ان میں بعض بزرگ ہم سے بھی آگے ہیں۔ فالحمد للّٰہ علیٰ ذالک ان سے ہم نے کسی قسم کے استصواب کی ضرورت نہیں سمجھی۔ ان کا نام درج کرکے ہم نے اپنی طرف سے اتنی ہی مضمون آفرینی کی ہے جتنی شاعر نے ذیل کے مصرع میں

"چشمانِ تو زیرِ ابرو انند"

۲۔۔۔ دوسری قسم میں وہ صاحب آتے ہیں جن کی تحریروں کی اشاعت کا شرف "البیان" کو پہلے حاصل نہیں رہا۔ ایسے اصحاب کی اطلاع یابی۔ وعدہ اور امید دہانی کے حوصلے پر ہم نے ان کے اسماء اس فہرست میں داخل کرنے کی مسرت حاصل کی چنانچہ ان میں سے بعض اصحاب نے اپنے وعدے پورے کئے اور آئندہ بھی ان سے ایسی ہی امید ہے لیکن جس طرح ہر کلیے میں استثنا لازمی ہے اسی طرح "مستقل لکھنے والوں" کی جماعت میں کوئی ایسا بھی ہونا ہی چاہیئے جو کبھی نہ لکھنے والا ثابت ہو۔ یا کم از کم "البیان" کے متعلق اس کا رویہ اسی قسم کا ہو۔

کئی اصحاب ہم سے پوچھتے ہیں کہ اس فہرست میں فلاں فلاں صاحب ہیں لیکن ان کا مضمون تو کبھی نظر نہیں آتا۔ ہم اس سوال کے جواب میں اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے ہیں ۔۔۔۔۔ لیکن آج ہم نے قلم سنبھالا ہی اس لئے ہے کہ اس بات کا بھی جواب دے ہی دیا جائے۔ وہ جواب یہ ہے کہ "البیان" ایک دینی رسالہ ہے جو لوگوں کو دینداری اور ایفائے عہد کی تعلیم دیتا ہے۔ اگر وہ خود ہی اپنے قارئین سے ایک وعدہ کرکے اسے پورا نہیں کرتا تو کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ کی سزا کا حقدار

ٹھہرتا ہے لہٰذا ہم گذشتہ کی معافی مانگتے ہوئے آئندہ سے اس کا التزام کریں گے کہ صرف ان ہی بزرگوں کے نام اس عنوان کے نیچے شائع ہوں گے جو سال میں کم از کم پانچ چھ مضامین خاص البیان کی خاطر لکھیں اور محض "برائے نام" کا سلسلہ ختم کر دیا جائے۔ انشاء اللہ

اور جن صاحبوں نے وعدے کے باوجود آج تک توجہ نہیں فرمائی ان کے لئے البیان کی مشتاقانہ آغوش ہمیشہ کشادہ رہے گی۔

البیان سہ ماہی کراچی اور کوئٹے سے ہمیں یہ مشورہ موصول ہوا ہے کہ "البیان" کو سہ ماہی کر دیا جائے اور اس تخفیف کی بجائے سال میں دو چار کتابیں شائع ہوتی رہیں اور اس میں مکتبہ امت مسلمہ کی قدیم کتابوں کی اشاعت کا پہلے انتظام کیا جائے۔ اس کے متعلق قارئین کرام کے مشوروں کا انتظار ہے

حساب دوستاں

اسمائے گرامی	رسید نمبر	پائی آنے روپے
بقایا سابقہ		۱۸۷-۱۴-۳
جناب شیخ محمد اسحاق صاحب	۵۴۵	۱۰-۰-۰
حکیم محمد حسین صاحب عرشی	۵۴۶	۵-۰-۰
جناب بن یمین خاں صاحب	۵۴۷	۲-۰-۰
" مولوی غلام محمد صاحب کیر	۵۴۸	۵-۰-۰
" ڈاکٹر منظور قریشی پشاور	۵۴۹	۲۰-۰-۰
" ایم ڈی مرزا صاحب کراچی	۵۵۰	۵-۰-۰
" حاجی شیخ محمد دین صاحب کراچی	۵۵۱	۵-۰-۰
" حاجی شیخ محمد یوسف صاحب کراچی	۵۵۲	۵-۰-۰
" محمد عبداللہ صاحب بوسانی پراپو	۵۵۳	۵-۰-۰
" ڈاکٹر علم الدین صاحب	۵۵۴	۵-۰-۰
" حکیم محمود علی صاحب	۵۵۵-۵۶۰	۲۰-۰-۰
" حاجی محمد [illegible] صاحب سدھو	۵۵۶	۵-۰-۰
جناب عبد الرشید صاحب نائب تحصیلدار [illegible]	۵۵۷	۲-۸-۰
حکیم عرشی صاحب ۳/- رفیق صاحب ۳/- نعمت اللہ صاحب ۳/-	۵۵۸	۹-۰-۰
" حافظ سردار بیگ صاحب	۵۵۹	۵-۰-۰
" خان محمد ایوب خاں		۱۵-۰-۰
" ڈاکٹر غلام حسین صاحب		۱۰-۰-۰
" محمد صادق صاحب ہیڈ ڈرافٹسمین		۵-۰-۰
" عبد الرحیم صاحب بلوچ کراچی		۵-۰-۰
" ماسٹر در محمد صاحب کراچی		۵-۰-۰
" حق صاحب		۵-۰-۰
" قاضی محمد سعید صاحب ایڈووکیٹ		۲-۸-۰
" محمد یونس صاحب		۱-۰-۰
" ڈاکٹر کیپٹن منظور احمد صاحب		۱۰-۰-۰
" بابو غلام محی الدین صاحب لائل پور		۵-۰-۰
جناب مولوی محمد ابراہیم صاحب		۲۰-۰-۰
" منہاج الحق صاحب چھپرہ سارن		۶-۰-۰
" محمد ایوب بک سٹال نمبر ۲ لاہور		۳-۱۲-۰
" اسلم		۲۰-۰-۰
میزان		۴۰۹-۱۰-۳

خرچ

مد	رقم
قیمت بابت کاغذ برائے البیان مارچ ۱۹۵۲ء	۴۶-۸-۰
کتابت " "	۹۱-۸-۰
چھپائی " "	۳۶-۰-۰
اجرت فولڈ وغیرہ " "	۵-۱-۰
ٹکٹیں " "	۵-۲-۰
تنخواہ حافظ صاحب فروری	۵۰-۰-۰
میزان	۲۳۴-۱۴-۰
بقایا	۱۷۴-۱۲-۳

مولانا عرشی صاحب

شہر متمدن کراچی سے ایک ہولناک آواز

"تنہا بیٹھا" طلوع اسلام "پڑھ رہا ہوں اور آہیں بھر رہا ہوں مجھے حاکم بننے کا شوق نہیں اس لئے کہ مجھ میں اس کی صلاحیت نہیں اور اس لئے بھی کہ جس کتاب پر میرا ایمان ہے وہ اس لغویت کے حق میں نہیں ورنہ سارے ملک میں وہ اسلام کا نور پھیلا دیتا اور پھر ساری دنیا کو اسلام کی دعوت دیتا۔!

"طلوع اسلام" کے مطالعہ سے خیال آرہا ہے کہ ہمارے معذ... ہم کو کھینچتے کھینچتے ایسی پر پیچ راہوں سے اتنی دور لے گئے ہیں کہ نومسلم چاہیں تو اسلام کی طرف آسکتے ہیں لیکن ہم نہیں آسکتے۔ یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا

فروری ۱۹۵۲ء کا طلوع اسلام جس میں مقالہ خصوصی "اسباب زوال امت" شائع ہوا ہے۔ میں اسے پڑھ رہا تھا اور پڑھتے پڑھتے آخری صفحے کے حاشیے پر فوری تاثر کے طور پر مذکورہ بالا سطریں لکھ دیں، آج انہی سے اس مضمون کا افتتاح کر رہا ہوں۔

یہ بات ظاہر ہے کہ رسالے نکالنا اور چھاپنا "طلوع اسلام" والوں کا پیشہ ہے اور نہ "البیان" والوں کا ذریعہ معاش — یہ لوگ اپنا وقت اور پیسہ خرچ کرتے ہیں اور سوداگران مذہب کی طرف سے مسلسل گالیوں کی شکل میں داد وصول کرتے ہیں، اس کے باوجود ان کے استقلال (یا ڈھٹائی) کا یہ عالم ہے کہ باز نہیں آتے۔

میرے اس مقالے کا مقصد ایک "بیابانی پکار" کی تائید ہے میں نے کہا کہ شہر اور بستے ہوئے ملک کی پکار کو "بیابانی" اس لئے کہہ دیا کہ اس کو سننے اور سمجھنے والے خال خال ہیں ایسی ہی آبادیوں کے متعلق ہمارے پیش رو بزرگ رومیؒ کی زبان سے نکلا تھا ؎

"از دام و دد ملولم و انسانم آرزوست"

انسانیت نہ تو جسم و صورت پر منحصر ہے اور نہ بہت سی کتابوں کو ازبر کر لینے پر۔

"آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا" (قرآن)

جس سانچے میں ڈھل کر بنی آدم انسان بن سکتے تھے اس کو بیکار و معطل چھوڑ دیا گیا۔ اس وجہ سے انسان سازی کا کام ختم ہو کر

۱؎ زندگی ہے تو یہ نکتہ جو آپ کو عجیب معلوم ہوگا آیات کی روشنی میں مدلل بیان کروں گا۔ انشاء اللہ

رہ گیا۔ اس وقت دنیا میں بڑے بڑے سیاست دان ہیں۔ قانون ساز ہیں۔ سائنس کے ماہر اور ایجاد و اختراع کے مشاہیر ہیں۔ مذاہب کے محقق اور اقوام و ممالک کے مقتدا ہیں لیکن انسان جس پر انسانیت کی صحیح تعریف صادق آسکے معلوم نہیں کس گوشے میں چھپا بیٹھا ہے؟ "اسباب زوال امت" میں اسی چیز کا رونا رویا گیا ہے۔ زوال انسانیت کے اسباب بتا کر صحیح انسانیت تک پہنچنے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ قبل اس کے کہ میں مقالے سے اپنے ناظرین کرام کا تعارف کراؤں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صاحب مقالہ (محترم پرویز صاحب) کے متعلق چند سطریں لکھوں۔ ان کا تعلق قوم کے ایک ایسے طبقے سے ہے جس سے قرآنی خدمت کی تھوڑی سی توقع بھی بہت مشکل سے کی جاسکتی ہے چہ جائیکہ اپنے تمام وسائل کو اس مقصد عزیز پر قربان کر دینا — اونچے عہدے اور بڑی تنخواہ والے سرکاری ملازموں کے سامنے عموماً دو ہی مقصد دیکھے جاتے ہیں۔ اپنے ملازمانہ مشاغل میں زیادہ سے زیادہ روپیہ حاصل کرنا۔ اور زیادہ سے زیادہ عیش و عشرت کے سامان فراہم کرنا — اس قسم کی زندگی میں خدا و رسول، قرآن، آخرت اور قوم کا مستقبل کوئی خاص وزن و معنی نہیں رکھتے۔ بقول اکبر:—

مذہب نے پکارا اے اکبر اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں یاروں نے کہا یہ قول غلط تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

ایسے "یاروں" کی جماعت سے ایسے شخص کا پیدا ہو جانا جو قرآن پاک اور احیائے ملت سے اتنا گہرا قلبی رابطہ رکھتا ہو۔ عاجز راقم کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا خاص تصرف ہے۔ یہ ایسا ہی تصرف ہے جس نے محمد علی جوہر، محمد علی جناح، محمد اقبال جیسے لوگوں کو مہد فرنگ سے نکال کر رئیس الاحرار، قائداعظم اور ترجمان حقیقت بنا دیا۔ دیوبند، ندوہ اور علی گڑھ وغیرہ کی ملی خدمات کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اپنے اپنے دائرے میں گراں مکاتیب کے بعض خاص خاص فرزندوں نے علم اور مذہب کی مخلصانہ اشاعت کا کام کیا۔ ان صاحبوں کو عموماً اپنے اپنے متعلقہ اداروں اور جماعتوں کی امداد حاصل رہی ہے لیکن پرویز صاحب نہ کسی ادارہ و مکتب سے متعلق ہیں اور نہ ان کی پشت پر کوئی جماعت ہے بلکہ برسوں کے اصرار و تقاضا کے بعد بھی جان بوجھ کر یوسف بے کارواں بنے ہوئے ہیں۔ ان کی یہ خصوصیات اس وقت شاید کہیں نظر آئیں

۱ — بہت زیادہ ملازمانہ ذمہ داریوں کے باوجود

۲ — کسی مذہبی ادارے کی سند کے بغیر

۳ — اہل عقیدت کی جماعت کی مدد کے بغیر

۴ — تنہا اپنے خرچ اور اپنی محنت سے۔

۵ — قرآن عظیم کی ایک عظیم ان سائیکلو پیڈیا تیار کر دینا

۶ — اور اس کے علاوہ مقالات و مضامین کا اتنا کثیر ذخیرہ فراہم کر دینا جس میں عہد حاضر کے قریب قریب سب مسائل آجائیں کیا یہ سب کچھ تصرف خداوندی کا محیرالعقل کارنامہ نہیں؟ اس عاجز کو تو مشیت کی اس تخلیق میں صاف نظر آرہا ہے کہ ابھی ہماری زبونی

اس آخری درجے کو نہیں پہنچی کہ ہم عاد و ثمود کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹا دئے جائیں۔ ابھی اس امت کے بطن میں ایسے جرثومۂ حیات موجود ہیں جن سے ایک صالح قوم کا خمیر تیار کیا جا سکتا ہے۔ ابھی تک راکھ میں کچھ چنگاریاں دبی ہوئی ہیں جو ہمارے برفانی جمود کو پگھلا دینے کے لئے بے تاب ہیں۔

میں یہ کہنا بھول ہی گیا کہ صاحب مقالہ کی جسمانی صحت بھی ایسی قابل رشک نہیں کہ اتنے مختلف اور باعظمت کاموں کو ایک ساتھ جاری رکھ سکے۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں اتنا عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ جو دوست موصوف کی انتھک مساعی کو "دین میں فتنہ" کہہ رہے ہیں۔ ان میں مخلص و غیر مخلص دونوں قسم کے لوگ ہیں، اس کا فیصلہ اور سزا و جزا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ انہیں اپنی ہی عاقبت کی خاطر غور کر لینا چاہئے کہ وہ خود تو کسی "بانیٔ فتنہ" کا شکار نہیں ہو رہے؟ — پرویز میں غلطیاں ہو سکتی ہیں اور ہیں وہ خود بھی اس کے معترف ہیں۔ اور کوئی بھی صاحب فہم سلیم اپنے آپ کو معصوم عن الخطا نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ان کے خلوص اور صادقانہ دردِ ملت میں شبہ ایک ایسی غلطی ہے جس سے ان کی ذات سے زیادہ ملت کے اجتماعی مفاد کو سخت صدمہ پہنچنے کا خطرہ ہے — ہماری قوم کا یہ شعار ہو چکا ہے کہ جب تک کوئی کام کا آدمی ہمارے درمیان موجود رہتا ہے اس کی راہ میں کانٹے بچھانے کو ثواب کا کام سمجھا جاتا ہے اور اس کے رخصت ہو جانے کے بعد آہستہ آہستہ آنکھیں کھلنا شروع ہوتی ہیں۔ سرسید۔ قائداعظم۔ علامہ اقبال پر فتوے لگانے والے مسلم علما ہی تھے۔ اور اب ان کو تحسین کہنے میں یہ دوسروں سے پیچھے نہیں۔ اس موقع پر ایک ادیب کے چند فقرے قابل توجہ ہیں جو ایک دوسرے ادیب دوست کی میت کے سرہانے کھڑے ہو کر ادا کئے گئے ہیں۔

> "میرے دوست! یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے سقراط کو زہر دیا تھا تو وہ خوشی سے ہنس رہا تھا — جون آف آرک کو شعلوں کی نذر کر کے تالیاں پیٹ رہے تھے۔ عیسٰی کو پھانسی کے تختے پر چڑھا کر فاتحانہ انداز سے مسکرا رہے تھے اور یوسف کو سربازار بیچ کر قہقہے لگا رہے تھے۔ اور آج یہی وہ لوگ ہیں جو ان کی یاد میں آنسو بہاتے ہیں اور ان کی عظمتوں کے گیت گاتے ہیں اور انہیں پیغمبر مانتے ہیں"

یہ قدیم ذہنیت مسلمانوں میں بہت زیادہ راسخ ہو چکی ہے وہ جس شخص کے لئے کل رو ئیں گے آج اسے زندہ دیکھنا گوارا نہیں کر سکتے اور اس مصیبت یا معصیت کے ذمہ دار عوام نہیں خواص ہیں جو مذہبی اور سیاسی اقتدار کے بل پر عوام کو ہمیشہ گمراہ رکھ کر اپنا آلۂ کار بناتے رہے ہیں۔

تمہید توقع سے کچھ زیادہ طویل ہو گئی۔ اصل مقصد "تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى" کے امر کی تعمیل میں اس مقالے کا تعارف کرانا ہے، جس میں زوال امت کے اسباب کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے علامہ شکیب ارسلان مرحوم نے اسی موضوع

پر ایک قابل قدر رسالہ لکھا تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی بزرگ اس پر خامہ فرسائی فرما چکے ہیں لیکن زیر نظر مقالے کی جگہ ابھی خالی تھی۔ اس میں جامعیت خلوص اور دل سوزی کے ساتھ ساتھ صاف گوئی بھی اپنی آخری حد کو پہنچ گئی ہے۔ مصنف نے اس بات کی پروا نہیں کی کہ اس کا ناوک تنقید محراب و منبر اور زاویہ و خانقاہ کے کلیجے کو چھید کر کرسی اقتدار کے دل سے بھی پار ہو جائے گا اور حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ایسے ہی آپریشن کی ضرورت بھی ہے جو پاپائیت اور ملوکیت کے رستے ہوئے ناسوروں سے ہمیشہ ملت کو شفا بخشے۔ بعض سنجیدہ و متین لوگ کہیں کہیں لہجے کی تلخی پر اعتراض کر سکتے ہیں۔ اس میں راقم ان کے ساتھ اتفاق کرتا ہے لیکن جب علمائے یہود پر نرم دل و ملائم گفتار مسیح کی تنقید یاد آتی ہے جہاں وہ کہتے ہیں۔

”اے بچھوؤ اور سانپوں کے بچو!“

تو ایک ایسے شخص کو معذور ہی ماننا پڑتا ہے جو اپنے آپ کو نبی تو کجا ولی بھی نہیں بلکہ ملت کی بے مرکزی کے سبب پورا مسلمان کہتے ہوئے بھی ہچکچاتا ہے۔ اس کا دعویٰ اگر کچھ ہے تو صرف اتنا کہ اس نے اپنے قومی مرض اور اس کا علاج دریافت کر لیا ہے۔ مرض کے تو قریب قریب سب ہی قائل ہیں۔ البتہ اسباب و علاج میں اختلاف ہے اور یہ کوئی فکر کی بات نہیں۔ دوسرے لوگ جن دواؤں کو علاج بتاتے ہیں پرویز کے نزدیک وہی مرض کا سبب ہیں اور ان کو استعمال کرتے ہوئے صدیاں گزر گئیں مگر

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

تنہا قرآن ہی ایک ایسا نسخہ ہے جس کا استعمال صرف ابتدائی دور میں ہوا اور نتیجہ حسب مراد پیدا ہوا۔ بعد میں اس کو متروک و مہجور قرار دے کر دوسرے نسخوں کو مورد استعمال قرار دیا گیا جو اب تک استعمال کئے جا رہے ہیں اور مریض روز بروز مضمحل ہوتا جا رہا ہے۔

زیر نظر مقالے میں بہت سی ذیلی سرخیاں ہیں مثلاً عزت و ذلت کسے کہتے ہیں — عزت کی دوڑ کیسے ہوتی ہے — دنیا و آخرت کا مفہوم — تقویٰ کا مفہوم — مقصود زندگی — دو گروہ — تیسرا گروہ — دین کیا ہے — جماعت مومنین — مذہب اور دور ملوکیت — مذہب کے حربے — روایات سازی — ائمہ پرستی — تصوف — اختلافات — مذہب میں عقل کو دخل نہیں — تقلید — جذبات نفرت — حسن فطرت — حدود اللہ — حرام و حلال — منافقت — مذہبی ضابطہ اخلاق — کفر بعد از ایمان — غور و تدبر — عالم کسے کہتے ہیں — زوال کا بنیادی سبب — قرآن ہی کے قانون کے مطابق تباہی — پس چہ باید کرد — اسلامی حکومتوں کی پیوند سازی۔

ان تیس عنوانوں پر قرآن، عقل اور تاریخ کی روشنی میں غور کرنے کے بعد ان کے متعلق پانچ مختلف اعتراضات کے مفصل جوابات دیئے ہیں۔ اس کے باوجود کئی مقامات ایسے ہیں جہاں بحث و اختلاف کی کافی گنجائش ہے۔ یہاں مفصل تبصرہ اور اظہار اختلاف کی گنجائش نہیں خاص خاص مقامات جن سے راقم خاص طور پر متاثر ہوا ہے۔ صرف ان کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں۔ قرآن جسے آپ کو قول فصل یعنی فیصلہ کن بات کہتا ہے اور تمام رسولوں اور ان کی امتوں کو ”امت واحدہ“ بنانا چاہتا ہے قدیم مذہب کے تمام اختلافات کو ختم کرنا مقصد ہے کہ کام کی تکمیل پیغمبر اسلام اور ان کی وساطت سے

امت مسلمہ کے سپرد تھی۔ لیکن امت مسلمہ نے کیا کیا۔ خود اختلاف ہی کو منشاء نبوت بنا لیا اور عملاً قرآن کا مضحکہ اڑایا۔ چنانچہ قرآنی اتحاد اور ہمارے علماء کے مذہبی اختلافات کے متعلق پرویز صاحب کے سائنٹیفک الفاظ سنئے

اختلاف "جس نظریہ یا پروگرام کی صداقت کا معیار اس کے بدیہی اور ٹھوس نتائج ہوں۔ اس میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہوتی۔"

یہ ہے صاحب موصوف کا دعویٰ۔ اس کی دلیل وہ دی ہے جو ہمارے ابنائے اختلاف علماء کے تصور میں کبھی نہیں آئی ہوگی فرماتے ہیں

"بیس مختلف مقامات پر سائنس دان، اپنی اپنی تجربہ گاہوں میں پانی کا تجزیہ کررہے ہوں۔ ان سب کا نتیجۂ عمل ایک ہوگا۔ اس باب میں ان کا کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔ اختلاف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب آپ ٹھوس حقائق کی دنیا سے الگ ہو کر محض نظری اور مجرد مباحث میں الجھ جائیں۔ دین کا نظام اپنی صداقت کیلئے ٹھوس نتائج کو معیار قرار دیتا تھا جو اسی دنیا میں سامنے آجاتے تھے۔ لہٰذا دین میں اختلاف کی گنجائش ہی نہ تھی۔"

عبارت کا زور اور ان نتائج کی قطعیت پر پرجوش ایقان ملاحظہ کیجئے۔

ایک قانون۔۔۔ ایک نظام۔۔۔ اس پر عمل پیرا ہونے والے لوگوں کی ایک جماعت۔۔۔ ایک نہج فکر۔۔۔ ایک طریق کار۔۔۔ لہٰذا

ایک ہی نتیجہ صـ۳۱ جلد ۵ نمبر ۲

کیا یہ کوئی محض شاعرانہ دعا یا عامیانہ خوش فہمی ہے؟ ہو سکتا ہے کہ اس دور کے لوگ گذشتہ صدیوں کے تلخ تجربات کی بنا پر اسے ایسا ہی سمجھیں لیکن اصدق التواریخ قرآن حکیم کی شہادت اسی کے حق میں ہے۔ نوح علیہ السلام سے محمد علیہ السلام تک کے انبیاء کو ایک نظر دیکھ جائیے جو زماناً و مکاناً سینکڑوں ہزاروں سال اور سینکڑوں ہزاروں کوس ایک دوسرے سے دور تھے۔ لیکن ان سب کی زبان سے ایک ہی بات نکلتی ہے۔ ہر آنے والا گزرے ہوئے کی تائید و تصدیق میں رطب اللسان ہے۔ کوئی ایک بھی کسی دوسرے کی تردید نہیں کرتا غلطی نہیں نکالتا۔ پھر جو کچھ ان کے منہ سے نکلتا ہے۔ پورا ہو کر رہتا ہے۔ اقوام عالم کا عروج و زوال اور کائنات ارض و سما کے حوادث ان کی صداقت پر گواہی دیتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ ان سب کے علم کا سرچشمہ ایک ہے اور وہ سہو و خطا سے منزہ ہے۔

اب آگے بڑھئے اور دیکھئے کہ اس **ایک** سے **انیک** اختلافات کس طرح پیدا ہوتے ہیں۔

"مثلاً ایک شخص آپ سے کہتا ہے کہ یوں نماز پڑھئے۔ اس سے آپ کی نجات ہو جائے گی۔ دوسرا کہتا ہے کہ نہیں۔ یوں نہیں یوں پڑھئے۔ تب آپ کی نجات ہوگی۔ آپ کے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ کس طریق سے آپ کی نجات ہوگی۔ لہٰذا نظری عقائد اور ان اعمال و رسوم میں جن کے نتائج اگلی دنیا پر اٹھا رکھے جائیں۔ اختلاف لازمی ہے۔" بحوالہ ایضاً

نماز یہاں ایک بات سامنے لے آئیے پیغمبروں کی پوری قطار پر اول سے آخر تک نظر ڈالئے کسی ایک زمانے میں بھی نماز وغیرہ

کے متعلق اس قسم کی بحثیں پیدا ہوئی تھیں۔ جن کی بنا پر ہم نے الگ الگ فرقے بنا کر مستقل اختلافات کے پہاڑ کھڑے کر لئے تھے
موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی پہلی ملاقات میں حکم ہوتا ہے ۔

(اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِی ۔۔ میری یاد کے لئے نماز قائم کرو)

یہ وہی موسیٰؑ ہیں جن کو ابھی عصا کے متعلق ایک سوال ہوتا ہے اور وہ تین جواب دیتے ہیں لیکن یہاں بالکل نہیں پوچھتے کہ ۔
یا اللہ پاک! نماز کی رکعتیں بھی بتا دیجئے ۔ اور یہ بھی کہ ہاتھ چھاتی کے اوپر رکھوں یا نیچے؟ اور رفع یدین کروں یا نہ کروں اور آگے ہاتھوں قرأت خلف الامام کا مسئلہ بھی سمجھا ہی دیجئے اور پاجامے کی رسائی کہاں تک ہو۔ مسواک کتنی لمبی ہو؟ (الیٰ غیر نہایہ)

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ خدا کا یہ پیارا پیغمبر نماز کے شرائط فرائض واجبات۔ سنن مستحبات، نوافل وغیرہ کے مسائل کو سمجھے بغیر ہی پیغمبری کے درجے پر پہنچ گیا۔ صرف یہی ایک نہیں۔ نوحؑ سے محمدؐ تک اور محمدؐ کے صحابہؓ تک اس فقہ کے طوماروں کو پڑھے بغیر ہی "رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ" بن گئے۔ جو امت مرحومہ و مظلومہ کی پیٹھوں پر لاد دی گئی، اور جس کی برکت سے یہ ساری دنیا کو ایک بنانے والی جماعت خود پارہ پارہ ہو کر رہ گئی ۔۔ آیئے آگے بڑھیئے۔

اختلاف رحمت ہے "یہ تفریق و تقسیم۔ یہ تحزب و تشیع ایسی چیز تھی جس سے (خود ساختہ) مذہب کو اپنی گرفت کی محکمی میں کچھ خطرہ ہو سکتا تھا لیکن اُسکے پاس ان خطروں کی روک تھام کے لئے بڑے بڑے مقدس حربے موجود تھے۔ اس نے جھٹ عربی کا ایک فقرہ (اختلاف امتی رحمۃ ۔۔ میری امت کا اختلاف رحمت ہے) تراشا اور اسے منسوب کر دیا اس ذات گرامی کی طرف جس کی بعثت کا مقصود تمام نوع انسانی کی وحدت تھی۔ جب یہ فقرہ حدیث بن گیا تو اختلاف کے رحمت ہونے میں کیا شبہ باقی رہا۔ قرآن اس فرقہ سازی کو شرک قرار دیتا تھا لیکن اس حدیث نے اسی شرک کو عین رحمت بنا کر دکھا دیا" حوالہ ایضاً

اب اس شجرہ "رحمت" کا پھل ملاحظہ کیجئے۔

"..... ایک مسلمان کی تلوار دوسرے مسلمان کے سینے میں پیوست ہوتی تھی اور اس طرح ان میں سے قاتل غازی اور مقتول شہید قرار دیا جاتا تھا۔ حالانکہ قرآن پکار پکار کر کہہ رہا تھا" من یقتل مومناً متعمداً فجزاؤہ جہنم الخ" جو قصداً کسی مومن کو قتل کرے اس کی سزا جہنم ہے ... یہ خدا کا فرمان تھا لیکن ارباب مذہب ان قاتلوں کو جنت کے پروانے تقسیم کرتے تھے ......"

تقلید اب خطرہ یہ تھا کہ کوئی سوچنے والا قرآن اور اس طرز عمل کے تضاد کو عقلی رنگ میں سوچنا شروع کر دے۔ اس کے لئے شاطران فرقہ سازی نے عقل کے لئے تقلید کا تالا تجویز کیا اور فرمایا:۔

"جو عقلی توجیہات طلب کریگا وہ ابلیسی گروہ میں شامل ہوگا۔ اس لئے کہ اَوَّلُ مَنْ قَاسَ اِبْلِیْسُ (جس نے سب سے پہلے

عقلی قیاس سے کام لیا وہ ابلیس تھا۔ اس کے برعکس جنت بیوقوفوں کے لئے ہے (اہل الجنۃ بُلہٗ) ص۳۲

حالانکہ اس باب میں بھی قرآن خاموش نہیں۔ ادعو علیٰ بصیرۃ انا ومن اتبعنی — پیغمبری دعوت سراسر بصیرت پر مبنی ہے
اب اس تقلید کی کیفیت سنیئے۔

"قانون ارتقاء کے ماہرین ہمیں بتلاتے ہیں کہ جس عضو سے کوئی ذی حیات کام لینا چھوڑ دے۔ رفتہ رفتہ فطرت اس عضو کو بیکار سمجھ کر اس کی افزائش (بلکہ پیدائش) ہی روک دیتی ہے اس طرح جب کوئی قوم سوچ سے کام لینا ترک کر دے تو کچھ نسلوں کے بعد اس قوم میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ اس سے صرف موجودہ نسل ہی تباہ نہیں ہوتی، آنے والی نسلیں بھی برباد ہو جاتی ہیں۔ اس قوم میں انسان پیدا ہی نہیں ہوتے۔ حیوان پیدا ہوتے ہیں اور حیوان ہی مر جاتے ہیں..... علم الحیوانات کے ماہرین بتلاتے ہیں کہ کبھی چمگادڑ کی آنکھیں بھی دوسرے پرندوں کی طرح کھلی ہوتی تھیں — چمگادڑوں نے ان سے کام لینا چھوڑ دیا تو اب ان کی آنکھوں کی ساخت ہی ایسی ہو گئی ہے کہ وہ نورِ آفتاب کی تاب ہی نہیں لا سکتے" ص۳۳

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ہم مسلمان اپنے علمائے کرام سمیت عقل کے ترک استعمال کی بدولت اب نورِ قرآن کی تاب ہی نہیں لا سکتے —
اب اگر کوئی بزرگوار اس بات پر ناراض ہونا چاہے تو پرویز سے پہلے علامہ اقبالؒ پر اپنا غصہ نکالے جو برسوں پہلے بالکل کھلے لفظوں میں کہہ گئے ہیں

مکتب و ملا و اسرارِ کتاب — کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب

پرویز غریب اس سے زیادہ کیا کہے گا؟ — آگے چلئے — دین ہر شے کو اس کے صحیح مقام پر رکھنے کا نام ہے۔

دین اور موزونیت: "لیکن اگر خیر سے خیر شے کو بھی اس کی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو وہ شر بن جاتی ہے حسن موزونیت کا نام ہے اور موزونیت یہی ہے کہ ہر شے اپنے صحیح مقام پر ہو۔ لیپکال کے الفاظ ہیں — "اگر قلوپطرا کی ناک ذرا چپٹی ہوتی تو تاریخ کا نقشہ کچھ اور ہوتا" اور اگر نور جہاں کی آنکھیں ابھری نہ ہوتیں تو ہمارا ملک بعض دوسرے اثرات کے علاوہ شیعہ سنی آویزشوں سے بڑی حد تک محفوظ رہتا۔

اخلاق و اسلام: عام ضابطہ اخلاق جس کو مذاہب عالم کے علاوہ منکرین مذہب بھی مانتے ہیں۔ اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

"اسلام کی پیش کردہ تعلیم اس عام اخلاقی ضابطے سے ماورا کچھ اور بھی ہے جس کی مثل و نظیر ناممکن ہے۔ یہ تعلیم ہے وہ نظام ربوبیت جو اسلام کا مابہ الامتیاز ہے اور جس کی نظیر دنیا کا کوئی نظام پیش نہیں کر سکتا۔" ص۲۹

نکتۂ عظیم: یہ نکتہ وہ ہے کہ ہمارے بڑے بڑوں کی توجہ اس کی طرف نہیں گئی۔ شاید اس لئے کہ ان کے وقتوں میں معاشی حالات کی یہ عالمگیر طوفان انگیزیاں تھیں ہی نہیں اور آج یہ ایک خطرناک دیو کی صورت میں ہر طرف منہ کھولے کھڑی ہیں۔ ان کے سدباب کے لئے ہر انسانی کوشش ناکام یا ناکافی ثابت ہو رہی ہے، اور اسلام کے پاس اس کا فردوس آفریں حل موجود ہے جس سے خود حاملانِ اسلام بالکل بے خبر غیر ضروری مسائل کے کیچڑ میں لت پت ہو رہے ہیں — اب حال یہ ہے کہ

"جب اس قوم نے جو اس ضابطہ حیات (قرآنی دین) کی اصلیت پر یقین رکھتی تھی اسے ضابطہ زندگی ماننے سے عملاً انکار کر دیا تو اس پر کامیابیوں کی راہیں مسدود ہو گئیں۔ کیف یھدی اللہ قوماً کفروا بعد ایمانھم ۔ بھلا خدا کا قانون اس قوم پر کس طرح عروج و ارتقا کی راہیں کھول دے جو اس قانون کے درخشندہ نتائج پر ایمان لانے کے بعد پھر اس سے عملاً انکار کر دے اُولٰئِکَ جَزَآؤُھُمْ اَنَّ عَلَیْھِمْ لَعْنَۃَ اللّٰہِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ۔ ان لوگوں کو اس روش کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان تمام نتائج حسنہ سے محروم رہ جاتے ہیں جو خدا کا قانون اور اس قانون کو محسوس حقائق میں تبدیل کرنے والی کائناتی قوتیں اور انسانوں کا اجتماعی نظام پیدا کرتا ہے۔" ص۴۱

یہ ہے کفر بعد ایمان۔ دوسری جگہ فرمایا ہے۔

عجیب تفسیر "الذین جعلوا القرآن عضین ۔ وہ لوگ جنہوں نے قرآن کے الگ الگ ٹکڑے کر دیئے۔ اس نظام واحد کو دنیا و آخرت کے الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر دیا اور اس طرح ملوکیت و مذہب وجود میں آئے۔"

اس آیت کی یہ تفسیر راقم کے علم میں قابل قدر اضافہ ہے۔ گذشتہ تفسیروں سے کوئی واضح چیز پلے نہیں پڑتی تھی۔ آگے اس "عضین" کی مثال دی ہے۔

پانی آگ کو بجھاتا ہے لیکن اس کے اجزائے ترکیبی الگ الگ ہو جائیں تو الٹی تاثیر کرتے ہیں یعنی ہائیڈروجن خود جلتی ہے اور آکسیجن دوسری چیزوں کو جلنے کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ اسی طرح دین حکومت و مذہب کے الگ الگ ٹکڑوں میں منقسم ہوا تو اس کی خصوصیات ختم ہو گئیں بلکہ ان کی ضد پیدا ہو گئیں جسے عذاب کہا جاتا ہے۔ قل ھو القادر علی ان یبعث علیکم عذاباً الخ ص۴۱

علم کی حقیقت "علم کے معنی قرآن کے نزدیک کیا ہیں اور ہمارے ہاں کیا مروج ہو چکے ہیں۔ اس کے متعلق کہتے ہیں۔

"قرآن نے عالم کا لفظ سائنٹسٹ کے لئے استعمال کیا تھا۔ سورہ فاطر میں دیکھئے۔" ص۴۳

آگے وہ آیت ہے جس میں عجائبات فطرت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور آخر میں فرمایا ہے۔ انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء یعنی کائنات عالم پر غور و فکر کرنے والے عالم ہیں اور انہی کو قانون الٰہی کی عظمت و کبریائی کا صحیح احساس ہوتا ہے۔ ایک زمانے میں مسلمان اس معنی سے واقف تھے اور علم کائنات میں اقوام عالم کے استاد مانے جاتے تھے جیسا کہ امام راغب کی مفردات سے پتا چلتا ہے۔

اَلْعِلْمُ اِدْرَاکُ الشَّیْءِ بِحَقِیْقَتِہٖ .... اَلْعِلْمُ بِمَوْجُوْدَاتِ الْعَالَمِ ۔

شغل علماء "لیکن جب دین مذہب سے بدل گیا تو علماء کے معنی لائبریرین کے رہ گئے ... بڑا عالم کون ہوتا ہے؟ وہ جو یہ بتا سکے کہ فلاں مسئلہ کے متعلق بخاری میں کیا لکھا ہے۔ فتح الباری نے اس کی کیا تفسیر بیان کی ہے۔ علامہ آلوسی کا اس باب میں کیا ارشاد ہے جو سب سے زیادہ حوالے دے سکے وہی سب سے بڑا "مفتی دین" اور "حامل شرع متین" ہوتا ہے۔ یہ لائبریرین کا کام نہیں تو اور کیا ہے؟

اور یہ مسائل جن کے لئے ان ذخائر کی اوراق گردانی ہوتی ہے۔ ہوتے کس قسم کے ہیں؟ ایک عزیز دوست گذشتہ حج کو گئے تو میں (پرویز صاحب) نے ان سے خاص طور پر کہا کہ وہاں مختلف ممالک کے علماء سے ملیں اور دیکھیں کہ وہ کن مباحث پر گفتگو کرتے ہیں۔ واپسی پر میں نے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ وہ کم و بیش تمام علمائے مکہ و مدینہ اور دیگر ممالک اسلامیہ سے مل کر آئے ہیں جن مسائل پر سب سے زیادہ گفتگو رہی وہ یہ تھے۔ جمع بین الصلوۃ بالقصر فی عرفۃ والمزدلفۃ عرفہ اور مزدلفہ میں نمازوں میں قصر اور جمع جائز ہے یا نہیں؟ — قبروں میں نماز پڑھی جا سکتی ہے یا نہیں۔ سب سے مرکز توجہ یہ مسئلہ عظیمہ تھا کہ لاؤڈ سپیکر پر نماز پڑھائی جا سکتی ہے یا نہیں۔ شیخ عبدالظاہر (امام حرم) شیخ عبدالمہیمن ابوالسمح (امام حرم) اور شیخ عبدالرزاق مدیر مدرسہ دارالحدیث مکہ مکرمہ اور مولانا عبدالرزاق العفیفی الازہری جیسے "علماء کبار" سب کے سب اسی اہم مسئلہ پر بحث کرتے تھے۔ داڑھیوں کے متعلق بھی گفتگو تھی اور میز پر کھانا کھانے کے متعلق بھی۔۔۔" صفحہ ۲۰

اللہ اللہ کتنے اہم کاموں میں مصروف ہیں ہمارے ہادیانِ ملت! عصر حاضر کی دنیا کتنی بے تاب ہے ان مہمات مسائل کے حل کے لئے کہ کھانا میز پر کھایا جائے یا نہ؟ وہ جو سعدیؒ نے بغداد کی تباہی پر فلک شگاف مرثیہ لکھا تھا۔

" اے محمد گر قیامت سر برون آری ز خاک

سر برآر و ایں قیامت درمیان خلق بیں"

کیا آج اس سے بھی زیادہ زلزلہ انگیز نوحے کی ضرورت نہیں۔ اس وقت تو ایک بغداد تباہ ہوا تھا اور آج ساری دنیا تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے۔ مدبرین عالم اس کے بچاؤ کی تجویزیں سوچ رہے ہیں اور ہمارے "مقدس نیرو" صدیوں کی گھسی ہوئی بانسری بجانے چلے جا رہے ہیں۔ آج ہی ایک رسالے میں ایک غزل دیکھی ہے۔ اس کا ایک شعر آپ بھی سن لیجئے۔

" بہ فیض مصلحت ایسا بھی ہوتا ہے زمانے میں

کہ رہزن کو امیر کارواں کہنا ہی پڑتا ہے "

اور اس کے ساتھ ہی قرآنی تعلیم کی مہجوری کے متعلق بھی ایک شعر عرض ہے۔

پھرے بازار میں جب کوئی بھی گاہک نہیں ملتا

تو ہیرے کو بھی جنس رائیگاں کہنا ہی پڑتا ہے

سبب زوال | زوال کا بنیادی سبب انسانوں کا تراشیدہ مذہب ہے۔ مثال کے طور پر چینیوں، بدھوں، عیسائی راہبوں اور ہندوستانی دھرمیوں کی مذہب پرستی اور زوال و پستی کا ذکر کیا ہے جو مذہب کو چھوڑ کر خالص دنیاداری کی طرف آرہے ہیں۔ قرآن ہدایت و رحمت بھی ہے لیکن قانون الٰہی کو توڑنے والوں کیلئے خسران و ضلالت بھی ہے يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ

"قوم بظاہر قرآن کو سینے سے لگائے پھر رہی ہے لیکن اس قرآن سے انہیں ضلالت اور خسران کے سوا کچھ نصیب نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ ہر شے اپنے اصلی مقام پر اپنے منفعت فوائد سے متمتع کر سکتی ہے اسے اس کے صحیح مقام سے ہٹا دیجئے وہ شے مضر ہو جائیگی پانی کو کشتی کے نیچے رکھئے تو وہ کشتی کی روانی کا ذریعہ ہوگا۔ اسے کشتی کے اوپر لے آئیے تو سیلاب بلا بن کر اسے ڈبو دے گا۔۔۔۔ شے کو اس کے اصلی مقام سے ہٹانا قرآن کے نزدیک ظلم ہے اور ظالم کے لئے ناکامی و بربادی ہی مفید ہے وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ۔ مومنوں کے لئے تو ہمارا نازل کردہ قرآن شفا و رحمت ہے وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا اور ظالموں کے لئے اس میں خسارے اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ۔ مسلمان کے کاروبار زندگی میں جو چیز گھاٹے کا موجب بن رہی ہے وہ قرآن ہے جسے اس کے صحیح مقام سے ہٹا دیا گیا ہے۔ قرآن جب اپنے حقیقی مقام پر تھا تو دین کہلاتا تھا اور جب اس مقام سے ہٹ گیا تو اس کا نام مذہب ہو گیا۔ قرآن وہی ہے اس کا مقام بدل گیا ہے

اسی جہاں میں ہے اب ترک جہاں کی تعلیم ۔۔۔ جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز ۔۔۔ تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو "ناخوب" بتدریج وہی "خوب" ہوا ۔۔۔ کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر ص ۲۲

چارہ کار اب مسلمانوں کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ غیر قرآنی اور غیر محمدی مذہب کے ذخیروں کو کلیتہً دریا برد کر دے اور محفوظ سماوی دین کو اختیار کریں۔ اس طرح وہ اپنی قابل رشک ترقی کے ساتھ تمام اقوام عالم کو نور ربانی کی طرف رہنمائی کر سکتے ہیں اور وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا کا منظر پیدا کر سکتے ہیں۔ یا پھر دوسری منکر مذہب قوموں کی طرح بالکل ہی دنیا کے ہو جائیں اور اپنے آپ کو مفاد عاجلہ کے سپرد کر دیں۔ موجودہ حالت سے یہ حالت کچھ نہ کچھ بہتر ہی رہے گی لیکن اس وقت تو یہ حال ہے کہ

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم ۔۔۔ نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

دوسری قومیں خدا سے محروم ہیں لیکن "وصال صنم" سے تو بہرہ ور ہیں لیکن ہمارا جو حال ہے ظاہر ہے۔ دنیا کے کسی گوشے میں بھی ہماری کوئی ساکھ نہیں۔

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا ہے کہیں صاحب مقالہ کے الفاظ ہیں اور کہیں ان کے خیالات عاجز تبصرہ نویس کے لفظوں میں ہیں اور کئی جگہ اپنے اضافوں کی آمیزش ہے۔ نقل میں بھی لفظ بلفظ کی احتیاط کم ہی رکھی گئی ہے۔ مراد مظروف ہے ظرف نہیں۔

آخری گزارش آخری گزارش یہ ہے کہ ہم کو اس بات کی امید نہیں رکھنی چاہیئے کہ

۱۔۔۔۔ ہم حکومت کو متاثر کر کے قرآن کی طرف لے آئیں گے۔

۲۔۔۔۔ یا علما و صوفیہ کو موجودہ مذہب کی دلدل سے نکال سکیں گے۔

۳۔۔۔۔۔ یا پرویز صاحب کسی معجزانہ قوت سے اپنے تخیلات کو مجسم بنا کر ہمارے سامنے رکھ دیں گے اور ہم چھلانگ مار کر زوال کے گڑھے سے نکل کر عروج کی بلندی پر پہنچ جائیں گے۔ یہ تینوں باتیں انہونی ہیں۔

۱۔ حکومتیں ہمیشہ رائے عامہ کی محکوم ہوتی ہیں۔ ان کا ڈھانچہ اسی طرح چلتا ہے۔ جو مذہب عوام کا وہی بادشاہ کا۔ اگر اس کے خلاف ہے تو بادشاہ سلامت یا معزول ہوتے ہیں یا مقتول۔ تاریخ اس سے برنوہے۔

۲۔ اب رہے مقتدایان مذہب تو وہ بھی حقیقت میں عوام ہی کے مقتدی ہوتے ہیں۔ شیعوں سے پیسے بٹورنے کیلئے انہیں ماتم حسین کا بہروپ بھرنا پڑتا ہے۔ حنفیوں سے جیبیں گرم کرنے کے لئے عرس و قوالی کی محفل گرم کرنا پڑتی ہے۔ اور اہل حدیثوں میں مقبولیت حاصل کرنے کے لئے آمین بالجہر اور رفع یدین وغیرہ کی تائید میں احادیث فراہم کرنا ہوتی ہیں۔ اس وقت ہم ان لوگوں کے اخلاص و عدم اخلاص پر بحث نہیں کر رہے۔ کیونکہ اخلاص مند تو بت پرستوں اور تثلیت پرستوں میں بھی کافی تعداد میں مل جائیں گے۔ گفتگو اس طریق کار میں ہے جو سامنے نظر آرہا ہے لہٰذا ان فراروں سے تو کسی زندہ جسم کے نکل آنے کی امید نہیں ہے (الا ماشاء اللہ وھو علی کل شیئی قدیر)

اب آئیے تیسری شق پر۔ تو وہ ہے پرویز صاحب کی اپنی ذات۔ لوگ دعوے کے پیچھے لگتے ہیں اور ان کے پاس کوئی دعویٰ نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر کے سوا کسی کو دعویٰ کا حق نہیں پہنچتا اور پیغمبر بھی اپنی طرف سے کوئی دعویٰ نہیں کرتا۔ اس کو خدائی الفاظ میں کہا جاتا ہے۔ اَرْسَلْنٰکَ لِلنَّاسِ رسولا۔ ہم نے تجھ کو کائنات انسانی کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے۔

پرویز صاحب کی یہی عظیم خوبی کہ وہ مدعی نہیں ان کا بڑا عیب بھی ہے۔ اب ہمارے دو مشورے ہیں۔ نہایت عاجزانہ اور مخلصانہ۔۔ ایک پرویز صاحب کے لئے۔ اور دوسرا ان لوگوں کے لئے جو ان کی فکر سے متاثر ہو کر قرآن کو اپنانا اور پھر عالمگیر دیکھنا چاہتے ہیں۔

پہلا مودبانہ مشورہ یہ ہے کہ قوم کا روشن فکر طبقہ اس وقت ایک نئے سرسید کیلئے بے تاب ہے جو بغیر کسی دعویٰ کے اٹھے اور ان کے ایثار و عمل سے کام لے کر ایک بالکل نئی قرآنی نسل تیار کرے ۔۔۔ "قرآنی نسل" کہنے کو تو میں نے ایک آسان سی بات کہہ دی۔ لیکن اس کے معانی میں تمام مادی و روحانی عروج و ارتقا کی منزلیں پوشیدہ ہیں جو ابھی تک انسانوں کے تصور میں بھی نہیں آسکتیں۔ مالا عینٌ رأتهٗ وَلَا اذن سمعته ولاخطر علی قلب بشر۔ اس فسق و فجور۔ مکر و فریب۔ ریا و سُمعہ اور جاہ پسندی و تقدس طلبی کی دنیا میں اس فوق الحال مستقبل کے امکانات کو ذہن کے قریب لانا آسان نہیں۔ جس کا نقشہ قرآن پاک نے جا بجا کھینچا ہے اور قرن اول کے نصف اول میں اس کا نمونہ بھی تیار کر کے دکھا دیا۔ راستے کی بھول بھلیوں میں الجھ کر اب وہ نقشہ قوم کے سامنے رہا اور نہ ہی وہ نمونہ اپنی صحیح شکل میں بعد کی نسلوں تک پہنچا۔ اب تصنیفوں، تقریروں اور ماضی وحال کی حسرتناک اور دلدوز ماتم انگیز سینہ کوبیوں سے آگے بڑھکر قرآن پسند لوگوں کی ایک مجلس عاملہ تشکیل کرنا چاہیئے جو اپنا تعلیمی اور عملی لائحہ عمل مرتب کرے۔ اور ایک مرکزی مقام تجویز کر کے وہاں سے آغاز کار کرے۔ ملک کے کونے کونے میں وفد کی صورت میں پھر کر قرآنی نصب العین کا تعارف کرائے اور شرکائے عمل کی فہرستیں تیار کرے۔۔ یہ اجمالی اشارات ہیں جن کی تفصیل تکمیل اور پھر تعمیل مجلس عاملہ کے ذمے ہوگی۔

دوسرا مشورہ ان لوگوں کی خدمت میں ہے جو قرآن کے نور کو گلیوں۔ بازاروں۔ دفتروں اور درباروں میں دیکھنے کے متمنی ہیں۔ وہ کسی ایک شخصیت کے بھروسے پر ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھے رہیں۔ اشخاص پیدا ہوتے ہیں اور اپنا وقت پورا کر کے رخصت ہو جاتے ہیں نصب العین میں اگر زندگی ہے تو وہ اپنے لئے مردان کار مہیا کر لیتا ہے۔ تاریخ ہمیں بہت سے ایسے اشخاص سے متعارف کراتی ہے جنہوں نے اپنے لگائے ہوئے درختوں کے پھل کو خود چکھا اور کئی ایسے بھی تھے جن کا پھل بعد والوں کے حصے میں آیا۔ مثالوں کی طوالت سے بچتے ہوئے اختصار پر اکتفا کرتا ہوں۔ موسیٰ و ہارونؑ کا درخت ان کے خلیفہ یوشع کے زمانے میں بارآور ہوا۔ یہ نبی تھے۔ غیر نبیوں میں بھی اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کی فکر کو لے کر آگے بڑھنے والے مولانا اسماعیل شہید اور حضرت سید احمد شہید بریلوی ہوئے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے علامہ اقبال کے تصوّر کو قائد اعظم نے لباس عمل پہنایا۔ یہ بھی اقبال ہی کے تصور کا ایک حصہ ہے جو "معارف القرآن" اور "طلوع اسلام" کے صفحات پر پھیلا ہوا نظر آ رہا ہے۔ اقبال اپنے ماحول سے ایک حد تک متاثر ہونے کے باوجود سچا اعتماد قرآن ہی پر رکھتے تھے۔ اور ماحول سے قطعی متاثر نہ ہونا غیر ممکن ہے۔ اسلام اور ملک اسلام (پاکستان) دونوں کا مستقبل روشن فکر جوانوں کے ہاتھ ہے۔ وہ خود اٹھیں۔ آگے بڑھیں۔ اپنی تنظیم کی طرح ڈالیں اور آنے والی نسلوں کے لئے وہ راستہ تیار کریں جو ادھر ادھر کی بے شمار پگڈنڈیوں سے بچ بچا کر سیدھا قرآن تک پہنچانے والا ہو — بس ایک شمع کے روشن ہونے کی دیر ہے۔ پروانے دھڑا دھڑ اس کے گرد جمع ہونے شروع ہو جائیں گے۔

انشاء اللہ العزیز

عاجز راقم کے نزدیک وقت یہی ہے اگر یہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو کون کہہ سکتا ہے کہ کتنے خطرناک بلکہ ہلاکت انگیز نتائج کا سامنا کرنا پڑے ہیں

مگو "فردا" کہ فردا ہا گزشت
تا بکلی نگذرد ایام کشت (رومی)

مولانا تمنا عمادی صاحب

تواتر اور قرآن وحدیث

(کتاب اعجاز القرآن کا ایک باب جو زیر تصنیف ہے)

"تواتر" یعنی پے در پے کسی بات کا اتنی بڑی جماعت سے سنتے رہنا کہ اس کا گمان بھی نہ ہو کہ اتنی بڑی جماعت اور اتنے لوگ ایک خلاف واقعہ جھوٹی بات پر متفق اللفظ ہو کر بیان کریں گے۔

تجزیہ کیجئے تو تواتر کے اجزا حسب ذیل ثابت ہوں گے ا۔ تواتر مسند یعنی صاحب واقعہ، جس کے بارے میں وہ خبر متواتر بیان کی جاتی ہے۔ اس کا وجود سب قطعی مانتے ہوں کسی کو اس کے وجود سے انکار نہ ہو۔ ب۔ تواتر مسند الیہ جس واقعے کا تواتر یا جس چیز کا تواتر بیان کیا جاتا ہے۔ اس واقعے یا اس چیز کا وقوع یا وجود بھی سب لوگ قطعی و یقینی جانتے ہوں۔ وقوع یا ظہور کے بعد سے کسی زمانے میں بھی کسی کو اس کے وقوع و وجود سے انکار نہ رہا ہو۔ ج۔ تواتر اسناد یعنی اس واقعے یا اس چیز کی نسبت جو اس صاحب واقعہ یا صاحب چیز کی طرف کی جاتی ہے۔ وہ بھی قطعی و یقینی ہی مانی جاتی ہو۔ کسی کو اس نسبت اسناد میں کبھی کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش ہی نہ ہو اور کسی نے اس نسبت کو کسی دوسرے کی طرف کبھی منتقل نہ کیا ہو۔ د۔ تواتر مکانی جس شہر جس بستی اور جس محلے کا وہ صاحب واقعہ یا صاحب چیز ہو جہاں وہ واقعہ ہوا ہو اور جہاں کی وہ چیز ہو لہٰذا اس تواتر کا آغاز وہیں سے شروع ہوا سب سے پہلے مقامی لوگ بکثرت اس سے مطلع ہوئے ہوں۔ پھر وہاں سے اسکی شہرت دوسری جگہوں میں پہنچی ہو۔ ہ۔ تواتر زمانی جس زمانے کا واقعہ ہو جس زمانے کے مسند و مسند الیہ ہوں اور جس زمانے میں دونوں کے درمیان اسناد یعنی نسبت پیدا ہوئی ہو۔ اسی زمانے سے تواتر خبر کی ابتدا ہوئی ہو۔ اسی زمانے کے خاص و عام سب کے سب یا ان کی اکثریت اس مسند و مسند الیہ اور اس اسناد سے واقف ہو۔ اور ہر بعد والے کو اپنے اگلوں سے اسکی خبر تا بحد یقین برابر اور مسلسل معلوم ہوتی رہی ہو۔

تواتر کے یہ پانچ اجزا عقلی ہیں جن سے کوئی صاحب عقل و فراست، کوئی صاحب انصاف و دیانت انکار نہیں کر سکتا۔ کیا دنیا میں کوئی حدیث بھی ایسی پیش کی جا سکتی ہے جو موطا یا بخاری یا مسلم میں یا کسی کتاب میں بھی ہو جس میں تواتر کی صفت محدثین بالاتفاق مانتے ہوں اور اس میں یہ پانچوں باتیں پائی جاتی ہوں؟ ھَاتُوْا بُرْھَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔

ہاں "عملی متواتر" میں یہ پانچوں باتیں ضرور پائی جاتی ہیں۔ پانچ وقت کی نمازیں۔ ہر وقت کی رکعتوں کی تعداد معین اور تحریمہ و قیام و

رکوع وسجود وقعود کی مجموعی ہیأت وغیرہ۔ اسی طرح رمضان کے پورے مہینے کے روزے، جمعہ وعیدین کی نمازیں، جنازہ کی نماز وغیرہ جن چیزوں کی بنیاد روایتوں پر نہیں ہے بلکہ عمل متواتر پر ہے جن کا غیر منقطع سلسلہ "خلفاً عن سلفٍ" ساری دنیائے اسلام میں بلا اختلاف پونے چودہ سو برس سے چلا آرہا ہے جس سے کوئی صاحب عقل ودیانت انکار نہیں کرسکتا۔ اور دنیائے اسلام کی کوئی جگہ ایسی نہیں پائی جاسکتی جہاں دیندار مسلمان دینی احکام کی پابندی کے باوجود ان کاموں پر بالکل اسی طرح کاربند نہ رہے ہوں جس طرح دوسری تمام جگہوں میں کاربند ہیں۔ کوئی کتاب، کوئی تحریر ایسی نہیں پیش کی جاسکتی جس سے یہ وہم بھی ہو کہ ۱۰ھ ہجری یعنی وفات نبوی سے ایک سال قبل سے آج تک کسی جگہ یا کسی فرقے کے مسلمانوں نے بھی پانچ وقت سے زیادہ یا کم اوقات کی نمازیں اور معینہ رکعات سے کم وبیش فرض سمجھ کر ادا کرتے رہے ہوں، یا رمضان کے روزے پورے مہینے کے فرض نہ سمجھتے ہوں، جمعہ وعیدین کے پابند نہ ہوں، جنازے کی نماز پڑھتے نہ ہوں، ظہرین وعشائین کے اجتماع سے تین وقت نہیں ثابت کیا جاسکتا۔ دونوں تثنیے کے صیغے صاف اعلان کررہے ہیں کہ یہ دو دو وقتوں کی نمازیں ہیں۔ ان اعمال متواترہ کے متعلق حدیثیں ان کے تواتر کے لئے سونے پر سہاگا ہیں۔ مگر اصل سونا اعمال متواترہ ہی ہیں۔ اس لئے کہ ان چیزوں میں قطعیت عملی تواتر کی وجہ سے آئی ہے نہ کہ روایات کی وجہ سے۔

حدیثوں کا تواتر حدیثوں کا تواتر ثابت کرنے کے لئے تواتر کی تعریف کو ہلکی سے ہلکی بنانے کی بڑی کوشش کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ اگر ہر دور میں صرف تین آدمی بھی کسی حدیث کو روایت کررہے ہوں تو وہ حدیث متواتر ہے حالانکہ یہ کس قدر آسان ہے کہ ایک مجلس میں یا مختلف جگہ منتشر ہوکر تین آدمی باہم مشورہ کرکے روایت کریں کہ ہم تینوں سے فلاں فلاں اور فلاں اتباع تابعین نے کہا اور ان میں سے ہر ایک نے ہم لوگوں سے کہا کہ ہم سے فلاں فلاں اور فلاں تابعین نے بیان کیا اور ان تابعیوں میں سے ہر ایک نے کہا کہ ہم لوگوں سے فلاں فلاں اور فلاں صحابیوں نے کہا کہ ہم لوگوں کے سامنے رسول اللہ صلعم نے یوں فرمایا۔ نام فقط تین اتباع تابعین اور تین تابعین اور تین صحابیوں کے لئے گئے۔ مگر یہ بالکل اک من گھڑت داستان ہو جسے ان تین شخصوں نے ایک مجلس میں یا تین جگہ منتشر ہوکر بیان کیا۔ لیکن اس من گھڑت داستان کو ہمارے محدثین متواتر حدیث قرار دے دیں گے۔ چونکہ ہر دور میں تین تین راوی اس کے بیان کئے گئے ہیں۔

ایک واقعہ مثلاً ۱ھ ہجری میں حسب بیان راوی واقع ہوا جو ایک مجمع کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے ایسا اہم واقعہ ہے جس کی خبر ہر صحابی گویا صحابہ کی غالب اکثریت کو ہونی چاہیئے۔ مگر وہ واقعہ صرف ایک غیر معروف یا ایک کم عمر صحابی بیان فرماتے ہیں یا کوئی مشہور ہی صحابی سہی۔ مگر تنہا روایت کرتے ہیں۔ دوسرے کسی صحابی سے اسکی روایت نہیں ملتی اور یہ واقعہ جس زمانے کا کہا جاتا ہے۔ اس زمانے میں اس کی کوئی شہرت ہو اس کا مطلق پتا نہیں۔ ملتا۔ مگر سو برس کے بعد ایک صاحب روایت کرتے ہیں کہ ہم سے فلاں شخص نے (تنہا) روایت کی۔ اور ان سے فلاں نے (تنہا) روایت کی۔ اور انہوں نے ان صحابی واحد سے سنا تھا۔ اب اس سو برس بعد والے راوی سے متعدد آدمی

سنتے ہیں اور پھر ہر ایک سے متعدد سنتے ہیں۔ اسی طرح سو برس کے بعد تواتر قائم کیا جاتا ہے۔ کیا یہ تواتر اس حدیث کا تواتر ہوا؟ کہا جائے کہ فلاں واقعہ مدینہ طیبہ میں بعہد نبوی صلعم ہوا تھا۔ مگر اس کے متعلق مدینے کے لوگ تو بے خبر سے معلوم ہوں لیکن کوفے میں اس کی روایت پر روایت کر کے حدیثوں کی بھرمار کر دی جائے وہ بھی سو برس کے بعد سلسلہ روایت کو رسول صلعم تک پہنچانے کے لئے کسی صحابی کا نام لئے بغیر کام چلتا نہیں۔ اس لئے کسی ایسے صحابی کا نام لیا جائے جو کوفہ یا کوفے کے آس پاس کسی جگہ کچھ مدت تک رہے ہوں۔ بعض طرق میں بطور ذریع دخل کسی غیر معروف مدنی راوی کا بھی نام کہیں پر ٹھونس دیا جائے اور بعض دوسری جگہوں کے راویوں کا بھی تاکہ یہ نہ کہا جائے کہ ہر طریق روایت میں صرف کوفی ہی راوی کیوں ہیں۔ مگر بہرحال رہے غالب اکثریت کوفیوں ہی کی۔ کیا اس طرح کی متعدد روایتوں سے کسی حدیث کو متواتر مان لیا جا سکتا ہے۔ مگر بغیر تواتر زمانی و مکانی کے اس قسم کی ساری روایتیں بڑی آسانی کے ساتھ متواتر کہہ دی گئیں اور کہی جا رہی ہیں۔ سب سے تعجب تو یہ ہے کہ بعض باتیں ایسی ہیں جو اہل مدینہ کی روایتوں میں کچھ اور طرح ہیں اور اہل کوفہ کی روایتوں میں کچھ اور طرح۔ کوئی نہیں یہ سوچتا کہ رسول اللہ صلعم کے اقوال و افعال سے اہل مدینہ زیادہ باخبر سمجھے جا سکتے ہیں یا اہل کوفہ؟ مگر پھر بھی صرف اہل کوفہ کی روایتوں کے تعدد طُرُق کی وجہ سے انہیں کی روایتوں کو متواتر کہہ دیا گیا ہے۔ اور اہل مدینہ کی مخالفت کا اعتراف کرنے کے باوجود اہل مدینہ کی روایتوں کی پروا نہیں کی گئی اور نہیں کی جاتی ہے۔ یہ عالم ہے تواتر افراد احادیث کا۔ دفاتر و مجلدات کا تواتر بس اسی قدر ہے۔ کہ موطا۔ امام مالک کی تالیف ہے صحیح بخاری۔ امام بخاری کی اور صحیح مسلم امام مسلم کی۔ کیا ان کی کتابوں کے مختلف راویوں کے مختلف نسخوں میں جو کمی و بیشی اور الفاظ و کلمات کے اختلافات ہیں۔ ان کے پیش نظر قطعی و یقینی طور سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کوئی نسخہ موطا کا امام مالک کا صحیح نسخہ ہے؟ یحییٰ بن یحییٰ الاندلسی المصمودی کا۔ یا یحییٰ بن یحییٰ التمیمی کا۔ یا سُوید بن سعید الہروی کا۔ یا محمد بن المبارک الصوری کا۔ یا محمد بن الحسن الشیبانی کا وغیر ذلک؟ اسی طرح صحیح بخاری کا کونسا نسخہ امام بخاری کا نسخہ صحیحہ ہے؟ فربری والا، یا مستملی والا۔ یا سرخسی والا۔ یا کشمیہنی والا۔ یا ابن زید المروزی والا، وغیر ذلک؟ اسی طرح صحیح مسلم کے بارے میں سمجھ لیجئے کہ معلوم نہیں والا نسخہ امام مسلم کا خاص نسخہ ہے، یا فاکہی والا۔ یا ابو عمرو المستملی والا۔ غرض ان کتابوں کے جزئیات، ان کے الفاظ و کلمات کے متعلق تواتر کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ان چیزوں کا تواتر اگر ہے تو پورے مجلد کے ضمن میں تبعاً ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ جس کا کل متواتر ہے اس کے اجزا بھی ضمناً متواتر ہی سمجھے جائیں گے مگر یہ تواتر تو صرف اس بات کا ہے کہ موطا، امام مالک کی تالیف ہے اور صحیح بخاری امام بخاری کی تالیف ہے اور صحیح مسلم امام مسلم کی تالیف۔ جس طرح گلستان شیخ سعدی کی تصنیف ہے۔ اور دیوان حافظ خواجہ شمس الدین محمد شیرازی کا دیوان ہے اور شاہنامہ فردوسی کا کارنامہ ہے۔ اس سے زیادہ موطا، و بخاری و مسلم کے تواتر کی اہمیت نہیں۔ اس تواتر سے ان کتابوں کی حدیثیں متواتر نہیں سمجھی جا سکتیں اور نہ کسی محدث نے ان کتابوں کی حدیثوں کو ان کتابوں کے بالیقین تواتر کی وجہ سے متواتر سمجھا اور نہ کوئی صاحب عقل سمجھ سکتا ہے۔

قرآن مجید کا تواتر جیسے جیسے قرآن کی آیتیں، سورتیں، اترتی گئیں، لکھنے والے لکھتے گئے۔ یاد کرنے والے یاد کرتے گئے پڑھنے والے پڑھتے گئے۔ اور پڑھانے والے پڑھاتے گئے۔ نمازوں میں رسول صلعم سے سنتے رہے۔ خود پڑھتے رہے۔ زبانی پڑھتے رہے مصاحف میں دیکھ کر تلاوت کرتے رہے، آپس میں دَور کرتے رہے' اس طرح ہر آیت کے ہر جملے۔ ہر کلمے ہر لفظ ہر حرکت ہر سکون اور ہر نقطے کا تواتر سماعاً۔ تعلیماً۔ تعلّماً۔ قراءۃً۔ تلاوۃً۔ حفظاً اور کتابۃً۔ آغاز نزول قرآن سے آخری آیت کے نزول تک ساتوں طریقے سے پوری سرگرمی کے ساتھ جہاں جہاں کوئی مسلم تھا ہر مسلم گھر میں ہر مرد ہر عورت ہر لڑکا اور ہر لڑکی کے ذریعے سے شروع ہوا تو پھر نہ فقط عہد نبوی تک بلکہ عہد خلفائے راشدین تک بلکہ عہد بنو امیہ تک بلکہ عہد بنو عباس تک بلکہ آج تک تواتر کا وہ ساتوں مذکورہ بالا سلسلہ ہر سچے مسلم گھر میں قائم اور جاری ہے۔ کیا اس پونے چودہ سو برس کے اندر کوئی ایسا دن کوئی عاقل منصف چاہے کسی مذہب کا بھی ہو تصور بھی کر سکتا ہے جس دن دنیائے اسلام میں قرآن کی تلاوت یا قراءت یا تعلیم کسی مسلمان نے نہ کی ہوگی؟ دن نہیں بلکہ کوئی ساعت بھی ایسی تصور کی جا سکتی ہے؟ جس میں کہیں بھی کوئی مسلمان قرآن پڑھ نہ رہا ہو یا لکھ نہ رہا ہو یا حفظ نہ کر رہا ہو یا سن نہ رہا ہو۔؟ مذکورہ بالا سات طرق تواتر تو عہد نبوی سے مسلسل آج تک چلے آ رہے ہیں۔ درمیان میں جب سے طباعت کا فن عام ہوا ہے اس وقت سے قرآن مجید کی طباعت کے تواتر کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا ہے

تواتر زمانی کو بھی دیکھئے۔ جس وقت جس آیت یا جس صورت کا نزول ہوا اسی وقت سے اس کے تواتر کا بھی آغاز ہو گیا اور پھر ایک غیر منتہم طریقے سے بڑھتا اور پھیلتا چلا گیا۔ اسی طرح تواتر مکانی کو دیکھئے۔ جو حصہ قرآن مکہ معظمہ میں اترا اس کا تواتر مکہ ہی سے شروع ہوا۔ جو حصہ مدینہ منورہ میں اترا اس کا تواتر مدینہ منورہ ہی سے شروع ہوا۔ اور پھر شروع ہوا تو بڑھتا اور پھیلتا چلا۔ یہاں تک کہ ساری دنیائے اسلام پر چھا گیا۔

تواتر مسند و تواتر مسند الیہ و تواتر اسناد کے متعلق کچھ لکھنا ہی فضول ہے۔ غیر مسلمین بھی جانتے ہیں کہ آج سے چودہ سو برس قبل سرزمین عرب کے شہر مکہ میں محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ایک شخص تھے جن کا یہ دعویٰ تھا کہ میں اللہ کا نبی و رسول ہوں اور مجھ پر یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے اترا ہے اور یہ قرآن وہی کتاب ہے جو اس وقت سے اس وقت تک مسلسل مسلمانوں میں چلی آ رہی ہے اور ہر مسلم گھر میں موجود ہے اور ہر مسلمان اس کو کم و بیش روزانہ تلاوت کرتا رہتا ہے پڑھتا رہتا ہے۔ عورتیں پڑھتی ہیں مرد پڑھتے ہیں لڑکے اور لڑکیاں بوڑھے اور جوان سب پڑھتے ہیں، یہاں تک کہ اندھے لوگ بھی اپنے ایمانی جوش میں پورا قرآن زبانی سیکھ سیکھ کر حفظ کر لیتے ہیں۔

کیا دنیا ایسے مکمل اور زبردست تواتر کی کوئی اور دوسری مثال پیش کر سکتی ہے؟ لا واللہ! قیامت تک نہیں پیش کر سکتی۔ یہ ہے وہ تواتر جو قرآنی لَا رَیْبِیَتَ کی ایک معجز نما دلیل قاطع اور برہان ساطع ہے۔ کہاں ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ "قرآن ہی کی طرح تو متواتر حدیثیں بھی ہیں" کوئی کہتا ہے کہ "ہم کو جس طرح اور جن لوگوں سے قرآن ملا ہے اسی طرح انہیں لوگوں سے حدیثیں بھی ملی ہیں" حالانکہ موطا کی حدیثیں ہمیں صرف امام مالکؒ سے ملیں۔ بخاری کی حدیثیں صرف امام بخاری سے اور مسلم کی حدیثیں صرف امام مسلم سے ملی ہیں۔ اگر آج یہ تینوں

کتابیں دنیا سے ناپید ہو جائیں جس طرح صحف ابراہیمی کا اب کہیں وجود نہیں جس طرح تورات کے نسخے یہودیوں سے چھین چھین کر جلا دیئے گئے تھے۔ دنیا میں کہیں تورات کا وجود نہ رہا تھا۔ اور یہودی تورات کے ملنے سے مایوس ہو بیٹھے تھے۔ اسی طرح موطأ و بخاری و مسلم سے سارے مسلمان مایوس ہو بیٹھیں گے۔ مگر قرآن مجید کے سارے چھپے ہوئے اور لکھے ہوئے نسخے اگر ناپید ہو جائیں تو ہر شہر کے سینکڑوں حفاظ بیٹھ کر حرفاً حرفاً اور لفظاً لفظاً پورا قرآن مجید ہر شہر میں لکھوا دیں بلکہ لکھنے والوں کی جماعت جائے گی تو ایک ڈکٹیٹ کرانے والا ایک ہزار کاتبوں سے ہر شہر میں ایک ہزار نسخہ ایک ہفتہ یا عشرہ میں لکھوا کر دے سکتا ہے۔ اور اس طرح ایک مہینے کے اندر دنیائے اسلام میں قرآن مجید کے لاکھوں صحیح نسخے پہلے نسخوں کے بالکل مطابق مہیا ہو جا سکتے ہیں۔ میرا یہ دعویٰ ایسا ہے جس کو مبلغے سے مطلقاً کوئی واسطہ نہیں۔ پورا قرآن ہر صحابی نے رسول صلعم سے پایا جس نے بلاواسطہ رسول سے نہیں پایا اس نے کسی دوسرے صحابی سے پایا پھر ہر صحابی سے ان کے اہل وعیال نے ان کے تلامذہ تابعین سے پایا پھر ہر تابعی سے ان کے شاگردان واتباع نے اور ان کے اہل وعیال نے پایا پھر ہر تبع تابعی سے ان کے اہل وعیال اور شاگردوں نے پایا۔ اس طرح ہر مسلم گھر میں قرآن پہنچتا رہا اور اس وقت تک پہونچ رہا ہے۔ قرآن نہ بقول ابن شہاب زہری حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زید بن ثابت سے ایک مصحف میں مجتمع کرنے کی وجہ سے مسلمانوں کو ملا۔ نہ بقول خطیب نو یسان مساجد حضرت عثمان جامع القرآن کی وجہ سے ملا۔ بلکہ ابن شہاب زہری کی روایت جمع قرآن کے گھڑنے والے عبید بن سباق کی پیدائش جو ۵۰ھ میں ہوئی تھی اس سے چالیس برس پہلے سے قرآن ہر صحابی کے گھر میں کتابی صورت میں مجتمع موجود چلا آ رہا تھا۔ اور ہر صحابی کتاب دیکھ کر پڑھتا تھا۔ اور اپنی عورتوں کو اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کو پڑھاتا تھا۔ کتنے صحابہ مصاحف لکھا کرتے تھے غرض دنیا کے مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیا ہوا قرآن اپنے پاس بطور سرمایہ ایمان رکھتے ہیں صرف حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ یا حضرت عثمان غنی ذوالنورین رضی اللہ عنہ یا صرف زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا دیا ہوا کوئی قرآن ان کے پاس نہیں ہے۔ انہیں قرآن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے پہلے ملا۔ پھر وہی قرآن حضرت صدیق اکبر حضرت فاروق اعظم حضرت ذوالنورین اور حضرت علی المرتضیٰ اور سارے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین اور سارے تابعین رضی اللہ عنہم سے ملتا رہا۔ اور پھر ہر بیٹے کو جو مسلم گھر میں پیدا ہوا اپنے مسلم باپ یا مربی سے ملا اور ہر شاگرد کو اپنے مسلم استاد سے ملا۔ اور ہر نو مسلم کو اپنے ہادی سے ملا۔ اور عہد نبوی سے لے کر آج تک ہر مسلم نے اپنے دوسرے مسلم بھائی کے گھر میں دیکھا۔ ایک شہر سے دوسرے شہر ایک ملک سے دوسرے ملک میں جب کوئی مسلمان پہنچا اور کسی مسلمان کے گھر اترا تو وہاں بھی اس نے وہی قرآن پایا جو اس کے گھر میں موجود ہے۔ اور اس کا سلسلہ بھی پورے تواتر کے ساتھ عہد نبوی سے لیکر آج تک چلا آ رہا ہے اور قیامت تک باقی رہے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

نوٹ:۔ تواتر اچھی باتوں کا بھی ہوا کرتا ہے اور بری باتوں کا بھی۔ دین میں وہی تواتر سند وحجت ہے جس کا آغاز عہد نبوی میں ہوا ہو یا عہد خلفائے راشدین میں۔ مگر اس کی نشان وہی قرآنی آیات میں بعبارۃ النص یا باقتضاء النص یا بدلالۃ النص یا باشارۃ النص کسی طرح بھی کی جا سکتی ہو اور ایسی کوئی

(باقی صفحہ ۲۸ پر)

جناب عطاء اللہ پالوی صاحب

سورۂ یوسفؑ سے عملی سبق

دنیا نے فسانوں کو بخشی افسردہ حقائق کی تلخی
اور ہم نے حقائق کے نقشے میں رنگ بھرا افسانوں کا (جوشؔ)

اخلاقی و معاشرتی خرابی اور معاشی و اقتصادی بدحالی کا واحد علاج کبھی "نظامِ اسلام" میں سمجھا جاتا تھا۔ مگر آج "روسی نظام" میں سمجھا جا رہا ہے۔ جس کو روکنے کے لئے کچھ دن ہوئے دنیا کے سب سے بڑے "مادہ پرست" مسٹر ٹرومین نے یورپ و امریکہ کے تمام سرمایہ دارانہ نظام رکھنے والے ملکوں کو دعوت دی تھی کہ سب لوگ اجتماعی طور پر اس کا مقابلہ کریں۔ چنانچہ اس دعوت کا ظہور "معاہدۂ اوقیانوس" "دفاعی معاہدۂ بحرالکاہل" اور "اٹلانٹک چارٹر" وغیرہ کی صورت میں ہوا۔ مگر جب برطانیہ کے ایک نکتہ رس مدبر نے یہ بیان دیا کہ "کمیونزم" کا مقابلہ معاہدہ اور طاقت سے نہیں بلکہ کسی نئے نظام کے رواج سے البتہ کیا جا سکتا ہے تو "روحانیت" کے سب سے بڑے علمبردار پوپ اعظم نے اٹلی سے عیسائی دنیا کے نام ایک ہدایت نامہ جاری کیا کہ سارے عیسائی ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر کمیونزم کے مادی نظام کو شکست دینے کا روحانی پروگرام مرتب کریں۔ گویا "گفتار" میں تو سب ہم رائے ہیں کہ کچھ کیا جائے مگر "کردار" کا حوصلہ کسی کو بھی نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ سارے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ دنیا میں اگر کچھ بھی کیا جا سکتا ہے یا ہو سکتا ہے تو اجتماعی کوشش سے "انفرادی جد و جہد" سے نہیں۔ بہ الفاظ دیگر سبھوں کے نزدیک "اجتماعیت" ہی سب کچھ ہے "انفرادیت" کوئی چیز ہی نہیں۔ کمال یہ ہے کہ یورپ و امریکہ کی اس ہرزہ سرائی کے مسلمان بھی شکار ہو گئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جب تک مسلمانوں کی "اجتماعیت" بروئے کار نہیں آتی اس وقت تک "انفرادیت" کچھ بھی نہیں کر سکتی، اور چونکہ ایسا قیامت تک نہ ہو گا لہذا مسلمان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ حالانکہ

بقیہ صفحہ ۲۷ ۔ چیز دین اسلام میں نہیں ہے جس کا تعامل عہد نبوی یا عہد خلفائے راشدین سے تواتر کے ساتھ چلا آ رہا ہو اور اسکی نشاندہی قرآنی آیات سے نہ کی جا سکتی ہو البتہ بہتیری چیزیں بعد کو بعض مبتدعین نے پیدا کیں اور پھر رفتہ رفتہ انکا تعامل اتنا بڑھا کہ مسلمانوں کی اکثریت ان پر کاربند نظر آ رہی ہے۔ عوام تو عوام ہیں خواص بھی اس میں مبتلا نظر آ رہے ہیں۔ اگلوں نے ان چیزوں کے اختراع کے وقت ان کو جائز ثابت کرنے کیلئے کچھ داستانیں بھی بنا رکھی تھیں جن کو بعد کے علماء ثبوت میں پیش کیا کرتے ہیں مگر ان کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ ان پر تواتر عملی بہت بعد کو شروع ہوا۔ قرون اولیٰ میں ان پر تعامل نہ تھا۔ ایسی مشتبہ چیزیں جن کے تواتر عملی کے سلسلے کا سرا نہ ملے کہ کب سے اس کا آغاز ہوا۔ ایسا تواتر دین میں کوئی حجت و سند نہیں۔

اقبالؒ عرصہ ہوا مسلمانوں کو مخاطب کر چکا ہے کہ :۔

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلمان · اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار

آئیے اے مسلم نوجوانو! میں آپ کو ایک نوجوان کی کہانی سناتا ہوں جس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ "فرد" کی تنہا کوشش اور ذاتی جدوجہد بھی "قوم" کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ نیز اس کہانی سے آپ کو یہ بھی اندازہ ہو جائیگا کہ :۔

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی · ہو جس کے جوانوں کی خودی صورت فولاد (اقبالؒ)

نیز اس کہانی سے آپ کو کسی قدر یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ قرآن میں قصے فضول نہیں بیان ہوئے ہیں یا پیغمبروں کا ذکر خواہ مخواہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس میں سینکڑوں نکتے پنہاں ہیں جن کی طرف مسلمان مطلقاً توجہ نہیں کرتے۔ کیسے کریں؟

صوفیان مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق

خونیان میکدہ کم طلب و تہی کدو (اقبالؒ)

۲

دنیا میں اس وقت تک جس قدر بھی معلوم عظیم شخصیتیں گذری ہیں ان کی سوانح عمری بتاتی ہے کہ انہوں نے عموماً اکابرین عالم کے حالات و قصص پڑھنے اور جاننے کی کوشش کی تھی انہوں نے برابر دنیا کے بڑے بڑے لوگوں کی سوانح حیات کا مطالعہ کر کے اس سے سبق لیا تھا اور نتیجتاً وہ دنیا میں نئی نئی تاریخ بنا گئے اور پردہ زمین پر اپنا نام زندہ چھوڑ گئے۔ اس لئے میں آپ کو وہ کہانی سنا رہا ہوں جس کا ہیرو وہ نوجوان ہے جو خود ایک ملک میں غلام کی حیثیت سے داخل ہوا تھا۔ مگر پھر وہ محض اپنی انفرادی صلاحیتوں کے سبب اس ملک کا حکمران بن گیا تھا۔ اور پھر اس نے اپنی قوم کو بھی اس ملک میں بلا کے حکمرانی کی حلاوتوں سے شاد کام کرایا تھا۔ بہ الفاظ دیگر یہ کہانی اس نوجوان کی ہے جس نے تنہا اپنی صلاحیتوں کی بدولت اپنی قوم کو مصر میں داخل کر کے حکمرانی کی لذتوں سے بہرہ ور کیا تھا مگر یہ قطعی طور پر واضح رہے کہ یہ ادھر ادھر کی گپ نہیں بلکہ تاریخی قصہ ہے اور کونسی تاریخ سے ماخوذ؟ ایک ایسی تاریخ سے جس کے بارے میں تاریخ والوں ہی کا اعتراف نہیں بلکہ خود مؤرخ کا بھی دعویٰ ہے

مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ

"یہ کوئی من گھڑت قصہ نہیں، بلکہ اس کتاب سے ماخوذ ہے جو سابقہ کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے اور ہر بات کی تفصیل بیان کرنے والی ہے اور ان لوگوں کیلئے ذریعہ ہدایت و رحمت ہے جو یقین کریں"

اور یہ کہانی وہ ہے جس کے متعلق پڑھنے والوں ہی کا خیال اچھا نہیں بلکہ خود مصنف کا قول ہے کہ یہ "احسن القصص" ہے۔ کیا مطلب؟ یعنی بہت ہی عمدہ قصہ اور نہایت خوبصورت کہانی ہے اور واقعی عمدہ اور خوبصورت ہے بھی۔ اتنی ہی عمدہ اور خوبصورت کہ اس کہانی کی "ہیروئن" کا نہیں بلکہ "ہیرو" کا حسن و جمال ہمیشہ ہمارے حسن پرست مولوی کی گرمیٔ محفل کا ایک ایسا موضوع رہا ہے جس پر یہ جھگڑ جھگڑ بیٹھے ہیں اور اپنی بات منوانے کے سلسلے میں دست و گریباں ہو ہو گئے ہیں۔ اور اگر آج بھی وہ سماں دیکھنا ہو تو ان کے سامنے اس موضوع کو :۔

اِک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے ؟

ہم مسلمان بھی خوب ہیں۔ بیلن کی قوم کے اکابرین نے اس کے حسن کو اہمیت دی تھی تو محاصرہ ترائے عمل میں آیا تھا اور نتیجتاً تاریخ بدل گئی تھی۔ قوم کی قسمت پلٹ گئی تھی۔ مگر یوسف کے دلدادہ جمال اصحاب اس مسئلہ کو کافی اہم بنا کے ایک جوں بھی نہ مار سکے۔ گو آسمان وہی ہے زمین وہی اور انسان وہی۔ ٹھیک کہا تھا اقبال نے کہ :- ؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن　　ملّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں　　کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

بہرکیف ! تو آیئے آج :-

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ

"ہم آپ سے ایک بڑا اچھا قصہ بیان کرتے ہیں جو آپ کی طرف قرآن کے ذریعہ وحی کیا گیا ہے اور یقیناً آپ اب سے پہلے اس سے ناواقف تھے"

مگر پھر سن لیجئے کہ یہ دل لگی نہیں ہے کہ سنیئے اور ٹال دیجئے بلکہ یہ ایک مستند تعلیم اور مستقل سبق ہے۔ یہ دل بہلاؤ خرافاتی افسانہ نہیں کہ ان سنا کر دیجئے بلکہ یہ ایک ٹھوس حقیقت اور بصیرت افروز درس ہے -

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ ...... اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ　　" واقعی یوسف کے قصہ میں ... سبق ہے ان کے لئے جو سوال کریں "

(۳)

بڑا بننے کی خواہش اور عظیم مرتبہ کی تمنا تو ہر دل میں کروٹیں لیا کرتی ہے مگر اس کے لئے کچھ سعی و کوشش اور جہد و عمل یا اس کے لئے اعلیٰ صلاحیتیں اور علمی قابلیتیں پیدا کرنے کا شوق شاذ و نادر ہی لوگوں کو ہوا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہونہار لوگوں کو دیکھ کر سب ہمیشہ جلتے رہتے ہیں۔ اور ایسے لوگوں نے ذاتی اغراض کے ماتحت ہر جوہر قابل کی برابر حوصلہ شکنی کی ہے۔ یوسف میں ہونہاری کے آثار نظر آئے تو ان کے سوتیلے بھائی خار کھانے لگے اور انہوں نے اس نوخیز کانٹے کو اپنے دامن سے جلد ہی نکال ڈالنے کیلئے متفقہ طور پر سازش شروع کر دی اور ایک دن ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق باپ کو بہلا پھسلا کے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ تفریح کیلئے وہ یوسف کو بھی ان بھائیوں کے ساتھ باہر جانے دیں۔ چنانچہ انہوں نے یوسف کو ساتھ لیجا کے ایک عمیق و تاریک خشک کنوئیں میں دھنسا دیا اور شام کو یوسف کی خون آلود قمیص کے ساتھ آہ و زاری کرتے ہوئے گھر واپس لوٹے اور باپ کو خبر دی کہ یوسف کو ایک بھیڑیئے نے پھاڑ کھایا۔ ہر سازش بالخصوص جب کہ بے سمجھ لوگوں نے کی ہے پکڑی گئی ہے آدمی کو بھیڑیا پھاڑ کھلئے اور قمیص خون آلود تو ہو جائے مگر سالم رہے یہ ناممکن بات تھی۔ لہذا روشن ضمیر یعقوب ؑ نے قمیص کا معائنہ کر کے جواب دیا کہ :-

بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ　　" یہ تمہاری من گھڑت فسانہ طرازی ہے مگر خیر میں صبر کروں گا "

دنیا میں ہونہاروں اور آگے بڑھنے والوں کو مختلف قسم کی دقتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ انہیں طرح طرح کی الجھنوں اور صعوبتوں سے سابقہ پڑا ہی کرتا ہے مگر وہ کبھی ہمت نہیں ہارا کرتے۔ وہ خارجی رکاوٹوں کو خاطر میں نہیں لایا کرتے یہاں تک کہ ان کی ہمت و استقامت دیکھ کر قدرت بھی ان کے سامنے جھک جایا کرتی ہے یوسف کو کنوئیں میں گرے ہوئے کچھ زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ یکایک

جَاءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ "ایک قافلہ ادھر سے گذرا اور انہوں نے ایک آدمی کو کنوئیں سے

فَأَدْلَىٰ دَلْوَهُ پانی کو بھیجا جس نے پہنچکر کنوئیں میں ڈول ڈال دیا"

قدرت ہر انسان کو اس کی زندگی کی مختلف منزلوں میں فائدے اٹھانے کیلئے مواقع ضرور دیا کرتی ہے۔ عاقل تو اس سے فائدہ اٹھاکے کامیابی کی کچھ منزلیں طے کر لیتے ہیں۔ مگر احمق چوک جایا کرتے ہیں۔ یوسف نے کنوئیں میں ڈول دیکھا تو فوراً ذہن میں بات آگئی کہ کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ چنانچہ وہ ڈول میں بیٹھ گئے اور اس طرح اوپر چڑھ آئے۔ سقے نے ڈول میں پانی کے بجائے یوسف کو پایا تو چلانے لگا:۔

يَا بُشْرَىٰ هَٰذَا غُلَامٌ "لو مبارک ہو۔ یہاں تو ایک لڑکا مل گیا"

سرمایہ دارانہ ذہنیت کا بُرا ہو کہ وہ انسان کو انسان سمجھنے ہی نہیں دیتی۔ وہ اخلاقی مسائل میں بھی مادی منافع بازی سے کبھی باز نہیں آتی۔ وہ سلوک و خیرات تک میں ذاتی فائدے کو مدنظر رکھتی ہے۔ قافلے والے تاجر اس خورد سال ننگے لڑکے پر رحم کھاکے اس کو چھوڑ کیا دیتے کہ انہوں نے بلیک مارکٹنگ کیلئے:۔

أَسَرُّوهُ بِضَاعَةً "اس کو ایک مال سمجھ کر چھپا لیا"

اور پھر بے وقوفوں نے مصر سے گذرتے ہوئے یوسف کو عزیز مصر کے ہاتھ:۔

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ "قدر و قیمت سے ناواقف ہونے کے سبب ان کو بہت کم

وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ۔ قیمت میں تھوڑے منافع کے عوض بیچ ڈالا"

لاولد "عزیز مصر" احمق نہ تھا۔ دنیا کے سب سے بڑے متمدن اور مہذب ملک میں وزارت عظمٰی کی کرسی پر متمکن تھا اور صرف کرسی کا شوقین نہیں بلکہ اہلیت کا بھی حامل تھا۔ لہذا اس نے یوسف کو خریدا تو ایک غلام کی حیثیت سے ضرور مگر صورت دیکھتے ہی تاڑ گیا کہ یہ ایک نعمت ہے۔ چنانچہ بیوی سے کہنے لگا:۔

أَكْرِمِي مَثْوَاهُ عَسَىٰ أَن يَنفَعَنَا "ذرا اس کو سنبھال کے رکھنا بہت ممکن ہے کہ یہ ہمارے کام

أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا آوے یا ہم اس کو بیٹا ہی بنا لیں"

اس طرح یوسف کنوئیں سے نکل کے "عزیز مصر" کے محل میں داخل ہو گئے اور اس طور پر فلسطینی لڑکا مصری وزیر اعظم کے

قصر میں رہ کر تعلیم و تربیت پانے لگا۔ اپنوں کا مردود، غیروں میں محمود قرار پایا۔ مونی قصر حام سے بر آمد اور صدف خانہ سے جدا ہوا تو کلغی وزارت کی زینت بنا۔ یہاں تک کہ:۔

لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ○ "جب وہ بھرپور جوانی کو پہنچ گئے تو ہم نے ان کو فرمانروائی کے ڈھنگ سکھائے۔ اور علم سے نوازا۔ اور ہم محسنین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں"

"جوانی" انسانی زندگی کے اس حسین سے اور رنگین دور حیات کا نام ہے جس میں پہنچکر ایک مرد سجاوٹ اور سجیلا پن کے سبب مجسم رعنائی و زیبائی ہوجاتا ہے، چالاکی و طراری اور موزونیت و خوش نمائی کے سبب سارے لوگوں کی آنکھوں کا تارا بن جاتا ہے۔ اس وقت ایک مرد مختار و مالک ہوتا ہے کہ چاہے تو "مہکتے ہوئے شبستان عشرت" میں مہوش نازنینوں کے ساتھ "لطف عیش" اٹھائے۔ یا "مہکتی ہوئی وادی جنگ" میں نبرد آزما سورماؤں کے ہمراہ "داد شجاعت" دے۔ چاہے تو "خلوت" میں "بستر شکن" کہلانا پسند کرے۔ یا "جلوت" میں "صف شکن" بننا قبول کرے۔ مگر بسٹری بتاتی ہے کہ اب تک جتنے لوگ تاریخ کو بدل ڈالنے والے ہوئے ہیں وہ اس وقت عورت کے جال اور حسن کے جنجال میں نہیں پھنسے ہیں، انہوں نے اپنی جوانی کو عورت کا ملازمہ نہیں بلکہ قوم کی امانت سمجھا ہے۔ انہوں نے عہد شباب کی عارضی مسرتوں کو ٹھکرایا تو ابدی ناموری حاصل کی ہے۔ چنانچہ جوان ہونے پر یوسف کو بھی یہ مرحلہ پیش آیا اور بڑے صبر آزما انداز سے پیش آیا:۔

رَاوَدَتْهُ الَّتِیْ هُوَ فِیْ بَیْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ "جس کے گھر میں تھے وہی اپنا مطلب نکالنے کیلئے یوسف کو بہلانے پھسلانے لگی"

قوم کی معاشرت اور اخلاقی حالت جب خراب ہوجاتی ہے تو یہی ہوتا ہے اور اس کی ابتدا امراہی کے گھر سے ہوتی ہے۔ چنانچہ یہاں بھی وہی ہوا جو برابر ہوتا آیا ہے۔ "عزیز مصر کی بیوی نے ایک دن تو اس رنگین" ڈرامہ کا آخری سین تک کھیل دیا۔

غَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَ قَالَتْ هَیْتَ لَكَ "مکان کے سارے دروازے بند کرکے کہنے لگی کہ آجاؤ تم ہی سے کہتی ہوں"

حسن و جوانی، سکون و تنہائی۔ اور دعوت و طلب سب کی یکجائی ہوگئی تھی۔ معمولی کیریکٹر کا کوئی نوجوان ہوتا تو اس موقع پر سحر نگار میلز مصر علی کے اس فلسفہ جوانی کو عملی زندگی بخش دیتا کہ:۔

"اگر کوئی حسین عورت بچ کے نکل جائے تو اس کا اتنا نقصان نہیں ہوتا جس قدر کہ اپنا ہے"

مگر معلوم ہے کہ یوسف نے جس کو دنیا میں بڑا بننا تھا اس وقت کیا کیا؟ یہ کہتے ہوئے اس نے راہ گریز اختیار کی کہ:۔

مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ○ "خدا کی پناہ وہ میرا مربی اور محسن ہے جس نے مجھ کو ایسی اچھی طرح رکھا۔ کیا میں محسن کشی کروں ایسے حق فراموشوں کو کبھی فلاح نہیں ہوسکتی"

"عزیز مصر کی بیوی" یہ نامراد جواب سنکر اور مایوس کن دلیرہ دیکھ کر جارحانہ اقدام پر اتر آئی اور اس نے یوسف کو اپنی گرفت میں لینا چاہا

یوسف مدافعانہ جنگ پر بھی راضی نہ ہوئے۔ یہاں تک کہ بھاگ دوڑ پکڑ دھکڑ اور ہاتھاپائی کی نوبت آگئی۔ مگر اس دست درازی کا معلوم ہے کیا حشر ہوا؛ شمع نہیں بجھی بلکہ فانوس ہی چٹک گیا۔ کلی نہیں مسلی گئی بلکہ گلچین ہی کچلا گیا۔ عورت کی چولی نہیں مسلی بلکہ مرد ہی کا کرتہ پھٹ گیا۔ اور جب اس ہنگامہ کے بعد دروازہ کھلا تو دونوں نے دیکھا کہ عزیز مصر کھڑا ہے۔ یوسف کا تو دیکھتے ہی رنگ فق اور خون خشک ہو گیا کہ جانے "عزیز" کیا سمجھے۔ اور زلیخا دہائی دینے لگی کہ :-

مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا "کیا سزا ہے اس کی جو تمہاری بیوی کے ساتھ بدکاری کا ارادہ کرے؟"

انسان کا جو بھی کیرکٹر ہو وہ کبھی مخفی نہیں رہتا اور نہیں رہ سکتا۔ بداخلاقی ڈھانکنے چھپانے سے کبھی پوشیدہ نہیں رہتی اور نہیں رہ سکتی۔ لہذا عدالتی انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ بلا مروت و رعایت اور بغیر لحاظ عزت و امارت۔ غیر جانبدارانہ انداز سے ہر جرم کی تحقیق کی جائے۔ حقیقت حال کو جاننے کیلئے غور و تامل اور تفحص و جستجو سے کام لیا جائے اور تب فیصلہ کیا جائے۔ چنانچہ "عزیز مصر" نے ایسا ہی کیا۔ ایک فریق تو اس کی منظور نظر امیر بیوی تھی اور دوسرا فریق اس کا ایک خرید کردہ و پروردہ غلام۔ مگر اس نے انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اور وقتی طور پر کوئی جذباتی فیصلہ کرنے کے بجائے اس نے فکر و تامل سے کام لیا۔ صلاح و مشورہ اور داخلی و خارجی ثبوت و شہادت کے بعد بالآخر وہ بات کی تہ کو پہنچ گیا مگر مدتوں تمدن و معاشرت کی اس لازمی علت کے سبب جو انسان کو بے غیرت بنا دیتی ہے اسے بجز اس کے اور کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ معاملہ کو رفت گذشت کر دے۔ چنانچہ کہنے لگا کہ :-

يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ "اے یوسف؛ اب اس بات کو جانے دو۔ اور اے عورت! تو
اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ اپنے قصور کی معافی چاہ کہ بیشک سراسر تو ہی قصوروار ہے۔"

بظاہر تو معاملہ ٹل گیا اور بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر خلق کو حلق ہے۔ یوں تو مصر کی سب ہی عورتیں یوسف پر جان دیتی تھیں۔ مگر اس واقعہ نے دوسری عورتوں کو زلیخا کا مذاق اڑانے کا موقع دیدیا۔ چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ عزیز کی بیوی غلام پر مرتی ہے۔ گھروں کے اندر مضحکہ اڑایا جانے لگا کہ پھر بھی تو تھی ٹکر لیجا نہ سکی۔ جب زلیخا نے یہ طنز سنا تو اس نے ان عورتوں کو بھی یوسف کے آزمانے اور امتحان پارسائی لینے کا ایک موقع دیا مگر ان کی بھی ناوک فگنی کے سارے داؤں پیچ خالی گئے۔ ساری مکارانہ عشوہ طرازیاں بیکار محض ثابت ہوئیں اور بالآخر سب ہی کو یہ ہی کہنے اور ماننے پڑی کہ :-

حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ "خدا کی قسم یہ انسان کاہے کو ہے بلکہ ایک مقدس فرشتہ ہے!"

مگر ان ہنگاموں نے کچھ ایسی سماجی پیچیدگیاں پیدا کر دیں کہ ملکی سیاست اور وقتی تقاضے کی مصلحت یہی نظر آئی کہ یوسف کو کچھ دنوں کے لئے جیل میں بند کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ حق و باطل کے معرکہ میں ابتداً باطل ہی کی وقتی کامیابی ہوتی معلوم ہوا کرتی ہے اور

ص۲ چٹک کے معنی "کمر کا جھٹکا" ہے۔ یہاں اس کا استعمال سمجھ میں نہیں آیا (مدیر)

دنیا کے جتنے بڑے لوگ ہوئے ہیں وہ بالعموم کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی بہانے ضرور محصور و محبوس ہوتے ہیں اور قدرت نے ان کی قوت ارادی کو مضبوط تر کرنے کیلئے ہمیشہ اور برابر یہی محفوظ و مامون مقام چنا اور تجویز کیا ہے۔ یوسف نے جیل میں پہنچکر رشد و ہدایت شروع کر دی اور فرصت کے لمحوں میں وہ لوگوں کے خوابوں کی تعبیریں بتانے لگے۔ یہاں تک کہ دو شخصوں نے جو شاہی ملازم تھے اور کسی عتاب کی بنا پر مقید تھے۔ دو فرضی خواب سنائے۔ یوسف نے تعبیر بتاتے ہوئے سچا فیصلہ کر دیا ایک مقتول ہوگا اور دوسرا آزاد۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔
اتفاقاً چند دنوں کے بعد ایک رات فرعون مصر نے ایک خواب دیکھا کہ اناج کی سات بالیں خشک اور سات سبز ہیں اور سات دبلی گائیں ہیں جو سات موٹی گائوں کو نگل گئی ہیں۔ بیدار ہونے کے بعد فرعون مصر پریشان ہوا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ اس خواب کی تعبیر کیا ہو سکتی ہے؟ امراء سلطنت عقلاء دربار اور حکماء مصر بھی اس معمے کو حل کرنے سے معذور و مجبور رہے۔ اس پریشانی کے دوران میں اس شاہی ملازم کو اپنے جیل کے غمخوار و ہشیار ساتھی اور معبّر یوسف کا خیال آیا، بادشاہ کی اجازت لے کر اس نے جیل میں پہنچکر یوسف سے شاہی خواب بیان کر کے اس کی تعبیر پوچھی۔ بے نفس یوسف نے نہ صرف تعبیر ہی سنا دی بلکہ قوم و ملک کو آنے والی ہولناک مصیبت سے چھٹکارا پانے کی ترکیب بھی بتا دی کہ ادھر کے سات سالوں میں متواتر خوب غلہ پیدا کر دو کیونکہ بعد کے آنے والے سات سالوں میں بڑا خوفناک قحط پڑنے والا ہے۔ شہنشاہ مصر کو جب یوسف کی بتائی ہوئی یہ تعبیر و تدبیر سنائی گئی تو اسے اس محبوس انسان میں عقل و دانائی کی ایک دنیا پوشیدہ نظر آئی۔ چنانچہ اس نے یوسف کو فوراً اپنے سامنے لانے کا حکم دیا۔ چالاک حکمران دور اندیش فرمانروا اور ہوشمند ارباب سلطنت سراسر خود رائی کو راہ نہیں دیا کرتے محض اپنے ہی کو عقلمند نہیں سمجھا کرتے۔ اور صرف اپنے ماحول پر ہی اعتماد نہیں کیا کرتے بلکہ وہ اہم ملکی مسائل اور مشکل انتظامی معاملات میں دوسرے قابل اور اہل افراد سے بھی صلاح و مشورہ کر لینے میں کوئی شرم و عار نہیں محسوس کیا کرتے۔ چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ بہرحال! یوسف نے اس نئے فرحت بخش حکم سے باخبر ہو کر بھی اپنی خودداری کو مجروح نہ ہونے دیا۔ مخلصی سے پہلے اپنی برأت اور بے گناہی کی تصدیق چاہی۔ چنانچہ شہنشاہ مصر نے ان عورتوں سے پوچھا تاچھ اور پھر خود زلیخا نے بھی از خود اقرار کر لیا کہ یوسف بے قصور ہے۔ جو انسان اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھتا اسے ایسی ہی ذلت آگیں شکست ہوا کرتی ہے۔ اس مقدمہ کی سماعت کے بعد بادشاہ کی نگاہ میں یوسف کی اور بھی قدر بڑھ گئی اور اس نے یہ اندازہ کر کے کہ یوسف عجیب و غریب انسان ہے حکم دیدیا کہ اس کو با احترام رہا کر کے جلد سے جلد میرے سامنے حاضر کیا جائے اس لئے کہ :۔

اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ "میں اس کو خاص اپنا مشیر اور صلاح کار بناؤں گا"

چنانچہ جب یوسف حاضر دربار ہوئے تو بادشاہ مصر نے ان سے ضروری مسائل اور اہم ملکی معاملات پر تبادلۂ خیال کیا اور آخر میں مطمئن ہو کر اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ :۔

اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ۝ "تم آج ہمارے نزدیک بہت ہی معزز ہو اور ہم تم کو امانت دار مانتے ہیں"

غلام و غریب الوطن یوسف نے جب یہ خسروانہ التفات و عنایت اور شاہی نوازش و کرم بخشی دیکھی تو بنی نوع انسان کیلئے اپنی خدمات بھی پیش کر دیں اور واضح لفظوں میں کہدیا کہ :۔

اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ ۝ "مجھے ملکی خزائن پر مامور کر دیجئے۔ میں محافظ و واقف کار ثابت ہوں گا۔"

شہنشاہ مصر بھی تو چاہتا تھا چنانچہ اس نے فوراً منظور کر لیا۔ جو قومیں ترقی کرنے والی ہوتی ہیں وہ انتظام کی بہتری کیلئے غیر ملکی جوہر قابل کو بھی ملکی خدمات سپرد اور ریاستی انتظام تفویض کرنے میں ذرا جھجکتی اور گھبراتی نہیں۔ اور ارباب سلطنت کی اہلیت کا ثبوت بھی ہے کہ وہ اہل افراد کو منتخب کر کے انتظامی امور ان کے حوالے کریں۔ چنانچہ یوسف نے وزارت غلہ کا چارج لے لیا اور اب یوسف خود عزیز مصر ہو گئے

کَذٰلِکَ مَکَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ "اور اس طور پر ہم نے یوسف کو ملک میں صاحب اختیار بنا دیا۔"

اللہ اللہ۔ حراست چاہ سے نکلے تو "عزیز مصر" کی حرم سرا میں جگہ پائی۔ اور حصار زنداں سے نکلے تو عرش حکومت پر جا بیٹھے۔ یہ ہے جہد و عمل کا ثمرہ۔ یہ ہے سعی و محنت کا صلہ اور یہ ہے دیانت و صداقت کا حاصل۔

ہر اک مقام سے آگے گذر گیا مہ نو کمال کس کو میسر ہوا ہے بے تگ و دو؟ (اقبالؔ)

زندگی میں کتنے دشوار گذار مرحلے آئے مگر یوسف نے کیرکٹر کی بلندی اور مسلسل جہد و عمل سے سب کو طے کر لیا اور اس طور پر دیکھئے تو وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئے؟ یہ پیغمبرانہ سیرت آج بھی مستقل درس و سبق بنی ہوئی ہے :۔

نُصِیْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ "ہم جس پر چاہیں اپنی عنایت متوجہ کر دیں اور ہم محسنوں کا اجر تو ضائع کرتے ہی نہیں ہیں۔"

یوسف عہدہ وزارت سنبھالتے اور "عزیز مصر" بنتے ہی مصروف کار ہو گئے اور یہ کام وہی تھا جو انہوں نے تعبیر کے ساتھ بتا دیا تھا۔ حکومت کی ذمہ داری اور خوبی یہی ہے کہ وہ رعایا کی فلاح و بہبود کا پوری مستعدی اور ہوشمندی سے انتظام کرے۔ دیانت داری اور انتظامی صلاحیت کا معیار یہی ہے کہ فراخی کے عہد میں ہی تنگی کے دور کا تشفی بخش بند و بست کیا جائے۔ آرام کے زمانہ میں ہی مصیبت کے ایام کا مناسب انتظام کیا جائے۔ چنانچہ یوسف نے چارج لیتے ہی سات سال بعد آنے والے قحط کے انتظام پر ابھی سے توجہ کی۔ ایک طرف تو تمام مزروعہ زمینوں کو موٹے موٹے ٹکسے زمینداروں سے چھین کر دبلے دبلے محنتی کاشت کاروں کے ساتھ بند و بست کر دیا۔ اور دوسری جانب ذرائع پیداوار کو درست اور کسانوں کو خوش کر کے "زیادہ اگاؤ"[1] کی اسکیم چلائی اور پھر PROCURMENT SYSTEM. جاری کر کے غذائی اجناس کی ذخیرہ سازی شروع کر دی۔ چنانچہ انتظامی قابلیت اور خوش تدبیری سے سات سال تک یہ اسکیم پوری کامیابی کے ساتھ چلتی رہی اور راعی و رعایا دونوں خوش رہے۔ یہاں تک کہ قحط کے دن آ گئے۔ اس خوفناک قحط نے مصر اور آس پاس کے علاقوں کی غذائی حالت بھی تباہ کر دی۔ جب غلہ کی کمیابی نمایاں ہونے لگی تو یوسف نے راشننگ سسٹم جاری کیا اور بلا لحاظ مصری و غیر مصری، امیر و غریب

---

[1] پنجابی سے بگاڑ بنایا گیا ہے۔ (مدیر)

دوست و دشمن۔ بچے بوڑھے اور رشتہ مند و غیر رشتہ مند سب حاضر مانگنے والوں کی ضرورت کے مطابق ایک خاص ناپ اور پیمانہ سے غلہ دیئے جانے کا حکم صادر کر دیا۔ اور اس قاعدہ کی پابندی میں ایسی شدت و سختی برتی کہ جب فلسطین سے خود یوسفؑ کے بھائی "عزیز مصرؑ" کی انسان نوازی اور غرباپروری کا شہرہ سنکر غلہ لینے مصر آئے اور گو وہ تو یوسفؑ کو نہ جانتے تھے اور یوسفؑ نے پہچان لیا تھا لیکن جب انہوں نے خلاف قاعدہ اپنے غیر حاضر سوتیلے بھائی کے حصّہ کا بھی یوسفؑ کا حقیقی بھائی تھا حصہ لینا چاہا تو یوسفؑ نے انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ اپنے اس سوتیلے بھائی کو اب کی مرتبہ ساتھ لاؤ اور اگر تم اسے نہ لائے تو پھر میرے پاس تمہارے لئے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ تم لوگ میری غربا پروری اور مہمان نوازی تو دیکھ ہی رہے ہو پھر اندیشہ کیا ہے؟ چنانچہ بھائیوں نے بھی عہد کیا کہ۔

سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَ اِنَّا لَفَاعِلُوْنَ ہ "ہم اس کے باپ سے اس کو مانگیں گے اور ہم آپ کا حکم ضرور بجالائیں گے"۔

حکومت کی کرسی اور وزارت غلّے کے عہدے پر تھے۔ چاہتے تو بھائیوں بھتیجوں کی کوٹھیاں بھر دیتے۔ ان کو مالا مال اور برسوں کیلئے غلہ کی فکر سے فارغ البال کر دیتے۔ چاہے مصری رعایا بھوکوں مر ہی کیوں نہ جاتی۔ مگر یوسفؑ نے ایسا نہ کیا۔ قاعدے کے بموجب اور قانون کے مطابق وہی کیا جو وہ سب کے ساتھ کرتے تھے۔ ہاں یہ البتہ کیا کہ صلۂ رحمی کی بنا پر بھائیوں نے غلہ کی جو قیمت ادا کی تھی وہ خاموشی کے ساتھ ان کے غلے میں رکھوا دی۔ احسان و سلوک کا معیار کمال یہی ہے کہ کسی کے ساتھ عنایت و مہربانی حتی الامکان اس طرح کی جائے کہ اس کو معلوم نہ ہونے پائے چاہے وہ عزیز بھائی ہو یا کوئی اور۔ بہرحال جب یعقوبؑ کے بیٹے گھر پہنچے اور صورت حال سے واقف ہوئے تو اپنے سوتیلے بھائی کو اب کی مرتبہ ساتھ لیجانے کی انہوں نے پوری شدت سے کوشش شروع کر دی اور موقع پاکر باپ پر اپنے اس خیال کا اظہار کرتے ہوئے "عزیز مصرؑ" کی شرط بھی بیان کر دی نہ صرف اتنا بلکہ اس بھائی کو پھر فلسطین واپس لانے کا حلفیہ وعدہ بھی کیا۔ مگر انسان جب ایک مرتبہ اعتبار کھو دیتا ہے تو پھر اس پر کوئی شخص بھی دوبارہ بھروسہ کرنا نہیں چاہتا چاہے وہ باپ ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ یعقوبؑ نے سنتے ہی جواب دیا کہ:۔

هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ہ

"کیا اس مرتبہ بھی تمہارا ویسا ہی اعتبار کر لوں جیسا اس سے پہلے اسکے بھائی کے سلسلے میں ایک بار تمہارا اعتبار کر چکا ہوں"؟

مگر پھر ایک تو روشن ضمیر یعقوبؑ کو معلوم تھا کہ کسی کی بھی جان انسان کے قبضے میں نہیں بلکہ خدا کے اختیار میں ہے لہٰذا مشیت الٰہی سے گریز ناممکن ہے۔ دوسرے ضرورت مجبور کر رہی تھی کہ غلہ منگوایا جائے اور اب کی مرتبہ بغیر "عزیز مصرؑ" کی شرط پوری کئے ہوئے غلہ ملنا ممکن ہی نہ تھا لہٰذا بالآخر وہ آمادہ ہو گئے اور جب فلسطینی قافلے نے مصر جانے کا ارادہ کیا تو یعقوبؑ نے خدا پر بھروسہ کر کے اس چھوٹے بیٹے کو ان کے بھائیوں کے حوالے کرتے ہوئے غیر ملک کا لحاظ کر کے چند مفید نصیحتیں بھی کر دیں۔ یہ قافلہ جب مصر پہنچکر حاضر دربار ہوا تو یوسفؑ نے موقع نکال کر اپنے بھائی کو چپکے سے بتا دیا کہ "عزیز مصرؑ" کوئی غیر نہیں بلکہ اس کا حقیقی گمشدہ بھائی یوسفؑ ہے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سمجھا دیا کہ سوتیلے بھائیوں کی جا بیجا بدسلوکیوں کا ملال کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ اس مرتبہ بچھڑے

ہوئے بھائیوں کے ملاپ نے بڑا اثر کیا اور یوسفؑ نے خاطر تواضع کے ساتھ بھائیوں کو عرصہ تک مصر میں روک کے رکھا، مگر کب تک ؟ آخر رخصت کرنا ہی پڑا۔ مگر اپنے حقیقی بھائی کو اب اپنے سے جدا کرنا نہ چاہتے تھے اور صریحًا روک لینے سے ایک تو مصری قانون کی صریحًا خلاف ورزی ہوتی تھی۔ دوسرے راز کے کھل جانے کا اندیشہ تھا۔ لہٰذا بھائیوں کے چلتے وقت یوسفؑ ایک تدبیر چلا گئے انہوں نے غلہ ناپنے والے سرکاری پیمانہ کو اپنے حقیقی بھائی کی خرجی میں چپکے سے رکھوا دیا اور جب گمشدگی کے بعد قافلے کی سامان تلاشی ہوئی اور وہ پیمانہ یوسفؑ کے بھائی کے اسباب میں سے نکلا تو مصری قانون کے مطابق ان کو روک لیا گیا تاکہ وہ مصر سے جانے نہ پائیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر سبھوں کو بڑی ندامت ہوئی اور پہلے تو یوسفؑ کے بھائی بہت گرم ہو گئے اور غصہ میں کہہ اٹھے کہ :۔

اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۔ "اگر اس نے چوری کی تو اس سے پہلے اسکا بھائی بھی چوری کر چکا ہے"

مگر پھر سنبھلے اور معاملے کی نزاکت کو سمجھ کر متفکر ہو گئے۔ اور پھر اپنے باپ کی پیرانہ سالی بحالت زار اور چلتے وقت ان کے ساتھ کئے ہوئے وعدہ حلف کا ذکر کرتے ہوئے "عزیز مصر" کو سمجھانے بجھانے لگے۔ شرائط و تجاویز پیش کیں اور بڑی منت خوشامد کی مگر ایک بھی پیش نہ گئی۔ آخر تھک ہار کر آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ اب کیا کیا جائے ؟ بڑے بھائی نے باپ سے دوسری مرتبہ کی بھی وعدہ خلافی کی شرم میں گھر جانے سے ہی انکار کر دیا۔ مجبوراً اور بھائی فلسطین روانہ ہوئے کہ صورت حال سے باپ کو باخبر کر دیا جائے۔ چنانچہ گھر پہنچ کر بیٹوں نے باپ سے من وعن حال کہہ سنایا۔ بچارے سچے تھے مگر ایک مرتبہ اعتبار کھو چکے تھے لہٰذا کاذب سمجھے گئے اور باپ نے وہی کہا جو پہلے کہا تھا۔

بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ "یہ تمہاری دل کی لگائی بات ہے مگر خیر میں اس پر صبر کروں گا۔"

مگر تین بیٹوں کی جدائی کچھ ہنسی ٹھٹھا نہ تھی۔ یہ کوئی ایسا معمولی سانحہ نہ تھا کہ یعقوبؑ آسانی سے برداشت کر جاتے۔ لہٰذا بہت ہی مغموم و ملول ہو گئے اور گو کہنے کو یہ کہہ گئے کہ :۔

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ۔ "اللہ سے امید ہے کہ وہ ان سب ہی کو مجھ سے ملا دے گا۔"

مگر غم سے آنکھیں سفید پڑ گئیں اور دل میں اندر ہی اندر گھٹنے اور کڑھنے لگے۔ تین تین ناسوروں کا رسنا کوئی معمولی بات تھی ؟ کچھ دنوں کے بعد جب پھر غلہ گھٹا اور بیٹوں نے آخری مرتبہ گھر کی باقی بچی کھچی ناقص و ناکارہ پونجی لے کر مصر جانے کا ارادہ کیا تو یعقوب نے بیٹوں کو یہ بھی اشارہ کر دیا کہ یوسف کے بھائی کی جدائی خود یوسف کے بھی مل جانے کا کچھ کچھ پتہ سا دے رہی ہے۔ اس مختصر غیب سے ایک بڑی حضوری کا سراغ سا ملتا ہے۔ یہ نامسعود افتراق ایک محمود اتفاق کا پیش خیمہ سا دکھائی دیتا ہے اور یہ ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر آفتاب بن جانے کی بشارت سی دے رہے ہیں لہٰذا :۔

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ "اے میرے بیٹو! جاؤ تو یوسفؑ اور اس کے بھائی کا بھی ضرور کچھ کھوج لگانا"

چنانچہ یعقوبؑ کے بیٹے مصر کے لئے روانہ ہو گئے مگر شرمسار تھے کیونکہ اس مرتبہ پونجی کم تھی اور بھوک کی شدت پوری۔ سرمایہ

قلیل تھا مگر ضرورت علی حالہٖ قائم تھی کیونکہ اب کے راس المال ناقص تھا اور غلہ کامل چاہتے تھے۔ نقدی نکمی تھی اور اناج کافی لینا تھا چنانچہ مصر پہنچ کے جب حاضر دربار ہوئے اور انہوں نے اپنا ناقص سرمایہ "عزیز مصر" کے سامنے پیش کر کے اپنی پریشان سامانی، خاندان کی خستہ حالی اور محزون و ملول باپ کی پیرانہ سالی کا ذکر کرنے کے بعد بطور خیرات پورا غلہ دیئے جانے کا حکم صادر کرنے کی درخواست کی تو یوسفؑ کو صبر کا یارا نہ رہا۔ ضبط و سکون کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ لہٰذا بھائیوں کے شرمسار ہوئے بغیر واقف ہوجانے کے لئے تجاہل عارفانہ کے ساتھ انہوں نے سوال کیا کہ :۔

هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنْتُمْ جَاهِلُونَ

تم کو یاد ہے وہ کچھ؟ جو تم لوگوں نے جہالت و نادانی کے سبب یوسفؑ اور اس کے بھائی کے معاملے میں کیا ؟"

ان چند لفظوں نے آلِ یعقوبؑ کا دماغ چکرا دیا۔ سب کے سب سناٹے میں آگئے۔ اگلی پچھلی ساری باتیں لاشعور سے شعور میں آگئیں اور انہوں نے بدحواسی کے ساتھ چھوٹتے ہی سوال کیا کہ :۔

أَإِنَّكَ لَأَنْتَ يُوسُفُ

"کیا سچ مچ تم ہی یوسف ہو ؟"

یوسفؑ نے کہا بیشک :۔

أَنَا يُوسُفُ وَهَٰذَا أَخِي قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ

"میں ہی یوسفؑ ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ اللہ نے ہم پر بڑا احسان کیا اور ہم پر ہی کیا موقوف ہے جو شخص بھی گناہوں سے بچتا اور مصیبتوں پر صبر کرتا ہے تو اللہ ایسے محسنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا"۔

یہ سن کر بھائیوں کو اپنی ساری کی ہوئی بدعنوانیوں اور زیادتیوں پر ایسی خجالت و ندامت ہوئی کہ وہ شرم سے کٹ کٹ گئے ان کی نگاہیں نیچی ہوگئیں اور متفقہ طور سے انہوں نے صاف لفظوں میں اعتراف کیا کہ :۔

تَاللَّهِ لَقَدْ آثَرَكَ اللَّهُ عَلَيْنَا وَإِنْ كُنَّا لَخَاطِئِينَ ۔

"بخدا کوئی شک نہیں کہ تم کو اللہ تعالےٰ نے ہم لوگوں پر فضیلت عطا فرمائی اور لاریب ہم خطا وار ہیں "

اتنا ہی کافی تھا۔ اخلاق کا سب سے بڑا فریضہ خطاکاروں کو اس طرح معاف کرنا ہے کہ وہ شرمسار نہ ہوں اور احساس کمتری کے مرض میں ہمیشہ کیلئے مبتلا نہ ہوجائیں۔ بلند کیرکٹر کا انسان گرنے والوں کو فوراً سنبھال لیتا اور اپنے ذاتی قصور واروں کو کمال استغنا اور حوصلہ مندی کے ساتھ معاف کردیا کرتا ہے۔ یوسفؑ کا ظرف دیکھئے انہوں نے فوراً جواب دیا :۔

لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ

"تم پر آج کوئی الزام نہیں۔ تم آج بری الذمہ ہو۔ خدا تمہارے قصور معاف کرے اور وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربانی کرنیوالا ہے"

اور پھر یوسفؑ نے بھائیوں کو حکم دیا کہ :-

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ "تو یہ میری قمیص اور فوراً روانہ ہو جاؤ، اس کو میرے والد کے چہرے پر ڈال دینا۔
اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ان کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی اور اسکے بعد سارے خاندان والوں کو فوراً میرے پاس لے آؤ"

آج بھی وہی باپ ہیں اور وہی بیٹے۔ اس وقت بھی وہی بھائی ہیں اور وہی یوسفؑ، اور اب بھی وہی قمیص ہے اور وہی مقصد۔ یعنی باپ کے پاس جا کے بطور ثبوت و شہادت پیش کرنا، مگر عنوان بدلا ہوا ہے۔ کل ممات کا نمبر تھا آج حیات کی باری ہے۔ کل بیٹے خاتمہ زندگی کی المناک خبر پہنچانے گئے تھے اور آج بقاء حیات کا مژدہ جانفزا دینے جا رہے ہیں، اسی لئے قمیص کا اثر بھی مختلف ہے کل جس کی قمیص نے دیدۂ یعقوب سے خون کی بوندیں برسائی تھیں آج ان ہی آنکھوں میں سرمہ نور لگانے کے لئے بھی اسی کی قمیص جا رہی ہے۔ جو قمیص کل بصارت چھین لینے کا سبب بنی تھی آج وہی قمیص بصارت عطا کرنے کا ذریعہ بننے والی ہے۔ روشن ضمیر یعقوبؑ نے قمیص یوسفؑ کی بو محسوس کر لی اور وہ اپنے خاندان والوں سے کہنے لگے :-

اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ "اگر تم لوگ یہ نہ کہو کہ بڑھا پاگل ہو گیا ہے تو میں کہوں کہ مجھے
لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ۝ یوسفؑ کی بو آ رہی ہے"

خاندان والوں کو کیا معلوم کہ یعقوبؑ وہ کچھ دیکھ اور سن سکتے ہیں جو دوسرے دیکھ اور سن نہیں سکتے تھے! انہوں نے یہ سنکر کہا کہ :-

تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ "خدا کی قسم تم کو تو وہی پرانا خبط ہے"

مگر چند ہی لمحوں میں بوڑھے یعقوبؑ کی عظمت و جلالت ظاہر ہو کے رہی اور یعقوبؑ نے کہا کہ :-

اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ "کیا میں نے یہ نہ کہا تھا تم کو کہ میں اللہ کی طرف سے وہ
مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ کچھ جانتا ہوں جو تم لوگ نہیں جانتے؟"

اور بالآخر اس طرح بنی اسرائیل حکمرانی کی سطوتوں اور شاہانہ شوکتوں کے ساتھ مصر میں داخل ہو گئے۔ فرد واحد کی اعلیٰ ذاتی صلاحیتوں اور ایک اکیلے نوجوان کی پرحوصلہ کوششوں سے پوری قوم کی قوم کی قسمت بدل گئی۔ آج مفلوج قوموں میں "سوچنے" اور "بولنے" والے تو بہت ملیں گے مگر "کرنے" والے شاذ ہی ملیں گے۔ ع

آہ اس راز سے واقف ہے نہ ملّا نہ فقیہہ وحدت افکار کی بے وحدت کردار ہے خام (اقبالؔ)

یہ سب ہو گیا تو اب فلاکت و ہلاکت کی صبر آزما صعوبتوں سے نجات پانے کے شکرانہ میں علم و بصیرت سے زندگی کی کٹھن منزلوں کو بخوبی طے کر لینے کی خوشی میں اور حکومت و شوکت کے حصول کی مسرت میں یوسفؑ نے تخت سلطنت ہی پر جھک کر بارگاہ ایزدی میں عرض کیا :-

رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْکِ وَ عَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ۔

"اے میرے پروردگار! تیرے کس کس احسان کا شکریہ ادا کروں، تو نے مجھے سلطنت عطا فرمائی، تو نے خوابوں کی تعبیریں دینا سکھایا! اے آسمان و زمین کے پیدا کرنے والے! تو ہی میرا کارساز ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ مجھ کو تو دنیا سے مسلمان اٹھانا اور مجھے اپنے خاص نیک بندوں میں شامل کرنا۔"

یہ ہے وہ عبادت، نماز اور بندگی جو خدا کی بارگاہ میں قابل اعتنا ہے ورنہ ہم جاہلوں، کاہلوں، احمقوں اور ناکاروں کی وہ عبادت جو مسجد کی ٹوٹی ہوئی چٹائیوں اور گھر کی چھوٹی ہوئی جانمازوں پر ادا کی جاتی ہے۔ کبھی بھی اس خدا کے یہاں کوئی درجہ قبول حاصل کر سکتی ہے جس نے کاہلی، جہالت اور غلامی کو کبھی گوارا نہیں کیا اور کبھی بھی پسند نہیں کرے گا؟

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے — شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات
یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل — یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردان خود آگاہ و خدا مست — یہ مذہب ملّا و جمادات و نباتات (اقبالؒ)

البیان —"دو ایک غیر اہم سے اختلافات کو چھوڑ کر یہ زندگی بخش مضمون ہمیں بہت پسند آیا۔ واقعی قرآن پاک کو اسی اسلوب سے سمجھنا چاہیئے تاکہ اس کے مطالب ہماری زندگی میں مستقل جگہ پا سکیں۔ ہم محترم صاحب مضمون کے پرخلوص جذبہ تبلیغ سے آئندہ اسی نوع کی قرآنی خدمت کی توقع رکھتے ہیں۔"

ڈاکٹر غلام جیلانی صاحب برق

البیان کے مستقل لکھنے والے

یہ ہے وہ عنوان جس کے نیچے سب سے پہلے میرا نام دیا ہُوا ہے لیکن ستم لے لیجئے جو تقسیم ہند کے بعد (ایک تحریر کے بغیر) "البیان" کے لئے کبھی بھی کچھ لکھا ہو۔ اس میں کلام نہیں کہ میں جب بھی کوئی چیز لکھتا ہوں تو وہ "البیان" کیلئے مخصوص ہوتی ہے لیکن یہاں سوال یہ درپیش ہے کہ آیا ساڑھے پانچ برس کی طویل مدت میں "البیان" کے لئے صرف ایک مقالہ لکھنے والا "مستقل لکھنے والوں" میں شمار ہوگا۔ یا غیر مستقل اور بے قاعدہ مقالہ نگاروں میں؟

نہ لکھنے کی وجوہ | محفل "البیان" سے غیر حاضر رہنے کی کئی وجوہ تھیں۔

اوّل :- کام چوری۔

دوم :- "البیان" کا اپنے "محور" کو چھوڑ کر ذاتیات میں الجھ جانا۔

سوم :- اصلی اور بڑی وجہ موضوع کی نایابی یا کمیابی۔

جو امراض کہ امتِ مسلمہ کو گھن کی طرح کھا رہے ہیں تین ہیں :-

اوّل :- ملّا کا خانقاہی۔ اسلام جس کی بنیادیں وضعی احادیث پر اٹھائی گئی ہیں۔ اس موضوع پر "البیان" اس قدر مواد پیش کر چکا ہے۔ اور یہ خاکسار بھی "دو اسلام" میں اتنا کچھ لکھ چکا ہے کہ اس موضوع پر کچھ اور لکھنا تکرار قبیح سے کم نہیں۔

دوم :- بدکرداری جس کا استیصال اصلاحی مقالوں سے ہو سکتا ہے اور اس موضوع پر حضرت عرشی نے یوں قبضہ جما رکھا ہے اور ان کا اسلوب بیان اس قدر انوکھا، موثر اور دلکش ہوتا ہے کہ کسی اور قلمکار کو اس میدان میں اترنے کی جرأت ہی نہیں ہو سکتی۔ گہر فروشوں کے بازار میں آبگینوں کی دکان لگانے کی حماقت کون کرے۔

سوم :- کائنات سے اعراض۔ ملّا نے کہا کہ کائنات میں فکر کرنا مادہ پرستی ہے (گذشتہ اکتوبر۔ نومبر اور دسمبر میں مولانا محمد طیب قاری، مہتمم دارالعلوم دیوبند نے "دارالعلوم" (رسالہ کا نام) میں بالاقساط "دو قرآن" کی تردید میں ایک مقالہ شائع کیا تھا جس کا ماحصل یہ تھا۔ کہ فکر فی الآفاق مادہ پرستی ہے۔ مسلمان نے سر تسلیم خم کر دیا۔ اور کائنات کی وسیع روح افروز اور حیات انگیز دانشگاہ کو چھوڑ کر خانقاہوں کے خود فراموش اور حیات کش ماحول میں داخل ہو گیا حقائق زندگی کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ سراب کو حقیقت، ظلمت کو نور، خواب کو بیداری اور

موت کو زندگی سمجھ بیٹھا۔ وہ بھول گیا کہ وہ اس زمین میں اللہ کا نائب تھا۔

نائب حق در جہاں بودن خوش است بر عناصر حکمراں بودن خوش است (اقبالؒ)

وہ ارض و سما پہ قاہرانہ تسلط قائم کرنے کیلئے بھیجا گیا تھا۔ وہ برق و باد۔ ماہ و انجم اور اثیر و نور کی تسخیر کیلئے آیا تھا اور اس کا فرض سرکش سیلابوں، گرجتے ہوئے طوفانوں اور دھاڑتے ہوئے سمندروں کا گھمنڈ توڑنا تھا۔ وہ اس سرچشمۂ قوت و ہیبت (کائنات) سے اس قدر بیگانہ ہو گیا کہ اس کی قوت ضعف سے اور اس کی زندگی موت سے بدل گئی۔ قرآن بار بار اپنے پیرؤوں کو دھمکاتا رہا۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ۝

(ارض و سما میں کتنی ہی آیات زندگی ہیں۔ جن سے یہ لوگ آنکھیں پھیر کر گزر جاتے ہیں)

لیکن ملّا و خانقاہ کے فریب خوردہ مسلمان نے ان دھمکیوں کو در خور اعتنا نہ سمجھا۔

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی (اقبالؒ)

نتیجۃً اس کی داستان عظمت اک فسانۂ پارینہ بن کر رہ گئی، ارباب البرق نے اس کے جھونپڑے پہ بجلیاں برسائیں، آقایان ہوا نے اسے ہواؤں اور فضاؤں سے نکال دیا، امراء البحر نے اس کی چوبی کشتیاں ساحل ہی پہ ڈبو دیں۔ فرمانروایان اثیر نے اسکی امواج اثیری کی راہیں روک لیں اور اہل الحدید کے جلال نے اسے ایک ایسی زندگی بسر کرنے پہ مجبور کر دیا جس میں ذلت، مسکنت، احتیاج، دریوزہ گری اور فلسفۂ حال و قال کے بغیر اور کچھ بھی نہ تھا۔

ہمارے رُہبان و احبار کسی سے پیچھے رہنے والے کب تھے۔ انہوں نے بھی آفاق کو مسخر کیا لیکن ایک دوسرے رنگ میں۔ فرمایا بجلی سے مراد وہ نور ہے جو فلاں ولی کے مزار پہ اعتکاف کے بعد نظر آتا ہے یا کسی خوش قسمت کو لیلۃ القدر میں دکھائی دیتا ہے حرارت سے مراد وہ گرمی ہے جو مجلس عرس میں "حال" ناچنے والے ایک مرید پہ عقیدت کے تنفس اور بدن میں پیدا ہو جاتی ہے۔ "بحر" سے مراد ندامت کے وہ آنسو ہیں جو عذاب قبر کے خوف سے مسلسل بہتے ہیں۔

آگ سے مراد نار جہنم اور فولاد سے مراد وہ گُرز ہیں جو ملائکہ جہنم کے ہاتھ میں ہوں گے۔ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝

بہرحال "البیان" نے اس سلسلے میں بھی نہایت گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ مسلمان کو کائنات کی طرف سب سے پہلے "البیان" نے متوجہ کیا اور "دو قرآن" کی چودہ اقساط چودہ ماہ تک اس موقر مجلّہ میں نکلتی رہیں۔

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ہند میں بعض اہل نظر لیکن صرف چند ایسے موجود تھے جو تسخیر کائنات کی اہمیت کے قائل تھے لیکن ان کے جذبات کبھی الفاظ کا جامہ نہ پہن سکے۔ یہ فخر صرف "البیان" کو حاصل ہے کہ اس نے کائنات کی طرف متوجہ کرنے کیلئے مسلمان کو اس زور سے للکارا کہ ہند و پاکستان کی وادیاں گونج اٹھیں۔ مسلمان چونک پڑا، اور کنج صومعہ سے نکل کر قرآن کی طرف بے تحاشا لپکا۔

آج مسلمان کا سینہ سوزِ آرزو سے پھر معمور ہے وہ وسیع فضاؤں میں پرواز کے لئے پھر پر تول رہا ہے وہ عظمتِ گم گشتہ کو حاصل کرنے کے لئے لاوے کی طرح پھر کھول رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب مسلمانوں کی حیاتِ ثانیہ کی تاریخ لکھی جائے گی۔ تو "البیان" کی خدمات کا ذکر سنہری الفاظ میں کیا جائے گا۔

رجوع بہ مطلب ہاں۔ تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ قوم کی بیماریاں تین ہیں۔ اخلاقی خانقاہی، اور آفاقی۔ اخلاقی میدان حضرت عرشی کے ہاتھ میں ہے اور باقی دو موضوع اس قدر کھنگالے جا چکے ہیں کہ کوئی نئی چیز لکھنا بہت دشوار ہے "اضافاً" کہئے۔ کہ میں لکھوں تو کیا لکھوں۔

مجھے ایک اور بیماری بھی لاحق ہے کہ جب لکھنے بیٹھتا ہوں تو تناسب و توازن کی تمام حدود کو پھلانگ جاتا ہوں اور فیصلہ نہیں کر سکتا کہ مضمون کو کہاں ختم کروں۔

دو سال پہلے کی بات ہے کہ میں حضرت عرشی سے "البیان" کے لئے ایک مقالے کا وعدہ کر بیٹھا۔ کالج تین ماہ کیلئے بند ہو چکا تھا مجھے پوری فراغت نصیب تھی۔ قلم لے کر بیٹھ گیا اور چالیس یوم کے بعد معلوم ہوا کہ مقالہ کتاب (دو اسلام) کی صورت اختیار کر چکا ہے۔

چند روز ہوئے میں حضرت عرشی سے پھر ایک مقالہ کا وعدہ کر چکا ہوں۔ ایک موضوع دماغ میں پھڑ پھڑا رہا ہے لیکن اس سلسلہ میں جو مواد سامنے آ رہا ہے وہ پوری کتاب کی صورت اختیار کر رہا ہے۔ کسی فرصت کے وقت میں اسے ترتیب دوں گا۔ مواد زیرِ نظر مقالہ کی صورت اختیار کرے یا کتاب کی۔ اس کا محرک بھی ادارہ "البیان" ہی ہوگا۔ "دو قرآن" اور "دو اسلام" "البیان" کی وجہ سے معرضِ وجود میں آئیں۔ "جہانِ نو" کے بیشتر مقالے البیان میں شائع ہوئے اور میری نئی تصنیف (ایک اسلام) بھی "البیان" ہی کی تحریک و ترغیب کا نتیجہ ہو گی۔

دو رسالے میرا ذاتی نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ اس وقت پاکستان میں صرف دو رسائل ایسے ہیں جو قرآن کو روایات اور اسلام کو اوہام و خرافات کی گرفت سے آزاد کر رہے ہیں۔ "طلوعِ اسلام" اور "البیان"۔ "طلوعِ اسلام" کی مالی حالت اچھی ہے لیکن "البیان" مدت سے مرگ و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ حاملین قرآن کا فرض ہے کہ وہ اس "خادم الوحی" کو مرگِ مفاجات سے بچانے کی کوئی سبیل سوچیں

آج کل ملک کے ہر گوشے سے بیسیوں رسائل نکل رہے ہیں جن میں سے دو چار ادبی۔ ایک دو اصلاحی اور باقی سب کے سب فلمی ہیں۔ ان فلمی رسالوں میں بازاری عورتوں کی تصاویر۔ کچھ فحش سے افسانے۔ عوام کو لوٹنے کیلئے کچھ انعامی معمے اور چند عریاں سوال و جواب ہوتے ہیں۔ یہ رسائل قوم کو کس طرف لئے جا رہے ہیں۔ قلب و دماغ پر ان کا کیا اثر پڑ رہا ہے اور علم و ادب کی یہ کس طرح مٹی پلید کر رہے ہیں۔ ایسے مسائل ہیں جن پر دیدہ زہ اہلِ فکر و نظر کو توجہ کرنی ہی پڑے گی۔ میں سطورِ گذشتہ میں قوم کی تین بیماریوں کا ذکر کر چکا ہوں اور سچ پوچھئے تو یہ حیا سوز رسائل قوم کی چوتھی بیماری ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان حالات میں "البیان اور طلوعِ اسلام کا زندہ رہنا نہایت ضروری ہے والسلام ا برقؔ

البیان —— یک عمر می تواں سخن از زلف یار گفت — در بند آں مباش کہ مضموں نماندہ است (صائبؔ)

علامہ اقبال نے "اسرارِ خودی" سے ارمغانِ حجاز تک اپنی تمام تصانیف میں ایک ہی حقیقت کو بتکرار بیان کیا ہے اور وہ ہے "احیائے خودی" یا قومی خودداری کا نمونہ و تحفظ۔ یہی ایک چیز ان کی فارسی، اردو، انگریزی، نظم و نثر، رباعیات، غزلیات، قطعات، مثنویات وغیرہ میں پھیلی ہوئی ہے اور ہر جگہ نئے اسلوب اور نرالے حسن سے جلوہ گر ہے۔ قاری کو کہیں بھی تکرار کی اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ پھر ان کے بعد جو شعراء ان کا تتبع کر رہے ہیں وہ بھی اسی محور کے گرد گھوم رہے ہیں اور اپنے اپنے امکان بھر لذت و کشش پیدا کر ہی لیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک ہی بات کو اسالیب بیان کا تنوع بے شمار جدتیں بخش دے سکتا ہے۔

یک قصہ بیش نیست غمِ عشق وین عجب — از ہر کسے کہ می شنوم نامکرر است

یہ ایک شعر ہماری تمام اردو بھاشا، فارسی اور عربی شاعری کا خلاصہ ہے (باستثنا چند کتب رجزیہ و اخلاق و تصوف) لیکن ہم یہیں پر کیوں ٹھہر جائیں۔ اللہ تعالیٰ کی تصانیف میں بھی تو ہمیں ایک ہی بات نظر آتی ہے جس کی شہادت آدمؑ و نوحؑ سے محمد (صلوات اللہ علیہم) تک دیتے آ رہے ہیں۔ اس کے باوجود موسیٰؑ کی کتابوں کا مقام الگ ہے اور ان کے بعد کے انبیاء یوشع، داؤد، سلیمان، یسعیاہ، حزقیل، یوحنا، زکریا وغیرہ کے صحیفوں کا انداز جدا، اور پھر انجیل اور اس کے صحیفوں کی شان سب سے ممتاز۔ اور قرآن کا دعویٰ بھی تو یہی ہے کہ میں تمہیں کوئی ایسی بات نہیں کہتا جو اگلوں نے نہ کہی ہو (ما یقال لک الا ما قد قیل للرسل من قبلک) پھر کیا ان کے ہوتے ہوئے ہم قرآن سے بے نیاز ہو سکتے ہیں۔ خود قرآن کریم کا مرکزی نکتہ بھی بسم اللہ سے والناس تک ایک ہی ہے۔ لیکن کیا اس کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی سورت بھی ہم "بے ضرورت تکرار" کہہ کر خارج کر سکتے ہیں — میرے محترم! سچ پوچھئے تو ہر آیت میں ایک نئی روح ہے جو دوسری میں نہیں۔ اور اس کے باوجود سب میں ایک ہی روح کارفرما ہے۔ باغ کا ہر پھول، ہر ادا، ہر کلی، اپنی بے شمار بوقلمونیوں کے باوجود بہار ہی کے ترجمان ہیں۔ یہ ہے وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت — آپ کا ایک موضوع ہے۔ قرآن کے راستے سے جعلی مذاہب کو مٹانا اور قرآن کی کائناتی عظمت کو آشکار کرنا۔ یہ موضوع اتنا بادقار اور پرعظمت ہے کہ کہیں پر اس کی حدبندی نہیں ہو سکتی۔ اس میں منفی اور مثبت دونوں پہلو موجود ہیں۔ اور یہی حاصل کائنات ہیں۔ اگر کائنات کی کوئی حد ہوتی تو ہم آپ کے موضوع کا خاتمہ بھی تصور کر لیتے ہیں۔ آپ نے "دو قرآن" لکھ کر ایک بنیاد رکھ دی ہے جس پر آنے والی نسلیں عظیم الشان محل تعمیر کریں گی۔ اور قرآن ان کو آگے سے آگے رہنمائی کرتا جائے گا۔ لکھئے اور خوب لکھئے (ایدک اللہ بروح منہ)

ایک علمی و تحقیقی مقالہ

مطالعہ نہج البلاغہ

(از جناب غلام کبریا صاحب)

حضرت علیؑ کے خطبات بعض بزرگوں نے " نہج البلاغہ" کے نام سے معہ ترجمہ شائع کئے ہیں۔ چنانچہ سید ظفر مہدی صاحب اور سید محمد صادق صاحب کا ترجمہ "سبیل فصاحت" نظر سے گزرا۔ اصل متن اور ترجمہ کے علاوہ حواشی اس قدر ہیں کہ جیسے ایک گوہر کے اوپر کئی ایک صدف کی تہیں چڑھا دی جائیں۔ اگر سمجھانے کیلئے تشریح ہو تو وہ بہتر چیز ہے اور جہاں یہ مقصد نہ ہو بلکہ صرف اپنے "معتقدات" کو کھینچ تان کر کلام سے ثابت کرنا ہو تو وہ حاشیہ و تشریح اس کے خاص اعتقاد کیلئے تو ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن فرقہ بندی سے متنفر اور تحقیق پسند طبائع پر بارگراں ہے۔ مثال کے طور پر سید ظفر مہدی صاحب نے پہلے خطبہ کا حاشیہ دیا ہے۔

"کتاب ربکم فیکم مبینًا حلالہ وحرامہ وفرائضہ وفضائلہ وناسخہ ومنسوخہ" الخ (نہج البلاغہ جلد اوّل)

ناسخ و منسوخ آیات کے متعلق مندرجہ ذیل حاشیہ ہے:۔

"بعض ایسی ہیں جن کا حکم کتاب خدا میں مذکور ہے مگر سنت رسولؐ نے اسے منسوخ کر دیا۔ اور بعض ایسی کہ جن کا حکم سنت میں مذکور ہے مگر کتاب خدا نے اسے منسوخ کر دیا۔ مثال اوّل جیسے فامسکوھن فی البیوت حتیٰ یتوفٰھن الموت ۴/۱۶ یہ آیت سنت رسولؐ سے یوں منسوخ ہو گئی کہ آپ نے زانی محصن کے رجم کا حکم فرما دیا اور دوسرے کی مثال صوم عاشورہ سنت نے واجب کیا تھا مگر کتاب خدا نے صوم رمضان واجب کر کے منسوخ کر دیا۔

یہ دونوں مثالیں علامہ ابن ابی الحدید نے اپنی کتاب میں تحریر کی ہیں مگر میرے خیال میں ان سے اس مقام پر تسامح ہوا ہے اس لئے کہ اول تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ حکم الٰہی کو سنت رسول کیونکر نسخ کرے گی اور اگر حکم الٰہی سے ہے تو گویا ایک حکم الٰہی نے دوسرے حکم الٰہی کو منسوخ کیا نہ سنت رسول نے" (نہج البلاغہ حاشیہ صہ ۱۹)

ناسخ و منسوخ کی اس طویل بحث کا یہ اختصار پیش کیا گیا ہے۔ آپ غور فرمائیں کہ خطبہ کے الفاظ ناسخہ و منسوخہ سے اس حاشیہ کا کیا تعلق ہے علامہ ابن ابی الحدید کی تشریح نقل کر کے اس کی تردید کی گئی ہے حالانکہ خطبہ میں فی السنۃ نسخہ کے الفاظ موجود ہیں۔ پھر اُنیسویں خطبہ کے حاشیہ میں یہ عبارت ہے:۔

"وہ کتاب جس پر اسلام کی اساس ہے وہ کتاب جس کی تبلیغ کیلئے رسولؐ نے اپنا خون پانی ایک کر دیا۔ وہ کتاب جو

ابدالآباد تک کے لئے اپنے دامن میں وہ احکام ربانی لئے ہوئے ہے جو کبھی منسوخ نہیں ہو سکتے۔ یہاں تک کہ صبح قیامت ان خود رائیوں پر مسکرائے" (نہج البلاغہ جلد اول ص ۱۹۹)

ان متضاد حاشیوں سے معلوم نہیں ہوتا کہ قبلہ ظفر مہدی صاحب نے ابن ابی الحدید معتزلی کی تردید فرمائی ہے یا کہ جناب علی کے الفاظ خطبہ ناسخہ و منسوخہ اور فی السنۃ مثخنہ کی تردید کی گئی ہے۔

خطبہ شقشقیہ کا آغاز ان الفاظ میں ہے:۔

أَمَا واللّٰہ لقد تقمصہا فلانٌ وَإِنہ لیعلم أنَّ محلی منہا محل القطب من الرحیٰ الخ

"اے خدا کی قسم فلاں شخص نے خلافت کو قمیص بنا کے پہن لیا۔ اور وہ یقیناً جانتا ہے کہ میں خلافت کیلئے ایسا ضروری ہوں جیسا کہ چکی کی گردش کے لئے وہ میخ ضروری ہوتی ہے۔ (نہج البلاغۃ ص ۱۳۱)

اس متن اور ترجمہ کو خود پڑھ کر فیصلہ فرمائیں اس طرز کا ترجمہ تمام خطبات کا ہے۔ اصل متن میں خلافت کا لفظ نہیں اور کسی کا نام بھی نہیں۔ البتہ "فلان" کے لفظ سے اشارہ ضرور ہے اور ایسے اشارات کلام امام میں اکثر ہیں۔

بارھویں خطبہ کی عبارت درج ذیل ہے:۔

"یزعم أنہ قد بایع بیدہ ولم یبایع بقلبہ فقد أقرّ بالبیعۃ وادعی الولیجۃ فلیأت علیہا بامر یعرف والّا فلیدخل فیما خرج منہ۔ زبیر یہ خیال کرتے ہیں کہ انہوں نے ہاتھوں سے بیعت کی ہے اور دل سے نہیں کی۔ انہوں نے بیعت کا اقرار کر ہی لیا۔ اور دلی کھوٹ کا دعویٰ کیا۔ لہٰذا اب انہیں چاہیئے کہ وہ اپنے دعویٰ پر کوئی کھلی دلیل لائیں۔ ورنہ جس چیز سے الگ ہوئے اور نکلے ہیں اسی میں پھر داخل ہوں" (نہج البلاغۃ جلد اول ص ۹۵)

یہ دو سطور کا خطبہ ہے اور اس کے ترجمہ کے علاوہ چار صفحات حاشیہ میں جس میں جنگ جمل کی تفصیل ہے اور واقعہ قتل زبیر بھی درج ہے کہ

"زبیر جنگ جمل سے نکل کے پلٹے تو "وادی السباع" میں ان کا گذر ہوا۔ عمر بن جرموز نے زبیر کا پیچھا کیا۔ زبیر نے وضو کیا جب نماز کیلئے کھڑے ہوئے تو ابن جرموز نے موقع پاکر وار کیا اور زبیر کو قتل کر دیا اور ان کا سر تلوار اور انگوٹھی لے لی تھوڑی سی مٹی اٹھا کے ان کی لاش پر ڈال دی اور چلا گیا۔ احنف کے پاس پلٹ کے آیا تو احنف نے کہا یہ تم نے بہت برا کیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ تم نے برا کیا یا اچھا کیا۔ علی کے پاس جاؤ اور ان سے پوچھو ابن جرموز امیر المومنین کے پاس آیا اور اجازت لے کر اندر گیا۔ امیر المومنین نے کہا تو نے زبیر کو قتل کیا ہے اس نے کہا ہاں میں نے ہی قتل کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ

"خدا کی قسم صفیہ کا بیٹا نہ بودا تھا نہ بخیل مگر یہ کہو کہ برا وقت آگیا اور موت پہنچ گئی"

پھر آپ نے زبیر کی تلوار لی اور اس کو ہلا کر کہا اس تلوار نے اکثر معاملات جنگ میں رسولؐ کی مدد کی ہے۔ ابن جرموز نے کہا میں نے اتنا بڑا کام کیا ہے کچھ انعام تو دیجئے۔ آپ نے فرمایا میں نے رسول کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ زبیر کا قاتل جہنمی ہے یہی تیرا انعام ہے ابن جرموز مایوس ہو کے چلا گیا اور کچھ اشعار پڑھتا جاتا تھا جن کا مفہوم یہ تھا کہ اور سنو میں تو زبیر کا سر علیؓ کے پاس لے گیا اور سمجھا تھا کہ مقرب ہوں گا جائزہ ملے گا۔ مگر انہوں نے الٹے مجھے جہنم کی بشارت دی کتنی بڑی یہ بشارت ہے اور کتنا بڑا یہ تحفہ ہے" (نہج البلاغۃ جلد اول ص۹۹)

اسی خطبہ کے حاشیہ پر یہ درج ہے کہ حضرت عائشہ اور طلحٰہ زبیر نے حضرت علی کی بیعت کی اور دوسروں کو بھی اس کا حکم دیا پھر پلٹ گئے اور حضرت عائشہ کو جنگ پر آمادہ کرنے والے بھی طلحہ و زبیر تھے۔ لیکن زبیر کے قاتل کے جہنمی ہونے کا فرمان بھی ساتھ ہی ہے۔ اب غور طلب ہے کہ ایسے متضاد حاشیوں کی حضرت علی کے خطبات کے ساتھ کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ یہ تو مثال کے طور پر چند حوالے پیش کئے ہیں۔ ساری کتاب اصل متن سے کئی گنا زیادہ۔ اسی قسم کے غیر متعلق حاشیوں سے بھری ہوئی ہے۔ جس سے حضرت علی کے صاف اور سادہ خطبات پر حواشی کا رنگ غالب ہے۔ ضرورت ہے کہ خطبات وفرامین حضرت علی کو اصل متن کے ساتھ صرف ترجمہ شائع کیا جائے جو ان غیر متعلق حاشیوں سے بالکل پاک ہو جس سے نہج البلاغۃ صرف شیعہ حضرات کی کتاب بن کر نہ رہ جائے بلکہ اس مقدس صحیفہ سے غیر شیعہ بھی مستفید ہو سکیں۔

<u>فارسی ترجمہ</u> | میرے محترم بزرگ سید ذاکر حسین صاحب ایڈووکیٹ کے پاس "نہج البلاغۃ" کا فارسی ترجمہ ہے جو تہران میں چھپا ہے۔ وہ ان اردو ترجموں سے بہتر ہے۔ اس فارسی ترجمہ چھاپ تہران کا ایک خطبہ ملاحظہ فرمائیں جو کہ جناب علیؓ نے رسول کریمؐ کی وفات پر غسل دیتے وقت فرمایا

خطبہ ۲۲۶

"پدرم مادرم بفدائے تو باد اے رسولؐ خدا ہما نا بمرگ تو بریدہ شد چیزیکہ با مرگ دیگران بریدہ نگردید۔ از نبوت و احکام الٰہی و اخبار آسمانی۔ خصوصیت داشتہ و یگانہ ہستی بطوریکہ از دیگر مصیبت ہا تسلیت دہندہ می باشی۔ و عمومیت داری بطوریکہ مردم در (ماتم) تو یکسانند واگر امر بشکیبائی و نہی از نالہ و فریاد و فغاں نہ فرمودہ بودی ہر آئینہ (در فراق تو) سر چشمہ ہائے اشک چشم را خشک می کردیم و درد و غم پیوستہ و حزن و اندوہ ہمیشہ بود۔ و خشک شدن اشک چشم و دائمی بودن حزن و اندوہ در مصیبت تو کم است و لے مرگ چیزے است کہ برطرف نمودن آں ممکن نبودہ دفع آں غیر مقدور است۔

پدرم مادرم بفدائے تو باد۔ مارا نزد پروردگارت بیاد آوردہ در خاطر خویش نگاہ دار۔[1]

(نہج البلاغۃ جلد چہارم ص۲۲)
(چاپ خانہ پیر تہران ایران)

---

[1] خلاصہ مطلب۔ یا رسول خدا فداک امی و ابی آپ کی رحلت سے نبوت ختم ہو گئی۔ آپ دکھوں اور مصیبتوں میں تسلی دینے والے تھے۔ آپ کی رحلت کی مصیبت ایسی ہے کہ اگر آپ نے ماتم سے منع نہ کیا ہوتا تو آنکھوں کے آنسو کبھی خشک نہ ہو سکتے۔ فداک امی و ابی ہمیں اپنے رب کے حضور یاد فرمانا اور ہمارا خیال رکھنا (مدیر)

اہل سنت علماء | نہج البلاغۃ کے متعلق بعض حضرات کا یہ خیال بھی پایا جاتا ہے کہ یہ خطبات وغیرہ ابن حضرت علی کی طرف منسوب ہیں۔ ان کے جواب میں بعض اہل سنت علماء کرام کی تحقیق پیش کرنا ضروری ہے۔ سید علی نقی صاحب مجتہد اپنی تصنیف "نہج البلاغۃ کا استناد" میں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ

عبدالحمید بن یحییٰ نے کہا کہ ——— میں نے ستر خطبے حضرت علی کے خطبوں سے یاد کئے تو انہوں نے مجھے فیض پہنچایا اور کتنا فیض پہنچایا۔ اور ابن نباتہ نے کہا ہے کہ میں نے خطابت کا وہ ذخیرہ محفوظ کیا ہے جو صرف ہونے سے بڑھتا ہی جائے گا۔ میں نے سو فصلیں مواعظ علی ابن ابی طالب میں سے یاد کی ہیں۔

اور جب محقق ابن ابی محفن نے (خوشامد میں) معاویہ سے کہا کہ میں سب سے زیادہ گنگ شخص (علی) کے پاس سے آیا ہوں تو معاویہ نے کہا خبردار وہ گنگ کیسے کہے جا سکتے ہیں حالانکہ خدا کی قسم فصاحت کا راستہ قریش کو نہیں دکھایا۔ مگر انہوں نے اور کافی ہے یہی کتاب جس کی ہم شرح لکھ رہے ہیں اس امر کے ثابت کرنے میں کہ حضرتؑ فصاحت میں وہ بلند درجہ رکھتے ہیں کہ کوئی آپ کے ساتھ نہیں چل سکتا اور بلاغت میں آپ کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا" (نہج البلاغت کا استناد صـ)

شمس الدین یوسف بن قزغلی مشہور بسبط ابن جوزی متوفی ۶۵۴ھ ہیں۔ جنہوں نے اپنی کتاب تذکرۃ خواص الامۃ میں خطبہ شقشقیہ کو تمام و کمال درج کیا ہے اور قطعی طور سے کلام امیر المومنین تسلیم کیا ہے۔

مفتی مصر | مفتی دیار مصریہ علامہ مصلح شیخ محمد عبدہ متوفی ۱۳۲۳ھ جنہوں نے نہج البلاغۃ کے تفسیری نوٹ اور حواشی تحریر کر کے اس کو انتہائی اہتمام سے مصر میں چھپوانے کا انتظام کیا۔ وہ اپنے اس مقدمہ میں جو شروع کتاب میں درج کیا ہے اپنی اس حیرت و دہشت کا اظہار کیا ہے۔ جو نہج البلاغۃ کی حقائق آگیں عبارات سے ان پر طاری ہوئی ہے علامہ محمد عبدہ نے جس طرح نہج البلاغۃ کے کلام امیر المومنین ہونے کی تصدیق کی ہے۔ اس طرح اس کے مضامین کی حقیقت اور اس کے مندرجات کی سچائی کا بھی اعتراف کیا ہے اور وہ لکھتے ہیں کہ

" اس کتاب کے مضامین حق کی فتح اور باطل کی شکست اور شکوک و اوہام کی فنا اور توہمات و وساوس کی بیخ کنی کا سبب ہیں اور وہ شروع سے آخر تک انسانی روح کے لئے روحانیت و انسانیت قدس و طہارت جلال و جمال کی تعلیمات کے حامل اور انسانی زندگی کے لئے بہترین ہدایت کا مخزن ہیں "

علامہ محمد عبدہ اس دور آخر کے ان جلیل القدر علماء میں سے تھے جو مشرق عربی میں امام و مصلح مانے گئے ہیں اور جمہور اسلام کے سب سے بڑے مرکز علمی مصر میں ان کی مسلم الثبوت شخصیت کے نام پر علمی طبقہ کی گردنیں خم ہیں۔ انہیں نہج البلاغۃ کے ساتھ وہ غیر معمولی عقیدت تھی کہ وہ اسے قرآن مجید کے بعد ہر کتاب کے مقابلہ پر ترجیح کا مستحق سمجھتے تھے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ

" جامعہ اسلامیہ میں اس کتاب کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہونا اسلام کی ایک صحیح خدمت ہے اور عربی طلاب کے لئے بجائے

اس کے کہ وہ متداول ادبی کتابیں پڑھیں، اس کتاب کو اپنا قبلہ مقصد بنانا ان کی ذہنی ترقیوں کے لئے انتہائی مفید ہے نہ صرف اس کے لئے کہ اس کی عبارت ادبی حیثیت سے بہت بلند ہے بلکہ اس لئے بھی کہ وہ امیرالمومنین علی رضی اللہ عنہ کا کلام ہے اور معانی و مقاصد کے اعتبار سے بھی توجہ والتفات کا مستحق ہے۔"

ناحق کوشی اور انصاف فراموشی ہوگی اگر اس بات کا اعتراف نہ کیا جائے کہ عالمِ اسلام کو جمہوری حیثیت سے نہج البلاغۃ کے ساتھ روشناس کرنے کا سہرا صرف علامہ شیخ محمد عبدہ کے سر ہے جو ان کی ممتاز غیر متعصبانہ ذہنیت فراخ حوصلگی اور بلند نظری کا نتیجہ تھا۔ یہ تصریحات ہیں اکابر علمائے اہل سنت کی جنہوں نے نہج البلاغۃ کو کلام امیرالمومنین تسلیم کیا ہے۔ غیر مسلم محققین میں سے بھی دو شخصوں نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ اور نہج البلاغۃ کی صحت اسناد کی گواہی دی ہے۔

(۱) عبدالمسیح انطاکی صاحب جریدہ "العمران" مصر جس نے امیرالمومنین کی سیرت میں اپنی مشہور کتاب "شرح قصیدہ علویہ" تحریر کی ہے اور وہ مطبع رعمیس فجالہ مصر میں شائع ہوئی ہے۔

(۲) فواد افرام بستانی استاذالادب العربیہ فی کلیۃ القدیس یوسف (بیروت)

بڑے درجہ کے عیسائی ادیب اور محقق مورخ ہیں۔ انہوں نے ایک سلسلہ تعلیمی کتابوں کا "روائع" کے نام سے شائع کیا ہے جس میں مختلف جلیل المرتبہ مصنفین کے آثار قلمی اور تصانیف سے مختصر انتخابات مصنف کے حالات کی کتاب تاریخ تحقیقات وغیرہ کے ساتھ چھوٹے چھوٹے مجموعوں کی صورت میں ترتیب دیئے ہیں اور وہ کیتھولک عیسائی پولیس (بیروت) میں شائع ہوئی ہیں اس سلسلہ کا مجموعہ امیرالمومنین اور نہج البلاغۃ سے تعلق رکھتا ہے (ماخوذ از نہج البلاغہ کا استناد)

مسعودی نے حضرت علی کے خطبوں کی نسبت کہا ہے کہ کچھ اوپر چار سو اسی خطبے ہیں۔ اوپر کی عبارت سید علی نقی صاحب کی ہے جو ایک غیر متعصب شیعہ مجتہد ہیں۔ محترم کی چند ایک تصانیف میری نظر سے گذری ہیں۔ آپ کا مقدمہ تفسیر قرآن بھی پڑھا ہے اگر علمائے کرام محترم موصوف کی طرح صلح کن طریقہ اختیار کریں تو مسلمانوں کی فرقہ بندی اور منافرت باہمی اور تعصب بہت حد تک دور ہو سکتے ہیں۔ اہل سنت علماء میں سے قاضی محمد سلیمان رحمۃ اللہ علیہ مصنف" رحمۃ اللعالمین" بھی اس نہج و مسلک کے بزرگ تھے ان کی تصانیف میں بھی رواداری اور سلامت روی پائی جاتی ہے قاضی صاحب مرحوم نے بھی نہج البلاغہ کو مستند کلام علی تسلیم کرتے ہوئے " رحمۃ اللعالمین" کی جلد دوم و سوم میں عبارت نقل فرمائی ہے۔

نہج البلاغۃ اور شیعہ محترم سید محمد صادق صاحب قبلہ نہج البلاغۃ جلد دوم کے مقدمہ میں صد پر تحریر فرماتے ہیں:۔

" شیعوں کے مختلف الخیال طبقے اور فرقے سب اس کعبۂ حقیقت کا طواف کرتے نظر آتے ہیں کہ نہج البلاغہ حضرت علی علیہ السلام کے خطبوں۔ فرمانوں۔ خطوں اور حکیمانہ اشاروں کا وہ مجموعہ ہے جسے علامہ سید رضی علیہ الرحمۃ نے

تالیف کرکے دنیائے علم و ادب کے سامنے پیش کرنے کا فخر حاصل کیا اس میں ایک لفظ اور ایک جملہ بھی ایسا نہیں ہے جسے الحاقی کہا جا سکے۔ اس کا واضح ترین ثبوت یہ ہے کہ الحاق یا اضافہ ایک ایسی چیز ہے جو عبارت کی یک رنگی میں فرق پیدا کردیتی ہے" (ص ۱۱)

اپنے تعصبات کی بنا پر جن لوگوں نے نہج البلاغہ کو کلام علی ماننے سے انکار کیا ہے ان کی تعداد انگلیوں پر شمار کرنے کے قابل ہے ان میں سب سے پہلے علامہ ابن خلکان کا نام نظر آتا ہے، دوسرے علامہ ذہبی میزان الاعتدال میں تحریر کرتے ہیں:

"جو شخص نہج البلاغہ کا مطالعہ کرے اسے معلوم ہوگا کہ اس کی نسبت حضرت علی کی جانب بالکل غلط ہے" (ص ۳)

"جرجی زیدان ایسا شخص جو "تاریخ آداب اللغۃ العربیہ" کے ایسے موضوع پر قلم اٹھائے بیٹھا ہو وہ نہج البلاغہ کے متعلق کلام امیرالمومنین ہونے میں اظہار شک کے ساتھ اس کے جمع و تالیف کو جناب سید مرتضیٰ کی طرف منسوب کردے جو سید رضی کے بھائی اور ان سے تین برس بڑے اور شافی تنزیہ الانبیا اور انتصار وغیرہ کے مصنف تھے اور سید رضی کے انتقال کے ۲۹ برس بعد تک زندہ رہے خود نہج البلاغہ کے مطالعہ سے بھی غلط ثابت ہوا۔ اس لئے کہ اس میں "خصائص الائمہ" کا حوالہ موجود ہے۔ مورخ ابن خلکان نے کتاب کے مضامین کو دیکھ کر ان کے امیرالمومنین کی زبان کا کلام ہونے میں شک کیا ہے اور لاعلمی کی حیثیت سے اس کو خود سید رضی کی طرف منسوب کردیا ہے۔ سید رضی کی دیگر تصانیف جیسے "مجازات النبی" "خصائص الائمہ" "حقائق التنزیل" وغیرہ جو فعلاً کتب خانوں میں موجود ہیں۔ ان میں اور اس کتاب نہج البلاغہ کے اسلوب تحریر انداز بیان اور پایہ و مرتبہ میں موازنہ یہ ایک مستقل حقیقت رسا ذریعہ ہے جو شکوک کے لئے خرمن سوز بجلی کی حیثیت رکھتا ہے۔" (ماخوذ)

آٹھویں خطبہ کے حاشیہ کی عبارت ملاحظہ فرمائیں۔

"بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ خطبہ آپ نے طلحہ و زبیر کے قتل کے بعد ارشاد فرمایا اور بعض نے کہا ہے کہ ان کی زندگی ہی میں فرمایا ہے خطبہ کی فصاحت اور اس کی اعجاز بیانی اپنی آپ ہی نظیر ہے ہر جملہ دوسرے سے مرتبط بھی ہے اور پھر فی نفسہ ایک استقلال معنی رکھتا ہے۔ جناب سید رضی علیہ الرحمۃ نے اس طویل خطبہ سے جمع فرمایا ہے کیونکہ بعض لوگوں نے آپ کے اس خطبہ میں کچھ اختلافات اپنی خواہش نفس کے مطابق کر دیئے تھے مگر ان کا پیوند آپ کے کلام کے ساتھ مرتبط نہ ہوتا تھا اور نگاہیں اس بے جوڑ جوڑ کو محسوس کر رہی تھیں، یہ الحاقی فقرات کو امام کی فصاحت سے کوئی مناسبت ہی نہ تھی مؤلف اعلی اللہ مقامہ نے مصلح کو مفسد سے اور طیب کو خبیث سے چھانٹ کے الگ کیا۔ آپ یہ خطبہ آپ کے مخصوص طرز ادا اور کلمات فصاحت ریز کا حامل ہے۔ (نہج البلاغہ حاشیہ ص ۳)

خطبہ ۲۷ کے متعلق سید رضی فرماتے ہیں کہ

"اس خطبہ کو بعض ناواقفوں نے معاویہ کی طرف منسوب کیا ہے حالانکہ یہ امیر المومنین کا کلام ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں" (نہج البلاغہ جلد دوم صفحہ ۲۸۵)

ان دلائل و براہین کے بعد نہج البلاغہ کے تمام مجموعہ کو غلط اور باطل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ البتہ بعد میں اضافہ ہوجانا بعید از قیاس نہیں جس کے ثبوت میں منقولہ بالا حاشیے کافی ہیں۔ ہمارے شیعہ بھائی حضرت عثمان کو داماد رسول ہونے سے انکار کرتے ہیں لیکن خطبہ ۱۶۳ میں حضرت علی نے خود حضرت عثمان کو داماد رسول فرمایا ہے۔ فارسی ترجمہ ملاحظہ ہو۔

"مردم درپشت سرمن می باشند و مرا بین تو و خود شان سفیر و واسطہ قرار دادہ اند۔ و سوگند بخدا بتو نمی دانم چہ گویم نمی دانم کہ تو خود آنرا نہ دانی را ہنما نیستم کہ آنرا نہ شناسی و می دانی آنچہ ما میدانیم۔ در چیزے از تو پیش نہ گرفتیم کہ ترا بان آگاہ سازیم۔ و در ہیچ مکے خلوت نہ نمودیم تا آنرا بتو برسانیم۔ و تو دیدی آنچہ ما دیدیم و شنیدی آنچہ کہ ما شنیدیم و با رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ۔ آمیزش داشتی چنانکہ ما آمیزش داشتیم و پسر ابی قحافہ و پسر خطاب بدرستکاری سزاوار تر از تو نبودند۔ درحالیکہ تو از جہت خویش برسول خدا از آنہا نزدیک تری و بہ دامادی پیغمبر مرتبہ ای یافتہ ای کہ ابوبکر و عمر نیافتند (نہج البلاغہ جلد سوم صفحہ ۵۱۶)

اردو ترجمہ" نہج البلاغہ" دو جلدوں میں ۱۲۵ صفحات پر مشتمل ہے لیکن کسی جگہ حضرت علی نے اپنی جماعت کو شیعہ کے نام سے یاد نہیں فرمایا بلکہ المرأ المسلم (مرد مسلم) اور مومن کے لفظ کئی جگہ ہیں۔ ملاحظہ ہو (نہج البلاغہ جلد دوم خطبہ ۲۹ صفحہ ۱۴۰) (و جلد دوم خطبہ ۴۵ صفحہ ۲۹۳)

ضروری گذارش

مضمون نگار حضرات کی خدمت نہایت ادب سے عرض ہے کہ مضامین کے مسودے صاف اور روشن لکھا کریں۔ آیات اور دیگر عربی فارسی اور انگریزی عبارتوں کو نقل کرتے وقت خاص توجہ سے کام لیں۔ آیات کا حوالہ نہایت ضروری ہے۔ رجال و کتب اور مقامات کے نام بھی بالکل واضح اور خوش خط ہونے چاہئیں۔ اصطلاحات وغیرہ بھی خاص طور پر صاف ہوں تاکہ کاتب اور مصحح آسانی سے پڑھ سکیں اور مضمون اغلاط سے محفوظ رہے۔

روداد امتِ مسلمہ کراچی

ذیل کی سطور کراچی کی امت مسلمہ کی شاخ کی طرف سے اشاعت کیلئے موصول ہوئی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ دوسرے شہروں کے احباب بھی اس طریق کار کی پیروی کریں اور ادارہ البیان کو اپنی کارکردگی سے مطلع کرتے ہیں۔ (ادارہ)

چند مخلص دردِ دل میں اسلام کی حقیقی تڑپ رکھنے والے مسلمانوں کا ایک اجتماع بتاریخ ۳ فروری بوقت ۱۰ بجے صبح بمکان خواجہ محمد زکریا صاحب نیا لمک واقع مہر آباد ہری بلڈنگ، فلیٹ ۱۷ لارنس روڈ کراچی ۳ زیر صدارت سید محمد صبیح صاحب ایڈووکیٹ منعقد ہوا۔ باہمی صلاح و مشورہ سے ایک مجلس عمل قائم کرنیکی تجویز ہوئی۔ جو متفقہ طور پر منظور ہوگئی۔ یہ مجلس کسی قسم کی فرقہ پرستی، گروہ بندی یا انجمن سازی کا مظہر نہیں ہوگی بلکہ مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت ہوگی جو كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کے ماتحت وحدت فکر اور وحدت کار کے رشتہ میں منسلک ہوکر ہم گام و ہمنوا رہے گی۔ (انشاء اللہ)

اس جماعت کا مندرجہ ذیل دستور منظور کیا گیا اور جناب ماسٹر کریم بخش صاحب سکھانی متفقہ طور پر جماعت کے امیر منتخب ہوئے۔

دستور

(۱) نام۔ اس جماعت کا نام امت مسلمہ کراچی ہوگا (۲) مقصد۔ تعلیمات قرآن کی تعمیل و تبلیغ (۳) شرائط رکنیت۔ (الف) اتباع قرآن (ب) قرآن مجید کو جمیع ضروریات دین کیلئے مکتفی یقین کرنا اور کسی کتاب، قول یا عمل کو قرآن پر ترجیح نہ دینا بلکہ اس کا ہم پایہ بھی نہ سمجھنا (ج) حسب استطاعت قرآن کریم کی اشاعت کیلئے کوشش کرنا (د) اپنی ماہوار آمدنی میں سے کم از کم ایک پیسہ فی روپیہ ماہوار چندہ ادا کرنا۔

(۴) تشکیل مجلس۔ اس جماعت کا ایک امیر ہوگا اور ایک مجلس شوریٰ (۵) امیر کے اختیارات اور ذمہ داری۔

(الف) تمام انتظامی امور کا ذمہ دار ہوگا۔ (ب) اپنی امداد و اعانت کیلئے مجلس شوریٰ میں رفقاء کا تقرر کرسکے گا (ج) مجلس کی تمام مالیت اور جائداد کا امین اور ذمہ دار ہوگا (د) مجلس شوریٰ سے مشورہ کریگا لیکن فیصلے کا حق امیر ہی کو ہوگا۔

(۶) مجلس شوریٰ کے اختیارات اور ذمہ داری۔ (الف) مجلس شوریٰ امت مسلمہ کے جملہ ارکان* پر مشتمل ہوگی (ب) مشورہ طلب امور میں امیر کو مشورہ دیگی (ج) امیر کو معزول کرسکیگی، فیصلہ کثرت رائے سے ہوگا۔ (د) کسی ممبر کو اگر وہ شرائط رکنیت پر قائم نہ رہے تو اسے جماعت سے خارج کرسکیگی۔

مندرجہ ذیل اصحاب نے رکنیت قبول فرمائی۔

(۱) جناب سید محمد صبیح صاحب ایڈووکیٹ (۲) جناب خان اسحاق صاحب ایڈووکیٹ (۳) جناب ابراہیم خاں صاحب (۴) مولوی احمد کریم صاحب ہومیوپیتھ (۵) جناب حنیف بیگ صاحب (۶) مولوی احمد حسین صاحب (۷) جناب نصر اللہ خاں صاحب (۸) مرزا رمضان بیگ صاحب (۹) جناب شریف احمد صاحب (۱۰) جناب محمد حنیف صاحب (۱۱) جناب خیال صاحب (۱۲) صوفی عبدالرحیم صاحب (۱۳) خواجہ عبدالکریم صاحب نیا لمک (۱۴) خواجہ محمد زکریا صاحب نیا لمک (۱۵) خواجہ عبدالحفیظ صاحب (۱۶) جناب کریم بخش صاحب سکھانی (۱۷) جناب قادر بخش صاحب سکھانی

---

* ہمارے خیال میں یہ شق نظر ثانی کی محتاج ہے۔ شوریٰ کو دو قسموں میں منقسم کرنا مناسب۔ عام اور خاص۔ یعنی پہلے تمام ارکان اپنے مشورے سے چند ارکان کو اپنے میں سے منتخب کریں۔ پھر وہ منتخب ارکان امیر کے مشیر ہوں۔ (ادارہ)

استفسارات

ایک محترم کے خط سے ایک فقرہ:-

"ہو سکے تو کسی پرچے میں عصائے موسیٰ اور ید بیضا کے متعلق مفصل بحث تحریر فرمائیں۔"

جواب پہلے ایک اصولی نکتہ سمجھ لینا چاہیئے۔ ہمیں غیر محدود کو محدود سے ناپنے کے خبط سے بچنا لازم ہے۔ کائنات غیر محدود ہے۔ ہماری عقل اس کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ ہم خود اس کا ایک نہایت ہی حقیر جزو ہیں ہماری آج تک کی علمی، (تشریحی نفسیاتی، طبی وغیرہ) کوششیں اپنے آپ کو بھی نہیں سمجھ سکیں۔ بلکہ اپنے کسی ایک جزو، مثلاً آنکھ کے علم و علاج کا بھی پورا احاطہ نہیں ہو سکا اور نہ کبھی ہوگا۔ اسی طرح قرآن لامحدود ہے۔ اس کی ہر ہر بات کو ہم اپنی محدود عقل سے نہیں ناپ سکتے۔ لیکن ہمارا فرض یہی ہونا چاہیئے کہ جہاں تک ہو سکے عقل سلیم سے کام لیتے رہیں۔ اور محکمات کا دامن نہ چھوڑیں۔ ترقی کے میدان لا انتہا ہیں۔ اور ان میں آگے سے آگے قدم اسی ترکیب سے اٹھایا جا سکتا ہے۔ قرآن پاک نصیحت پذیری کے لئے آسان ہے۔ (ولقد یسرنا القرآن للذکر) لیکن جو اعلیٰ علوم اس میں رکھ دئے گئے ہیں ان کو کما حقہا تو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں (لا یعلم تاویلہ الا اللہ) اور پختہ علم والے لوگ سب پر ایمان لاکر، دل کی کج روی سے بچنے کی دعائیں مانگتے ہوئے ان سے بقدر استعداد حصہ لیتے ہیں۔ (والراسخون فی العلم یقولون آمنا بہ کل من عند ربنا، وما یذکر الا اولوا الالباب۔ ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا)

اب آئیے اصل سوال کی طرف ——— قرآن سے ثابت ہے کہ حرکتِ عصا کی حقیقت خود موسیٰؑ کی سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی۔ چنانچہ پہلی دفعہ جب طور الایمن میں بحکم الٰہی انہوں نے عصا پھینکا اور اس میں حرکت پیدا ہوئی تو ان کی جو حالت ہوئی اس کا نقشہ ذیل کے الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔

"ولّٰی مدبراً ولم یعقب" ——— مڑ گیا پیٹھ پھیر کر، اور پیچھے نہ دیکھا۔

یہاں تک کہ وحی ربانی کو کہنا پڑا

"یا موسیٰ لا تخف انی لا یخاف لدیّ المرسلون" ——— اے موسیٰؑ نہ ڈر ہمارے حضور میں رسول ڈرا نہیں کرتے۔

ہاتھ کے متعلق فرمایا۔

ادخل یدک فی جیبک تخرج بیضاء من غیر سوء۔ ــــ اپنا ہاتھ گریبان میں ڈال کہ سفید نکلے بغیر کسی عیب (برص وغیرہ) کے

اس مفہوم کو کئی سورتوں میں بار بار بیان فرمایا۔ لیکن عصا اور ید بیضا کو ہر جگہ عصا اور ید بیضا ہی لکھا ہے۔ البتہ سانپ کے لفظ بدلتے گئے: ثعبان، حیّۃ، جانّ۔ اور اسی طرح حرکت عصا کو بھی کہیں "تَلۡقَفُ" اور کہیں "تَسۡعٰی" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جس کے معنی حرکت لبلبی اور حرکت سریع کے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں قسم کی حرکات سرزد ہوئی تھیں۔

مفسرین قدیم وجدید نے اس کی تفسیر میں دو راہیں اختیار کی ہیں۔ ایک تو وہی عام طریقہ ہے کہ سونٹا سچ مچ کا سانپ بن جاتا تھا۔ یعنی چند منٹ کے لئے اس کا قلب ماہیت ہو جاتا تھا۔ قرآن مجید اس خیال کی تائید نہیں کرتا ـــــــ سورہ نمل میں ہے "کَاَنَّھَا جَآنٌّ" گویا کہ وہ سفید سانپ ہے۔ یہ کاف تشبیہ یعنی "گویا کہ" صاف کہہ رہا ہے کہ وہ وقتی حرکت کے سوا کسی اور چیز میں سانپ کی مانند نہیں بن گیا تھا۔ نہ اس میں سانپ کی زہر تھی نہ وہ انڈے سے نکلے ہوئے سانپ کی طرح بچے (سپولئے) پیدا کرنے پر قادر تھا۔

دوسرا طریقہ ان بزرگوں نے اختیار کیا ہے جو جدید مغربی علوم سے مرعوب معلوم ہوتے ہیں (حالانکہ یہ "جدید" بھی ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے سرسیدؒ کے زمانے سے چل کر اب تک بہت کچھ قدیم ہو چکے ہیں) انہوں نے عصا اور ید بیضا کو نئے نئے معنی پہنائے تاویلیں کیں، تکلف کیا۔ اور بعض نے معنی تو قائم رکھے، لیکن واقعے کو کشفی قرار دیا۔ پھر کشف موسوی کا پرتو فرعون اور اس کے درباریوں پر بھی ڈالا ـــــــ عاجز راقم کے خیال میں یہ سب تکلفات ہیں۔ خدا جانے ان لوگوں کے اپنے دل ایسے معانی پر کس طرح مطمئن ہوں گے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اللہ تعالےٰ کو سیدھے لفظوں میں بات کہنی نہیں آتی۔ (معاذ اللہ) ضرورت ہے کہ ہزار سوا ہزار برس کے بعد ایسے مفسر پیدا ہوں جو توضیح مطالب کریں یا قرآن کو اپنا تختۂ مشق بنائیں۔ اس کا مطلب آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ راقم قرآن سے نئے نئے علوم وعجائب حاصل کرنے کے خلاف ہے۔ بے شک غور و تفکر قرآن کا حکم اور ہمیشہ کے لئے ہے۔ اس کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوگا۔ جس طرح صحیفۂ فطرت (کائنات) کے علوم کی کوئی حد نہیں، اسی طرح قرآنی علوم کی بھی انتہا نہیں۔ لیکن اگر الفاظ قرآنی کو (جو عربی مبین ہیں) تاویلات کا گورکھ دھندا بنانے کی اجازت دے دی جائے تو ہر شخص من مانی کرے گا۔ پھر وہی ہوگا۔ بلکہ ہوا جو اقبالؒ نے کہا ہے۔

کار ما ابتر ز کار دیں شدہ است ہر لئیمے راز دار دیں شدہ است

ان دونوں طریقوں میں اعتدال کا راستہ یہ ہے کہ ہم ہر رطب و یابس قصہ کہانی کو معجزہ ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اور ہمیں یہ بھی تسلیم نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی مقرر کردہ روش (سنت اللہ) کو توڑ پھوڑ کر تبدیل کر دیتے اور محکمات کو کبھی غیر محکم

بھی بنا دیتے ہیں (ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا) اور ہمیں یہ بھی دعویٰ نہیں کہ ہم سنت اللہ کے تمام پہلوؤں کو سمجھ چکے ہیں یا کبھی سمجھ سکیں گے ـــــ لیکن سمجھنے کی کوشش جس طرح عالم تکوین میں آگے ۔ سے آگے تدریجاً بڑھتی جا رہی ہے اور ہمیشہ اسی طرح بڑھتی رہے گی اور ابد تک محیط کل نہیں ہو سکے گی ۔ اسی طرح قرآن مجید کے مشکل مقامات کو انسانی عقل و تجربہ سے قریب لانے کی مخلصانہ کوشش ہمیشہ جاری رہے گی اور نفع بخش رہے گی ۔ کائنات کی بے شمار پیچیدگیوں کے متعلق حکماء ، فلاسفر اور سائنس دان اپنی لاعلمی کا فراخ دلی سے اعتراف کرتے ہیں اور ہمیشہ کرنا ہی پڑے گا ۔

ہزار انساں کرے ترقی ، ہزار سائنس رنگ لائے
خدا کی قدرت یہی رہے گی جہاں حیرت یہی رہے گی (اکبر)

ٹھیک اسی طرح نیک دل مفسروں کو سمجھ میں نہ آنے والے مقامات پر اعتراف عجز کرنا ہی سعادت مندی ہے چنانچہ محتاط لوگ ایسے مواقع پر " واللہ اعلم بالصواب " کی صحیح پناہ لیتے ہیں ۔

ایک اور طریقے سے سوچئے ـــــ وہ حقیر اور پلید بوند جس سے حسین و جمیل اور عقیل و فہیم انسان بنتا ہے ۔ اگر ہمارے سامنے روزانہ تبدیلیوں کے یہ حیرت انگیز فاصلے طے نہ کر رہی ہوتی تو اتنے بڑے انقلاب کو کون تسلیم کر سکتا تھا ؟ ـ کیا سونٹے کا متحرک ہو جانا اور ہاتھ کا چند لمحے کے لئے سفید ہو جانا ۔ اس سے زیادہ معجزہ ہے ؟ ـــــ خود سونٹے اور ہاتھ کا وجود میں آجانا کوئی چھوٹا معجزہ ہے ؟ ـــــ ایک بیج جس کا ترازو میں کوئی وزن نہیں ۔ اس سے عظیم درخت کا بن جانا پھر اس میں رنگ ، بُو ، ذائقہ ، تاثیر اور قوت لئے ہوئے پھلوں کا ظہور اور ان گنت سونٹوں کا وجود اور آسمان کے تاروں کی طرح اسی ایک بیج سے لاتعداد بیجوں کی تخلیق کوئی کم حیرت انگیز عمل ہے ۔ جب اس کو ماننے میں کوئی تامل نہیں تو سونٹے کی حرکت اور ہاتھ کی سفیدی میں کیوں تامل ہو ۔ یہ سب کچھ مناسب اسباب سے ظہور میں آتا ہے ۔ کہیں کہیں ہم اسباب کو سمجھ لیتے ہیں اور کئی جگہ نہیں سمجھ سکتے ۔ آئندہ آہستہ آہستہ سمجھنے کے امکانات بھی ہم میں رکھ دئے گئے ہیں اور یہ سلسلہ لامتناہی ہے ۔ اسی میں حکمت ہے اور اسی میں لذت ـــــ سونٹے اور ہاتھ کی یہ عجوبگی بھی مناسب اسباب ہی سے ظہور پذیر ہوئی ہوگی جو موسیٰؑ کی نظر سے اوجھل تھے اور آج ہماری نظر سے بھی اوجھل ہیں

درنہہ اسباب ہا اسباب ہاست اندریں ابوابہا ابوابہاست

ہم نے جدید انسانی ایجادات کی حقیقت کب سمجھ لی ہے ۔ بلکہ ہمیں تو بسا اوقات شعبدہ بازوں کے کام بھی متحیر کر دیتے ہیں ۔ پھر جب پوشیدہ اسباب کا علم ہو جاتا ہے تو حیرت ختم ہو جاتی ہے ۔

خواجہ احمد الدین رحمۃ اللہ نے حرکت عصا و بیاض ید کے اسباب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے ۔ انہوں نے لفظ معنی کا

احترام رکھتے ہوئے غور کیا ہے۔ جس کی صحت و غلطی کے متعلق کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی۔ اس کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے

طور آتش فشاں پہاڑ تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کو یہی قدرتی آگ دکھائی دی تھی۔ ایک دوسرے موقع پر طور کے زلزلے سے موسیٰؑ اور ان کے ستر رفیقوں کا سخت متاثر ہونا بھی اسی وجہ سے واقع ہوا تھا۔ "فلما تجلّٰی ربہ للجبل" سے مراد یہی مربیانہ (یعنی ربوبیت کی) تجلّی تھی جس سے ان لوگوں کی مناسب تربیت مقصود تھی۔ بعض صوفی قسم کے لوگوں کا یہ خیال کہ جمال حقیقت بے پردہ آشکارا ہو گیا تھا۔ قطعاً غلط ہے۔ اس کے متعلق کئی جگہ وضاحت ہے۔ "لن ترانی": تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکے گا۔ لا تدرکہ الابصار: نگاہیں جمال حقیقت کا ادراک نہیں کرتیں وغیرہ ذالک۔ قدرتی قواعد کے تحت آگ اور پانی سے آج کل بجلی حاصل کی جاتی ہے۔ ہر فعلیت مناسب تجاویز سے دوسری فعلیتوں میں بدل جاتی ہے۔ حرکت مناسب تدبیر سے روشنی، حرارت، جذب اور مدافعت کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔ کوہ طور کا دہانہ جنوب رویہ تھا۔ طور کی دائیں یا مغربی وادی میں طور کے صدموں سے بجلی پیدا ہوتی تھی۔ حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوا کہ تو اپنی جوتیاں اتار دے۔ بجلی کے سبب سے حضرت موسیٰؑ ید بیضا کی طرح چمکتے تھے۔ اس وادی میں اعصابی امراض والے مریض بھی آیا کرتے تھے۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کو قرآن "شاہدین" کے لفظ سے ذکر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے تصرف خاص سے اس موقع پر موسیٰ علیہ السلام کے جسم میں بجلی کی اتنی مقدار سرایت کر دی جو تین دفعہ حرکت عصا اور دو دفعہ ید بیضا کا کام دے سکے۔ سورہ قصص میں "بقعۃ المبارکۃ من الشجرۃ" میں اس درخت کا ذکر ہے۔ جس کے پاس موسیٰؑ کو آواز آئی تھی "انی انا رب العالمین"۔ یہ آواز وادی کے محیط سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، جب کہ موسیٰؑ پر کشف کی سی کیفیت طاری تھی۔ مذکورہ البقعہ یا مقام کو اس درخت سے برکت ملتی تھی۔ درخت اس بجلی کا مرکز تھا جو طور کے صدموں سے وادی میں پیدا ہوتی تھی، موسیٰؑ کے جسم سے یہ بجلی ان کے سونٹے میں صرف تین دفعہ اللہ تعالیٰ کے تصرف خاص سے حسب ضرورت منتقل ہوئی اور دو دفعہ ہاتھ پر موثر ہوئی۔ سونٹے کے اوپر لوہے کی درانتی لگی ہوئی تھی جس سے وہ پتے جھاڑتے تھے۔ اسی کے ذریعے سونٹا برقی اثر قبول کیا کرتا تھا۔ (ملخص از تفسیر بیانٌ للناس بنجل و قصص)

خواجہ صاحب کے اس بیان پر تبصرہ کرنا بجلی کے ماہرین کا کام ہے۔ راقم اپنے اندر اس کی اہلیت نہیں پاتا اس میں اتنی بات ضرور قابل قدر ہے کہ قرآنی الفاظ کے معانی کو کسی جگہ بھی بدل کر ان کی اصلیت سے بیگانہ نہیں کیا۔ واللہ اعلم بالصواب

ہمارے پڑوسی کا دس سالہ لڑکا حامد نہایت ذہین اور بہت پیارا لڑکا ہے۔ جب مجھے دیکھتا ہے تو بڑی محبت سے سلام کرتا اور نگاہ نیچی کرکے میرے پاس کھڑا ہو جاتا ہے۔ میں اکثر اسے اپنے ساتھ گھر لے جاتا ہوں اور اس کی ذہانت آمیز پیاری پیاری باتیں سنتا رہتا ہوں۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ میں گھر سے نکل رہا تھا کہ حامد سامنے سے رونی صورت بنائے آتا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے اسے ٹھیرا کر پوچھا کیوں حامد کیا ہوا۔ تو کہنے لگا چچا جان اس بازار میں جو ہمارے سکول کو جاتا ہے ایک کتا ہے جو مجھے دیکھتے ہی بھونکنے لگتا ہے اور میری طرف لپکتا ہے۔ آج وہ مجھ پر اس بری طرح لپکا کہ اگر میں بھاگ نہ جاتا تو وہ مجھے کاٹ ہی لیتا۔ یہ دیکھئے دوڑتے دوڑتے میرا پاؤں پائجامے میں الجھ گیا اور میں گر پڑا۔ چوٹیں بھی لگیں اور پائجامہ بھی پھٹ گیا۔ مجھے مجبوراً گھر لوٹنا پڑا۔ چچا جان آپ ہی بتائیں اب کیا کروں۔ سکول جانے کا اس بازار کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں۔

میں نے یہ سب سن کر حامد کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور کہا بیٹا ڈرو نہیں اس کمبخت کتے کا علاج ہو جائے گا اور ایسا علاج کروں گا کہ پھر وہ تمہیں دیکھ کر کبھی نہ بھونکے۔ کل تم سکول جانے لگو تو مجھے گھر سے بلا کر ساتھ لے چلنا۔ شام کو حامد کے باپ سے مل کر میں نے حامد کی پریشانی اور صبح اسکے ساتھ سکول جانے کا ذکر کیا تو اس نے بھی حامد سے کہہ دیا کہ بیٹا کل سکول جاتے وقت چچا جان کو ساتھ لے جانا۔ مجھے تو سویرے ہی نوکری پر جانا ہوتا ہے ورنہ میں خود تمہارے ساتھ جاتا۔

دوسرے دن ٹھیک وقت پر حامد آگیا اور میں اس کے ساتھ ہولیا۔ حامد کہنے لگا چچا جان ایک لاٹھی بھی لیتے چلو تاکہ اس کمبخت کو خوب پیٹیں۔ میں نے کہا لاٹھی کی ضرورت نہیں تم دیکھنا میں اسے کس طرح ٹھیک کرتا ہوں حامد جب اس جگہ پہنچا جہاں وہ کتا تھا تو اس نے دور سے اشارہ کیا کہ وہ بیٹھا ہے۔ چچا جان۔ کتا بھی حامد کو دیکھتے ہی بھونکنے لگا۔ حامد نے مڑ کر میری طرف دیکھا میں نے جھٹ جیب میں سے روٹی نکال کر حامد کے ہاتھ میں دے دی اور کہا کہ اس کے ٹکڑے کرکے کتے کے آگے ڈال دو اور خاموشی سے اپنا راستہ چلتے جاؤ۔

حامد نے ایسا ہی کیا کتا روٹی کھانے لگا اور ہم آرام سے گذر گئے۔ آگے جا کر میں نے حامد سے کہا جب صبح سکول جانے لگو تو روٹی کا تھوڑا سا ٹکڑا ساتھ لے جایا کرو اور جب کتا بھونکنے لگے تو اس کے آگے ڈال دیا کرو۔ چنانچہ حامد ایسا ہی کرتا رہا۔

چند دنوں کے بعد میں نے حامد سے دریافت کیا کہو حامد اب وہ کتا تمہارے ساتھ کیسا ہے۔ حامد نے جواب دیا چچا جان اب تو وہ کتا میرا دوست بن گیا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی دم ہلانے اور پاؤں میں لوٹنے لگتا ہے سکول تک میرے ساتھ جاتا ہے اور بڑی محبت کا اظہار کرتا ہے۔

اس کے پانچ چار دن بعد حامد شام کو میرے پاس آیا اور بڑی خوشی اور مسرت کے لہجے میں کہنے لگا چچا جان وہ کتا تو بہت اچھا دوست ثابت ہوا۔ اس نے تو آج میری جان بچالی۔ صبح میں سکول جا رہا تھا۔ اور کتا حسب معمول میرے ساتھ تھا جب ہم گرجا گھر کے پاس پہنچے تو لوگ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے اور سامنے سے ایک بپھرا ہوا بیل دم اٹھائے دوڑتا چلا آ رہا تھا وہ سیدھا میری طرف آیا اور میں چیخ کر ایک طرف کو دوڑا مگر بیل میرے پیچھے لپکا اور قریب تھا کہ مجھے سینگوں پر اٹھا کر زمین پر ٹپک دے کہ کتے نے اچک کر اس کی تھوتھنی پہ کاٹ لیا اور بیل گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ چچا جان آج تو اس کتے نے میری جان بچالی بہت اچھا ہے یہ کتا۔

میں نے حامد کو پاس بٹھالیا اور کہا دیکھو حامد یہی کتا پہلے تمہارا دشمن تھا اور تم چاہتے تھے کہ اسے لاٹھی سے پیٹا جائے اگر ہم اسے پیٹتے تو وہ ہمیشہ تمہارا دشمن رہتا مگر جب تم نے اسکی برائی کو نیکی سے جیت لیا تو وہ تمہارا دوست بن گیا اور جو کل تمہارے لئے خوف کا باعث تھا آج تمہارے واسطے حفاظت کا سامان ہوا۔ برائی کا جواب برائی سے دینا آسان ہے مگر برائی کا جواب نیکی سے دینے میں جو فائدے ہیں وہ اس میں نہیں۔ اگر تم برائی کے بدلے احسان کرنے کی عادت پکی کر لو تو دنیا میں ہر شریر کے شر سے محفوظ رہو گے اور ہر کوئی تمہارا دوست بن جائے گا اور بروں کی برائی سے بچانے کے لئے تمہاری اسی طرح مدد کرے گا جس طرح کتے نے تمہیں سانڈ سے بچانے کے لئے کوشش کی۔

ہمیشہ برائی سے دور اور شریروں کے شر سے محفوظ رہو۔

خط و کتابت

دار القرآن، نسبت روڈ۔ لاہور

ترسیل زر

ڈاکٹر میر حبیب اللہ صاحب

۹۔ جہانگیر اسٹریٹ۔ مصری شاہ

لاہور